ساقی

میر نمبر

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

مرتبہ

محمد حسن عسکری

قیمت تین روپے


ست مند جلد کی قدرتی خوبصورتی کے لئے
اصل خوبصورتی کا انحصار صحت مند جلد پر ہے
ریکسونا صابن آپ کی جلد میں جذب ہو کر نہ صرف اسے صاف
کرتا ہے بلکہ یہ صحت بخش بھی ہے۔ نیز ریکسونا میں
کیڈل بھی ہوتا ہے جو اُن قدرتی تیلوں کا ایک خاص مرکب
ہے جس سے آپ کی جلد لطافت و جاذبیت حاصل کرتی ہے
Rexona
اپنی جلد کی حفاظت
ریکسونا صابن سے کیجئے

ساقی بک ڈپو کی کتابیں

مرزا عظیم بیگ چغتائی

... عہ؍
...ت ... عا؍
...نت ... عا؍
...ی ... عہ؍
... عہ؍
... عہ
... عہ؍
...چغتائی ... عہ
... ۸؍
...دمیں ... ۸؍
...بھوت ... ۸؍
...گوکھی ... ۸؍
...رمی ... ۶؍
...رحد ... ۶؍
...ان ... ۶؍

بہزاد لکھنوی

... عہ
... عہ
... عہ

موجِ نور ... عہ؍

جلال الدین احمد

شام ہوتی ہے ... عہ؍

عشرت رحمانی

تیرے گیت ... عہ
میرے گیت ... عہ
شاہ جہاں ... ۱۲؍

مولوی عنایت اللہ دہلوی

سلامبو ... للعہ
تائیس ... عہ؍
ہرودیاس ... عہ

ڈاکٹر احسن فاروقی

شامِ اودھ ... صہ؍
رہ ورسم آشنائی ... سے؍

میراجی

اس نظم میں ... سے؍
گیت ہی گیت ... عا؍

فراق دہلوی

لال قلعہ کی جھلک ... عہ؍

منٹو

دھواں ...

رفیعی اجمیری

کہکشاں ...

حکیم حبیب اشعر دہلوی

دلہن کی سیج ...

سلام مچھلی شہری

پائل ...

انصار ناصری دہلوی

چندرا موہنی ...
وحشی

فضل حق قریشی دہلوی

فرعون ...

صادق الخیری دہلوی

دھنک ...

ظفر قریشی دہلوی

دریچے ...
گزرگاہِ خیال ...

محمد حسن عسکری

قیامت ہمرکاب ...
میرا بہترین افسانہ ...

محمد حسن عسکری

میر کی فنی شخصیت

کس کس طرح سے میر نے کاٹا ہے عمر کو
اب آخر آخر آن کے یہ ریختہ کہا

اس شعر میں میر نے اپنی ذاتی زندگی اور اپنی شاعری کا تعلق واضح کیا ہے۔ اس میں پڑھنے والوں کا کوئی ذکر نہیں۔ اس شعر کی حدود میں رہتے ہوئے ہم تخلیقی عمل کے متعلق یہ نتیجہ اخذ کریں گے کہ شاعر کو چند تجربات حاصل ہوئے ہیں جنکی معنویت ڈھونڈنے اور جنہیں الفاظ میں ڈھالنے کی کوشش میں ان کی پوری عمر صرف ہوتی ہے۔ اگر اس شعر کے سوا میر نے اپنے تخلیقی عمل کے متعلق کچھ نہ کہا ہوتا تو غالباً ہم یہ سمجھتے کہ ان کے نزدیک شعر صرف ایک فرد کی ذاتی زندگی کا اظہار ہے، اور فن نہ تو برائے زندگی ہے اور نہ برائے فن بلکہ برائے شعر۔ لیکن میر نے ایک اور جگہ دوسروں سے اپنی شعر گوئی کے تعلق کا بھی حال بیان کیا ہے ؎

اگرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میر
پہ میرے شور نے روئے زمیں تمام لیا

اس شعر میں میر نے وہ پہلی بات بھی دُہرا دی ہے کہ شاعر دوسروں سے الگ ہو کر اپنے تجربات ہضم کرتا ہے، لیکن اس سے آگے بڑھ کر میر نے یہ بھی بتایا ہے کہ دوسرے بھی اور کچھ نہ سہی تو سامعین کی حیثیت سے یا اثر پذیر ہونے والوں کی حیثیت سے تخلیقی عمل میں شریک ہوتے ہیں۔ شاعر کا شور روئے زمین اسی وقت لے سکتا ہے جب وہ اپنے تجربات کے ساتھ ساتھ دوسروں کے تجربات کی بھی تشکیل کر رہا ہو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ شاعر اور اس کے اجتماعی گروہ کے درمیان چند چیزیں مشترک ہوں۔ شاعر اُنہیں اپنی سمجھ کر قبول کرتا ہو اور اس کا اجتماعی گروہ بھی شاعر کو اپنا ذریعہ اظہار سمجھ کر قبول کرتا ہو۔ یہ بات جس حد تک میر کو حاصل تھی بعد میں آنے والے اردو دیوانوں کو حاصل نہیں رہی۔ اچھا میر نے اپنی تخلیقی عمل کا سلسلہ ایک اور چیز سے بھی ملایا ہے ؎

ریختہ رُتبے کو پہنچایا ہوا اس کا ہے
مُعتقد کون نہیں میر کی اُستادی کا

یہاں آکر دو عوامل ایک ہو گئے ہیں۔ ایک طرف تو شاعر کی جدوجہد ہے کہ وہ اپنے تجربات کو [illegible] شکل میں لائے، دوسری طرف زبان اور اس کی پوری روایت کی جدوجہد ہے کہ انسانی تجربے کے زیادہ سے زیادہ پہلوؤں کی الفاظ اور محاوروں کے ذریعہ تعریف پیش کی جائے۔ اگر کسی شاعر کے یہاں یہ دونوں کوششیں آپس میں حل ہو کر ایک ہی عمل بن جائیں تو اُس کی تخلیقی سرگرمی زبان کے ماضی کو اپنے اندر جذب کر کے مستقبل کی آئینہ داری شروع کر دیتی ہے۔

اس طرح تخلیقی عمل میں تین چیزوں کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ایک تو ادیب کی ذاتی شخصیت، دوسرے معاشرے کی اجتماعی شخصیت، تیسرے زبان کی شخصیت۔ یہ تینوں شخصیتیں میر کے یہاں ایک ہو گئی ہیں۔

عسکری

پیش لفظ

میر کے بارے میں دو باتیں ضرب المثل بن کے رہ گئی ہیں۔
پست مان لیا جائے تو میر کے کلام کا انتخاب نہایت آسان
ہے۔ اگر میر کی شاعری محض آہ ہے تو جو شعر منہ لسور تا نظر
سے چن لیجئے۔ اگر بندش غایت بلند و پستش غایت پست
جس خیال یا جذبے کو بلند سمجھتے ہوں اُسے رکھیئے
نکال پھینکئے۔ ویسے بھی ہر پڑھنے والا پست و بلند کے
اپنا معیار عائد کرتا ہی ہے۔ لیکن میر کی سطح کے شاعر
اپنے آپ کو ڈھونڈنے کے بجائے اگر ہم خود شاعر کو
نا چاہیں تو زیادہ ضروری سوال یہ ہوگا کہ اُس کے
پست کا آپس میں کیا رشتہ ہے، اور پست کے بغیر وہ
پہنچ بھی سکتا تھا یا نہیں؟ ایسے شاعر کا انتخاب کرتے
اُلجھن ہونے لگتی ہے کہ انتخاب کرنا بھی چاہیئے یا نہیں،
میر کے درجے کا شاعر اپنے پست شعروں میں بھی زندگی
اچھے یا بُرے پہلو کو قبول کرتا ہوا، اپنے جذبات یا اپنے
بیان سے کشمکش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس صورت
سب تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آدمی شاعر کا پورا ہی
ہے، یا جتنا زیادہ پڑھ سکے اُتنا پڑھے۔ مثلاً انگریزی
ورڈزورتھ بہت بڑا شاعر سمجھا جاتا ہے، لیکن ساتھ ہی اُسکے
صفحے کے صفحے نہایت بے رنگ ہیں چنانچہ ایک پروفیسر
میتھیو آرنلڈ نے مشورہ دیا ہے کہ اُسکے کلام کا
حصہ پڑھو جو غایت بلند ہے۔ اس کے برخلاف شاعر
پاؤنڈ کہتا ہے کہ ورڈزورتھ کا مجموعۂ کلام اُٹھا کے
شروع کر دو، اور جب بور ہو جاؤ تو پھینک دو۔ میر کو
اصلی طریقہ بھی یہی ہے۔ کلیاتِ میر کی جگہ کوئی انتخاب
سکتا۔ البتہ کسی انتخاب کا جواز یہ ہو سکتا ہے کہ
نے والے کے نزدیک شاعر نے اپنے جذبات اور

اپنے اسالیبِ بیان کی تہذیب جن طریقوں سے اور
کی ہے اُنہیں واضح کر دیا جائے۔ چنانچہ میں اس
میر کے بہترین اشعار کا مجموعہ پیش نہیں کر رہا
وہ اشعار بھی شامل ہیں جو میرے خیال میں اُن
ہیں۔ میر کے متعلق غلط یا صحیح جو بھی میری رائے
چیز کو میں میر کی بلندی سمجھتا ہوں، اُس کی وضا
ایک مضمون میں کر دی ہے جو اس انتخاب کے آ
ملے گا۔ لیکن میر ہوا میں معلق نہیں تھے، جو بلندی
حاصل ہوئی ہو، وہ اُس تک زینہ بہ زینہ پہنچے
وہ بلندی پہ ٹنگ کے رہ گئے تھے۔ جذبات
پستی کا تعلق تو ایک جدلیاتی عمل کا ہے جو زند
برابر جاری رہتا ہے۔ میر پہ کوئی وحی نازل نہ
دوسرے انسانوں کی طرح اُنہیں بھی عرفانِ
نفس، اور عرفانِ حیات حاصل کرنے کے لئے او
کو الفاظ کی شکل دینے کے لئے جد و جہد کرنی
چنانچہ میں نے کوشش کی ہے کہ اپنے آپ سے
سے کشمکش کا یہ عمل اس انتخاب میں زندہ ر
اس عمل کو واضح کرنے کے لئے میں نے ایک
شعر لئے ہیں جن میں جذبات کی پختگی بھی ہے اور
دوسری طرف ایسے شعر رکھے ہیں جن میں جذبات
طرزِ بیان ہیں بھی ایک آنچ کی کسر رہ گئی ہے۔ پھر نچ
کے درمیان آتے ہیں، اُنہیں ہٹا کر آپ اُن کی
دوسرے اشعار رکھ سکتے ہیں۔ بہرحال اِن
شعروں کا سلسلہ ایک دوسرے سے ملا کر
کہ میر کس طرف جا رہے ہیں۔
اس کے علاوہ میں نے ایسے اشعار [illegible]

کی شناخت کی بھی ضروری معلوم ہوئی جنھیں میر نے آزما کے تو دیکھا، مگر اپنایا نہیں، یا جنھیں بعد میں آنے والے شاعروں نے ترقی دی۔ پھر میں نے ایسے اشعار بھی جان بوجھ کے شامل کئے ہیں جو شعری حیثیت سے چاہے اچھے نہ ہوں، مگر جن میں یا تو میر نے پیش پا افتادہ خیالات کو روانی اور نفاست کے ساتھ نظم کرنے کی صلاحیت دکھائی ہے، یا جن میں مروّجہ اخلاقی، مذہبی، فلسفیانہ اور متصوفانہ تصورات ملتے ہیں، کیونکہ میر کی ذہنی شخصیت انہیں عناصر سے تعمیر ہوئی تھی، اور انہیں سمجھے بغیر میر کو سمجھنا ممکن نہیں۔

اسی طرح ایک مسئلہ یہ تھا کہ میر کے ایسے شعر جو مقبول عام ہو چکے ہیں لیکن شعری حیثیت سے بلند نہیں، انہیں شامل کیا جائے یا نہیں۔ لیکن شاعر کی شہرت کی تاریخ بھی اس کی شعری شخصیت کا حصہ بن جاتی ہے۔ اس لئے آخر میں نے ایسے شعروں کو بھی نظر نہیں کیا۔

بعض دفعہ پوری کی پوری غزلیں یا غزل کے کئی کئی شعر ایک ساتھ لینے پڑے ہیں، کیونکہ انفرادی اشعار سے زیادہ جان غزل کے آہنگ میں تھی۔ الفاظ کا آہنگ فی الاصل جذبات کا آہنگ ہوتا ہے۔ اس لئے موسیقی کی تخلیق بھی میر کی شعری شخصیت کا لازمی جزو ہے۔

شاعر بعض دفعہ اپنی فنی مہارت کا امتحان لینے کی خاطر شعر کہتا ہے۔ یہ چیز اُن لوگوں کو ناگوار گزرتی ہے جو شاعری سے محض کارآمد خیالات اور جذبات طلب کرتے ہیں، اور شاعر کو الفاظ سے جو کشتی لڑنی پڑتی ہے اُسے قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ لیکن میر کو مشکل زمینیں آزمانے میں اور ٹیڑھے قافیوں کے چٹخارے میں جو مزا ملتا تھا میں نے اُسکے بھی نمونے پیش کر دیئے ہیں۔

میر کی مثنویوں، نظموں اور ہجویات کو میں نے اتنی اہمیت دی ہے جتنی آج کل عام طور سے لوگ نہیں دیتے۔ غزل میں تو میر کے تجربات کا نچوڑ ملتا ہے، لیکن نظموں سے پتہ چلتا ہے کہ زندگی تفصیلاً کس طرح میر کے تجربے میں آئی۔ حیاتِ محض کا عرفان تو [illegible] مشکل ہے ہی، مگر زندگی کی تفصیلات کو دیکھ [illegible] کر قبول کرنا شاید اور بھی مشکل ہے۔ یہ نظمیں [illegible] کہ میر کی جذباتی تربیت اور تہذیب میں زندگی کے کون کون سے عناصر نے حصہ لیا۔ میر کی نظموں کو محض دل لگی سمجھ کر نہ ٹالیئے، بلکہ حضرت بایزید بسطامی کا یہ قول یاد رکھیئے کہ مشاہدۂ ذات تو مشکل ہے ہی، لیکن مشاہدۂ صفات ہر آدمی کے بس کا کام نہیں۔

یہ انتخاب پیش کرتے ہوئے مجھے ذرا بھی دعویٰ نہیں کہ یہ میر کا بہترین انتخاب ہے یا آخری انتخاب ہے۔ میر کے درجے کے شاعر سے ہر فرد اور ہر دور کو اپنی اپنی طرح اُلجھنا پڑتا ہے۔ دوسرے افراد اور دوسرے دور میر کے کلام سے دوسرے مطالبے کریں گے، اس میں دوسری چیزیں پائیں گے یا نہیں پائیں گے۔ میں تو صرف اپنی تفتیش کا نتیجہ پیش کر رہا ہوں۔


ریحانی
خوشرنگ و خوش ذائقہ اور عام طاقت بخش
مشروب ہے
بیحد مفرح اور نشاط انگیز ہے
دلکی دھڑکن وحشت اور گھبراہٹ کو دور کرتا ہی
قوت ہاضمہ کو حیرت انگیز طور پر بڑھاتا ہی بدنمیں
خون صالح پیدا کرتا ہی۔ نقاہت زدہ مریضوں کمزور
ناتوانوں کیلئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے
ریحانی
خوشرنگ
و
خوش ذائقہ
مشروب
نظامی دواخانہ
کراچی
UNIVERSAL BLOCK
نظامی دواخانہ
فریر روڈ کراچی پاکستان
فون
۵۲۷۳۸


پام رُوز
ٹائیلٹ سوپ
خوبصورتی کو
دوبالا کرتا ہے
سو فیصدی
پاکستانی سرمایہ
اور کاریگر
کریسنٹ پاک سوپ اینڈ آئل ملز کراچی چٹاگانگ

ردیفِ الف

دیوانِ اوّل

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر / اُس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

کیا میں بھی پریشانیٔ خاطر سے قریں تھا / آنکھیں تو کہیں تھیں دلِ غم دیدہ کہیں تھا
اب کوفت سے ہجراں کی جہاں تن پہ رکھا ہاتھ / جو دردِ الم تھا سو کہے تُو کہ وہیں تھا
جانا نہیں کچھ جز غزل آ کر کے جہاں میں / کل میرے تصرّف میں یہی قطعہ زمیں تھا
مسجد میں امام آج ہوا آکے کہاں سے / کل تک تو یہی میر خرابات نشیں تھا

پر میں کعبے گیا میں خانقہ سے اب کی بار / راہ سے مے خانے کی اس راہ میں کچھ پھیر تھا

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا / چھوڑا وفا کو اُن نے مروّت کو کیا ہوا
اُمیدوارِ وعدۂ دیدار مر چلے / آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا
اُس کے گئے پر ایسی گئی دل سے ہم نشیں / معلوم بھی ہوا نہ کہ طاقت کو کیا ہوا
تھی صعبِ عاشقی کی بدایت ہی میر پر / کیا جانئے کہ حالِ نہایت کو کیا ہوا

کہا میں نے کتنا ہے گُل کا ثبات / کلی نے یہ سُن کر تبسم کیا
جگر ہی میں یک قطرہ خوں ہے سرشک / پلک تک گیا تو تلاطم کیا
کسو وقت پاتے نہیں اُس کو گھر / بہت میر نے آپکو گُم کیا

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا   دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا
عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند   یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی   چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہمکو عبث بدنام کیا
سارے رند اوباش جہاں کے تجھ سے سجود میں رہتے ہیں   بانکے ٹیڑھے ترچھے تیکھے سب کا تجھ کو امام کیا
سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی   کوسوں اُسکی اور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا
کس کا کعبہ کیسا قبلہ کون حرم ہے کیا احرام   کوچے کے اسکے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا
شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا میخانے میں   جُبّہ، خرقہ، کرتا، ٹوپی، مستی میں انعام کیا
یاں کے سپید و سیہ میں ہمکو دخل جو ہے سو اتنا ہے   رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا
ساعدِ سیمیں دونوں اُسکے ہاتھ میں لاکر چھوڑ دئیے   بھولے اُس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا
ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی   سحر کیا، اعجاز کیا، جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا
میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو   قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

لگا نہ دل کو کہیں کیا سُنا نہیں تو نے   جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا

دل دینے کی ایسی حرکت اُن نے نہیں کی   جب تک جیئے گا میر پشیمان رہے گا

اب کے جو ترے کوچے سے جاؤں گا تو سنیو   پھر جیتے جی اس راہ وہ بدنام نہ آیا
نے خون ہو آنکھوں سے بہا ٹک نہ ہوا داغ   اپنا تو یہ دل میر کسو کام نہ آیا

صد موسمِ گُل ہم کو تہِ بال ہی گُزرے   مقدور نہ دیکھا کبھی بے بال و پری کا
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام   آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا
ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے   کیا یار بھروسا ہے چراغِ سحری کا

منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا   حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا
شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے   دل ہوا ہے چراغِ مُفلس کا

تھے برے مغبچوں کے تیور لیک　　شیخ مے خانے سے بھلا کھسکا
تاب کس کو جو حالِ میرؔ سنے　　حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا

قامت خمیدہ، رنگ شکستہ، بدن نزار　　تیرا تو میرؔ غم میں عجب حال ہو گیا

بیتاب جی کو دیکھا، دل کو کباب دیکھا　　جیتے رہے تھے کیوں ہم جو یہ عذاب دیکھا
دل کا نہیں ٹھکانا، بابت جگر کی گم ہے　　تیرے بلاکشوں کا ہم نے حساب دیکھا
آباد جس میں تجھ کو دیکھا تھا ایک مدت　　اس دل کی مملکت کو اب ہم خراب دیکھا
لیتے ہی نام اُس کا سوتے سے چونک اُٹھے ہو　　ہے خیر میرؔ صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

کب تلک دھونی لگائے جوگیوں کی سی رہوں　　بیٹھے بیٹھے در پہ تیرے تو مرا آسن جلا
آگ سی اک دل میں سلگے ہے کبھو بھڑکی تو میرؔ　　دے گی میری ہڈیوں کا ڈھیر جوں ایندھن جلا

کوئی ان طور سے گزرے ہے ترے غم میں مری　　گاہ تُو نے نہ سُنا حال مرا گاہ سُنا

جب جنوں سے ہمیں توسل تھا　　اپنی زنجیرِ پا ہی کا غل تھا
یک نگہ کو وفا نہ کی گویا　　موسمِ گل صفیرِ بلبل تھا
اُن نے پہچان کر ہمیں مارا　　مُنہ نہ کرنا ادھر تجاہل تھا
اب تو دل کو نہ تاب ہے نہ قرار　　یادِ ایام جب تحمل تھا
جا پھنسا دامِ زلف میں آخر　　دل نہایت ہی بے تامل تھا
خوب دریافت جو کیا ہم نے　　وقتِ خوش میرؔ نکہتِ گل تھا

دیکھا جو میں نے یار تو وہ میرؔ ہی نہیں　　تیرے غمِ فراق میں رنجور ہو گیا

فرہاد ہاتھ تیشہ پہ ٹک رہ کے ڈالتا　　پتھر تلے کا ہاتھ ہی اپنا نہ تھا

یہ سر تبھی سے گو نئے ہی میدانِ عشق کا — پھرتا تھا جن دنوں میں کو گیندیں اچھالتا
بن سر کے پھوڑے بنتی نہ تھی کوہکن کے تئیں — خسرو سے سنگِ سینہ کو کس طور ٹالتا
چھاتی سے ایک بار لگاتا جو وہ تو میر — برسوں یہ زخم سینے کا ہم کو نہ سالتا

گُل برگ کا یہ رنگ ہے مرجاں کا ایسا ڈھنگ ہے — دیکھو نہ جھمکے ہے پڑا وہ ہونٹ لعلِ ناب سا
دل تاب ہی لایا نہ ٹک تا یاد رہتا ہم نشیں — اب عیش روزِ وصل کا ہے جی میں بھولا خواب سا
سنا گئے میں جان کے ہوش و حواس و دم نہ تھا — اسباب سارا لے گیا آیا تھا ایک سیلاب سا
ہم سرکشی سے مدتوں مسجد سے بچ بچ کر چلے — اب سجدے ہی میں گزرے ہے قدِ خمیدہ محراب سا
رکھ ہاتھ دل پر میر کے دریافت کر کیا حال ہے — رہتا ہے اکثر یہ جواں کچھ ان دنوں بیتاب سا

اُس فریبندہ کو نہ سمجھے آہ — ہم نے جانا کہ ہم سے یار ہوا

مانندِ شمعِ مجلسِ شب اشک بار پایا — القصہ میر کو ہم بے اختیار پایا
شہرِ دل ایک مدت اُجڑا بسا غموں میں — آخر اُجاڑ دینا اُس کا قرار پایا
اتنا نہ تجھ سے ملتے نے دل کو کھو کے روتے — جیسا کیا تھا ہم نے ویسا ہی یار پایا

لگتی نہیں ہے دارو ہیں سب طبیب حیراں — اک روگ میں بسا ہا جی کو کہاں لگایا

ناحق یہ ظلم کرنا انصاف کر پیارے — ہے کون سی جگہ کا، کس شہر کا، کہاں کا
یا روئے یا رُلایا اپنی تو یوں ہی گزری — کیا ذکر ہم صفیراں یارانِ شادماں کا
قیدِ قفس میں ہیں تو خدمت ہے نالگی کی — گلشن میں تھے تو ہم کو منصب تھا روضہ خواں کا
پوچھو تو میر سے کیا کوئی نظر پڑا ہے — چہرہ اُتر رہا ہے کچھ آج اُس جواں کا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا — دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
خراب رہتے تھے مسجد کے آگے میخانے — نگاہِ مست نے ساقی کی انتقام لیا

وہ کج روش نہ ملا راستی میں مجھ سے کبھی
نہ سیدھی طرح سے اُن نے مرا سلام لیا
بڑے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا
اگرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میر
یہ میرے شور نے روئے زمیں تمام لیا

کس طرح سے مانیئے یارو کہ یہ عاشق نہیں
رنگ اُڑا جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میر کا

مت کر عجب جو میر ترے غم میں مر گیا
جینے کا اس مریض کے کوئی بھی ڈھنگ تھا

دل جو نہ تھا تو رات زخود رفتگی میں میر
گہ انتظار و گاہ مجھے اضطراب تھا

کیا طرح ہے آشنا گاہے گہے ناآشنا
یا تو بیگانے ہی رہیئے ہو جیئے یا آشنا
جس کی میں چاہی وساطت اُن نے یہ مجھ سے کہا
ہم تو کہتے گر میاں ہم سے وہ ہوتا آشنا

گُل کو محبوب ہم قیاس کیا
فرق نکلا بہت جو باس کیا
دل نے ہم کو مثال آئینہ
ایک عالم کا روشناس کیا
عشق میں ہم ہوئے نہ دیوانے
قیس کی آبرو کا پاس کیا
صبح تک شمع سر کو دُھنتی رہی
کیا پتنگے نے التماس کیا
ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں
میر کو تم عبث اُداس کیا

مفت آبروئے زاہد علامہ لے گیا
ایک مُغبچہ اُتار کے عمامہ لے گیا
اُس راہزن کے ڈھنگوں سے دیوے خدا پناہ
اک مرتبہ جو میر کا جی جامہ لے گیا

بے کسی مدت تلک برسا کی اپنی گور پر
جو ہماری خاک پر سے ہو کے گزرا رو گیا

سینکڑوں طرحیں نکالیں یار کے آنے کی لیک
عذر ہی جا ہے چلا اُس کے دلِ بدخواہ کا

گر کوئی پیر مغاں مجھ کو کرے تو دیکھے پھر   مے کدہ سارے کا سارا صرف ہے اللہ کا

ایسی گلی اک شہر اسلام نہیں رکھتا   جس کوچے میں وہ بُت صد بدنام نہیں رکھتا
یوں تو رہ و رسم اس کو اس شہر میں سب سے ہے   اک میرؔ ہی سے خط و پیغام نہیں رکھتا

نکلی تھی تیغِ بے دریغ اس کی   میں ہی اک امتحان سے نکلا
نامرادی کی رسم میرؔ سے ہے   طور یہ اُس جوان سے نکلا

مستی میں چھوڑ دیر کو کعبے چلا تھا میں   لغزش بڑی ہوئی تھی ولیکن سنبھل گیا

سُنا ہے حال ترے کشتگاں بچاروں کا   ہوا نہ گور گڑھا ان ستم کے ماروں کا
ملا ہے خاک میں کس کس طرح کا عالم یاں   نکل کے شہر سے ٹک سیر کر مزاروں کا

یوں نکلے ہے فلک ایدھر سے ناز کناں جو جانے تو   خاک سے سبزہ میری اُگا کر اُن نے مجھکو نہال کیا
حال نہیں ہے عشق سے مجھ میں کس سے میرؔ اب حال کہوں   آپ ہی چاہ کر اُس ظالم کو یہ اپنا میں حال کیا

آنکھوں میں جی مرا ہے اُدھر دیکھتا نہیں   مرتا ہوں میں تو ہائے رے صرفہ نگاہ کا
اک قطرہ خون ہو کے پلک سے ٹپک پڑا   قصّہ یہ کچھ ہوا دلِ غفراں پناہ کا
بیمار تو نہ ہووے جیتے جب تلک کہ میرؔ   سونے نہ دے گا شور تری آہ آہ کا

دل سے شوقِ رُخِ نکو نہ گیا   جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا
ہر قدم پر تھی اُسکی منزل لیک   سر سے سودائے جستجو نہ گیا
دل میں کتنے مسوّدے تھے ولے   ایک پیش اُسکے رُو برو نہ گیا
سبحہ گرداں ہی میرؔ ہم تو رہے   دستِ کوتاہ تا سبو نہ گیا

جل گیا دل سفید ہیں آنکھیں   یہ تو کچھ انتظار میں دیکھا
آبلے کا بھی ہونا دامن گیر   تیرے کوچے کے خارزار میں دیکھا
جن بلاؤں کو میر سنتے تھے   اُن کو اس روزگار میں دیکھا

دلِ خستہ جو لہو ہو گیا تو بھلا ہوا کہ کہاں تلک   کبھو سوزِ سینہ سے داغ تھا کبھو درد و غم سے فگار تھا
دلِ مضطرب سے گزر گئے شب وصل اپنی ہی فکر میں   نہ دماغ تھا نہ فراغ تھا نہ شکیب تھا نہ قرار تھا
یہ تمہاری ان دنوں دوستاں مژہ جس کے غم میں ہے خونچکاں   وہی آفتِ دلِ عاشقاں کسو وقت ہم سے بھی یار تھا

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ   جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا
ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میر   پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا

تمام زلف کے کوچے ہیں مار پیچ اُس کے   تجھی کو آوے دلا چلنا ایسی راہوں کا
کہاں سے تہ کریں پیدا یہ ناظمانِ حال   کہ پیچ بافی ہی ہے کام ان جُلاہوں کا
تری جو آنکھیں ہیں تلوار کے تلے بھی اُدھر   فریب خوردہ ہے تو میر کن نگاہوں کا

پھوڑا سا ساری رات جو پکتا رہیگا دل   تو صبح تک تو ہاتھ لگایا نہ جائیگا
یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ   نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائیگا

کیا اُن نے نشے میں مجھ کو مارا   اتنا بھی تو بے خبر نہ ہوگا
اب دل کے تئیں دیا تو سمجھا   محنت زدوں کے جگر نہ ہوگا

غم اُس کو ساری رات سُنایا تو کیا ہوا   یا روز اُٹھ کے سر کو پھرا یا تو کیا ہوا
مت رنج کر کسی کو کہ اپنے تو اعتقاد   دل ڈھائے کر جو کعبہ بنایا تو کیا ہوا

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے   یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

میرؔ کس کو اب دماغِ گفتگو   عمر گزری ریختہ چھوٹا گیا

اتنی گزری جو ترے ہجر میں سو اس کے سبب   صبر مرحوم عجب مونسِ تنہائی تھا
یہی زلفوں کی تری بات تھی یا کاکل کی   میرؔ کو خوب کیا سیر تو سودائی تھا

کیا مرے آنے پہ تو اے بُتِ مغرور گیا   کبھی اس راہ سے نکلا تو تجھے گُھور گیا
چشمِ خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا   ہم نے جانا تھا کہ بس اب تو یہ ناسور گیا
نالۂ میرؔ نہیں رات سے سُنتے ہم لوگ   کیا ترے کوچے سے اے شوخ وہ رنجور گیا

تا بمقدور انتظار کیا   دل نے اب زور بے قرار کیا
دشمنی ہم سے کی زمانے نے   کہ جفا کار تجھ سا یار کیا
یہ توہم کا کارخانہ ہے   یاں وہی ہے جو اعتبار کیا
ہم فقیروں سے بے ادائی کیا   آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا
سخت کافر تھا جن نے پہلے میرؔ   مذہبِ عشق اختیار کیا

اب تو اُس کی گلی میں خوار ہیں لیک   میرؔ بے جان عزیز کوئی تھا

پھوٹا کئے پیالے، لنڈھتا پھرا قرابا   مستی میں میری تھا یاں اک شور اور شرابا
ان صحبتوں میں آخر جانیں ہی جاتیاں ہیں   نے عشق کو ہے صرفہ نے حسن کو محابا
وے دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں   سوکھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دوآبا

ستم کچھ آج گلی میں تری نہیں مجھ پر   کب آ کے خون میں میں یاں نہا نہیں جاتا

سمجھے تھے میرؔ ہم کہ یہ ناسور کم ہوا   پھر ان دنوں میں دیدۂ خوں بار نم ہوا
کیا کیا عزیز دوست ملے میرؔ خاک میں   نادان یاں کسو کا کسو کو بھی غم ہوا

نمود کرکے وہیں بحرِ غم میں بیٹھ گیا کہے تو میرؔ بھی اک بلبلا تھا پانی کا

موا میں سجدے میں پر نقش میرا بار رہا اُس آستاں پہ مری خاک سے غبار رہا
گلی میں اُسکی گیا سو گیا نہ بولا پھر میں میرؔ میرؔ کر اُس کو بہت پکار رہا

جیتے جی کوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا اُس کی دیوار کا سر سے مرے سایا نہ گیا
وہ تو کل دیر تلک دیکھتا ایدھر کو رہا ہم سے ہی حالِ تباہ اپنا دکھایا نہ گیا
زیرِ شمشیرِ ستم میرؔ تڑپنا کیسا! سر بھی تسلیمِ محبت میں ہلایا نہ گیا

دل کے تئیں آتشِ ہجراں سے بچایا نہ گیا گھر جلا سامنے پر ہم سے بجھایا نہ گیا
شہرِ دل آہ عجب جائے تھی پر اُسکے گئے ایسا اُجڑا کہ کسی طرح بسایا نہ گیا

گُل میں اس کی سی جو بُو آئی تو آیا نہ گیا ہم کو بن دوشِ ہوا باغ سے لایا نہ گیا
سر نشینِ رہِ مے خانہ ہوں میں کیا جانوں رسمِ مسجد کے تئیں شیخ کہ آیا نہ گیا
میرؔ مت عذر گریباں کے پھٹے رہنے کا کر زخمِ دل چاکِ جگر تھا کہ سِلایا نہ گیا

گریباں سے رہا کوتہ تو پھر ہے ہمارے ہاتھ میں دامن ہمارا
گئے جوں شمع اُس مجلس میں جلنے سبھوں پر حال ہے روشن ہمارا
چمن میں ہم بھی زنجیری رہے ہیں سُنا ہوگا کبھی شیون ہمارا
کیا تھا ریختہ پردہ سخن کا سو ٹھیرا ہے یہی اب فن ہمارا

مقصود کو تو دیکھیں کب تک پہنچتے ہیں ہم بالفعل اب ارادہ تا گور ہے ہمارا
تیں آہ عشق بازی چوپڑ عجب بچھائی کچی پڑیں ہیں نردیں گھر دُور ہی ہمارا
تا چند پشت پا پر شرم و حیا سے آنکھیں احوال کچھ بھی تم کو منظور ہے ہمارا
بے طاقتی کریں تو تم بھی معاف رکھیو کیا کیجے کہ دل بھی مجبور ہے ہمارا

ہیں مشتِ خاک لیکن جو کچھ ہیں میر ہم ہیں — مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

سحر گہِ عید میں دورِ سبو تھا — پر اپنے جام میں تجھ بن لہو تھا
چمن کی وضع نے ہم کو کیا داغ — کہ ہر غنچہ دلِ پُر آرزو تھا
کروگے یاد باتیں تو کہو گے — کہ کوئی رفتۂ بسیار گو تھا
جہاں پُر ہے فسانے سے ہمارے — دماغِ عشق ہم کو بھی کبھو تھا
مگر دیوانہ تھا گُل بھی کسو کا — کہ پیراہن میں سو جاگہ رفو تھا
نہ دیکھا میرِ آوارہ کو لیکن — غبار اک ناتواں سا کو بکو تھا

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا — آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا
قافلے میں صبح کے اک شور ہے — یعنی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا
سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں — تخمِ خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا
یہ نشانِ عشق ہیں جاتے نہیں — داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا

پہلو میں اک گرہ سی تہِ خاک ساتھ ہے — شاید کہ مر گئے پہ بھی خاطر میں کچھ رہا
آنکھوں نے راز داریِ محبت کی خوب کی — آنسو جو آتے آتے رہے تو لہو بہا
آئے تھے اک اُمید پہ تیری گلی میں ہم — سو آہ اس طرح چلے لوہو میں ہم نہا
کس کس طرح سے میر نے کاٹا ہے عمر کو — اب آخر آخر آن کے یہ ریختہ کہا

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل — اب یہ دعویٰ حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

غمزے نے اُسکے چوری میں دل کی ہنر کیا — اُس خانماں خراب نے آنکھوں میں گھر کیا
ہیں چاروں طرف خیمے کھڑے گرد باد کے — کیا جانیے جنوں نے ارادہ کدھر کیا

کچھ نہ دیکھا پھر بجز اک شعلۂ پُر پیچ و تاب — شمع تک ہم نے تو دیکھا تھا کہ پروانا گیا

گل کھلے صد رنگ تو کیا بے پری سے اے نسیم   مدتیں گزریں کہ وہ گلزار کا جانا گیا
دور تجھ سے میر نے ایسا تعب کھینچا کہ شوخ   کل جو میں دیکھا اُسے مطلق نہ پہچانا گیا

وصل و ہجراں سے جو دو منزل ہیں راہِ عشق کی   دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا
کب نیازِ عشق نازِ حسن سے کھینچے ہے ہاتھ   آخر آخر میر سر بر آستاں مارا گیا

نہ پوچھ اپنی مجلس میں ہے میر بھی یاں   جو ہوگا تو جیسے گنہگار ہوگا

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا   لہو آتا ہے جب نہیں آتا
ہوش جاتا نہیں رہا لیکن   جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا
صبر تھا ایک مونسِ ہجراں   سو وہ مدت سے اب نہیں آتا
دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش   گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا
دور بیٹھا غبارِ میر اس سے   عشق بن یہ ادب نہیں آتا

تو برسوں میں ملے ہے یاں فکر یہ ہے ہر   جی جائیگا ہمارا اک دم کو یا رہے گا
کیا ہے جو اُٹھ گیا ہی پر بستۂ وفا ہے   قیدِ حیات میں ہے تو میر آ رہے گا

جگر جا کی، ناکامیِ دنیا ہے آخر   نہیں آئے جو میر کچھ کام ہوگا

خوبرو اب نہیں ہیں گندم گوں   میر ہندوستاں میں کال پڑا

رہِ طلب میں گرے ہوتے سر کے بل ہم بھی   شکستہ پائی نے اپنی ہمیں سنبھال لیا
رہوں ہوں برسوں سے ہم دوش پر کبھو اُن نے   گلے میں ہاتھ مرا پیار سے نہ ڈال لیا
بتاں کی میر ستم وہ نگاہ ہے جس نے   خدا کے واسطے بھی خلق کا وبال لیا

نہ دے زنجیر کے غل میں نہ دے جب تک غزالوں کے   مرے دیوان پن تک ہی رہا معمور ویرانا
نہ ہو کیوں ریختہ بے شورش و کیفیت و معنی   گیا ہو میر دیوانہ رہا سودا سو مستانا

بار ہا گور دل جھنکا لایا   اب کے شرط وفا بجا لایا
قدر رکھتی نہ تھی متاع دل   سارے عالم میں میں دکھا لایا
دل کہ اک قطرہ خوں نہیں ہے بیش   ایک عالم کے سر بلا لایا
دل مجھے اس گلی میں لے جا کر   اور بھی خاک میں ملا لایا
ابتدا ہی میں مر گئے سب یار   عشق کی کون انتہا لایا
اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میر   پھر ملیں گے اگر خدا لایا

[illegible]   [illegible]
[illegible]   [illegible]

[illegible]   [illegible]
[illegible]   [illegible]
[illegible]   [illegible]
کہیں ہیں میر کو مارا گیا شب اس کے کوچے میں   کہیں وحشت میں شاید بیٹھے بیٹھے اٹھ گیا ہوگا

ایسی ہے میر کی بھی مدت سے رونی صورت   چہرے پہ اس کے کس دن آنسو رواں نہ پایا

کیا کیا عزیز خلع بدن ہائے کر گئے   تشریف تم کو یاں تئیں لانا ضرور تھا

جاتی نہیں اٹھائی اپنے پہ یہ خشونت   اب رہ گیا ہے آنا میرا کبھو کبھو کا
اپنے تڑپنے کی تو تدبیر پہلے کر لوں   تب فکر میں کروں گا زخموں کے بھی رفو کا

پند گویوں نے بہت سینے کی تدبیریں کیں — آہ ثابت بھی نہ نکلا یہ گریباں یک جا
تو بھی رونے کو بلا دل ہی ہمارا ابھی بھرا — ہو جسے لے ابر بیابان میں گریاں یک جا

بس اے شمع جو مجلس سے ہم گئے تو گئے — سراغ کیجو نہ پھر تو نشان پانے کا
شریف مکہ رہا ہے تمام عمر اے شیخ — یہ میر اب جو گدا ہے شراب خانے کا

افسوس میر وے جو ہوئے شہید آئے — پھر کام اُن کا اُسکی تلوار تک نہ پہنچا

کب تلک یہ ستم اُٹھائیے گا — ایک دن یوں ہی جی سے جائیے گا
شکل تصویر بے خودی کب تک — کسو دن آپ میں بھی آئیے گا
سب سے مل جل کہ حادثے سے پھر — کہیں ڈھونڈا بھی تو نہ پائیے گا
[illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible]

پل میں جہاں کو دیکھتے میرے ڈبو چکا — اک وقت میں یہ دیدہ بھی طوفان رو چکا
لگتی نہیں پلک سے پلک انتظار میں — آنکھیں اگر یہی ہیں تو پھر نیند سو چکا

اس کارواں سرا میں کیا میر بار کھولیں — یاں کوچ لگ رہا ہے شام و سحر ہمارا

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا — دم کے جانے کا نہایت غم رہا
صبح پیری شام ہونے آئی میر — تو نہ چیتا یاں بہت دن کم رہا

چوری میں دل کی وہ ہنر کر گیا — دیکھتے ہی آنکھوں میں گھر کر گیا
دہر میں میں خاک بسر ہی رہا — عمر کو اِس طور بسر کر گیا
کس کو مرے حال سے تھی آگہی — نالۂ شب سب کو خبر کر گیا
مجلسِ آفاق میں پروانہ ساں — میر بھی شام اپنی سحر کر گیا

تھی مصلحت کہ رُک کر ہجراں میں جان دیجے — دل کھول کر نہ غم میں میں ایک بار رویا
اک عجزِ عشق اُس کا اسباب صد الم تھا — کل میر سے بہت میں ہو کر دوچار رویا

یا قافلہ در قافلہ ان رستوں میں تھے لوگ — یا ایسے گئے یاں سے کہ پھر کھوج نہ پایا
ایسے بُتِ بے مہر سے ملتا ہے کوئی بھی — دل میر کو بھاری تھا کہ پتھر سے لگایا

دل جو زیرِ غبار اکثر تھا — کچھ مزاج ان دنوں مکدّر تھا
اُس پہ تکیہ کیا تو تھا لیکن — رات دن ہم تھے اور بستر تھا
سرسری تم جہان سے گزرے — ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا
دل کی کچھ قدر کرتے رہیو تم — یہ ہمارا بھی ناز پرور تھا
بعد اک عمر جو ہوا معلوم — دل اُس آئینہ رُو کا پتھر تھا
خوش رہا جب تلک رہا جیتا — میر معلوم ہے قلندر تھا

ہم وے ہیں سُن رکھو تم مر جائیں رک کے یک جا — کیا کوچہ کوچہ پھرنا عنوان ہے ہمارا

کب مصیبت زدہ دل مائلِ آزار نہ تھا — کونسے دردِ ستم کا یہ طرف دار نہ تھا
دُھوپ میں جلتی ہیں غربت وطنوں کی لاشیں — تیرے کوچے میں مگر سایۂ دیوار نہ تھا
رات حیران ہوں کچھ چُپ ہی مجھے لگ گئی میر — دردِ پنہاں تھے بہت پر لبِ اظہار نہ تھا

پوچھا جو میں نے دردِ محبت سے میر کو — رکھ ہاتھ اُن نے دل پہ ٹک اک اپنے رو دیا

کل چمن میں گل و سمن دیکھا — آج دیکھا تو باغ بن دیکھا
کیا ہے گلشن میں جو قفس میں نہیں — عاشقوں کا جلا وطن دیکھا
حسرت اُسکی جگہ تھی خوابیدہ — میرؔ کا کھول کر کفن دیکھا

کھلا نشے میں جو پگڑی کا پیچ اُسکی میرؔ — سمندِ ناز پہ اک اور تازیانہ ہوا

لائے گرد باد مت دے ہر آن عرضِ وحشت — میں بھی کسو زمانے اس کام میں بلا تھا
یہ سرگزشت میری افسانہ جو ہوئی ہے — مذکور اُس کا اُسکے کوچے میں جابجا تھا
سن کر کسی سے وہ بھی کہنے لگا تھا کچھ کچھ — بے درد کتنے بولے ہاں اُس کو کیا ہوا تھا
کہنے لگا کہ جانے میری بلا عزیزاں — احوال تھا کسو کا کچھ میں بھی سن لیا تھا
آنکھیں مری کھلیں جب جی میرؔ کا گیا تب — دیکھے سے اُس کو ورنہ میرا بھی جی جلا تھا

کیا چمن کہ ہم سے اسیروں کو منع ہے — چاکِ قفس سے باغ کی دیوار دیکھنا
آنکھیں چرا نہ تو نہ ٹک ابرِ بہار سے — میری طرف بھی دیدۂ خوں بار دیکھنا
گر زمزمہ یہی ہے کوئی دن تو ہم صفیر — اس فصل ہی میں ہم کو گرفتار دیکھنا
اُس خوش نگہ کے عشق سے پرہیز کیجو میرؔ — جاتا ہے لے کے جی ہی یہ آزار دیکھنا

خرابی دل کی اس حد ہے کہ یہ سمجھا نہیں جاتا — کہ آبادی بھی یاں تھی یا کہ ویرانہ تھا مدت کا

جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا — تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا
مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح — تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا

ہم اسیروں کو بھلا کیا جو بہار آئی نسیم — عمر گزری کہ وہ گلزار کا جانا ہی گیا

گزری مدام اُس کی جوانانِ مست میں — پیرِ مغاں بھی طرفہ کوئی پیر مرد تھا

عاشق ہیں ہم تو میر کے بھی ضبطِ عشق کے — دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

گئے قیدی ہو ہم آواز جب صیاد آ ٹوٹا — یہ ویراں آشیانے دیکھنے کو ایک میں چھوٹا

تو برسوں میں کہے ہے ملوں گا میں میر سے — ہاں کچھ کا کچھ ہے حال ابھی اُس جوان کا

کوئی رہتا ہے جی بے جی ترے کوچے میں آنے سے — تبھی آسودہ ہوگا میر صاحب جی کو کھو دے گا

مجھے زنہار خوش آتا نہیں کعبے کا ہم سایا — صنم خانہ ہی یاں اے شیخ تُو نے کیوں نہ بنوایا

شیخ کیا صورتیں رہتی تھیں بھلا جیتا دیر — رو بہ ویرانی ہوا اس کعبے کی آبادی کا
ریختہ رُتبے کو پہنچایا ہوا اُس کا ہے — معتقد کون نہیں میر کی اُستادی کا

کام پل میں مرا تمام کیا — غرض اُس شوخ نے بھی کام کیا
تیرے کوچے کے رہنے والوں نے — یہیں سے کعبے کو سلام کیا
کوئی عاشق نظر نہیں آتا — ٹوپی والوں نے قتلِ عام کیا
عشقِ خوباں کو میر میں اپنا — قبلہ و کعبہ و امام کیا

ٹک بھی نہ مُڑ کے میری طرف تُو نے کی نگاہ — اک عمر تیرے پیچھے میں ظالم لگا پھرا
دیر و حرم میں کیونکہ قدم رکھ سکے گا میر — ایدھر تو اُس سے بُت پھرے اُودھر خدا پھرا

بیٹھا ہوں جوں غبارِ ضعیف اب وگرنہ میں — پھرتا رہا ہوں گلیوں میں آوارہ گرد سا
کیا میر ہے یہی جو ترے در پہ تھا کھڑا — نم ناک چشم و خشک لب و رنگ زرد سا

خزاں التفات اس پہ کرتی بجا تھی — یہ غنچہ چمن میں ابھی وا ہوا تھا

کہاں تھا تو اس طور آنے سے میرے — گلی میں تری کل تماشا ہوا تھا
زہے طالع اے میر اُن نے یہ پوچھا — کہاں تھا تو اب تک تجھے کیا ہوا تھا

اب تو جاتا ہی ہے کعبے کو تو بت خانے سے — جلد پھر پہنچیو اے میر خدا کو سونپا

خدا کو کام تو سونپے ہیں میں نے سب لیکن — رہے ہے خوف مجھے واں کی بے نیازی کا
چلو ہو راہ موافق کہے مخالف کے — طریق چھوڑ دیا تم نے دل نوازی کا

کیا کہیے کہ خوباں نے اب ہم میں ہے کیا رکھا — ان چشم سیاہوں نے بہتوں کو سلا رکھا
کہیے جو تمیز اس کو کچھ اچھے برے کی ہو — دل جس کسو کا پایا جھٹ اُن نے اڑا رکھا

سب گئے ہوش و صبر و تاب و تواں — دل سے اک داغ ہی جدا نہ ہوا
ہم تو ناکام ہی جہاں میں رہے — یاں کبھو اپنا مدعا نہ ہوا

یار عجب طرح نگہ کر گیا — دیکھنا وہ دل میں جگہ کر گیا
جانا ہی اس بزم سے آیا تو کیا — کوئی گھڑی گو کہ [illegible] کر گیا
وصف خط و خال میں خوباں کے میر — نامۂ اعمال سیہ کر گیا

پوشیدہ راز عشق چلا جائے تھا سو آج — بے طاقتی نے دل کی وہ پردہ اٹھا دیا
سب شور ما و من کو لیے سر میں مر گئے — یاروں کو اس فسانے نے آخر سلا دیا
گویا محاسب اُنہیں دینا تھا عشق کا — اس طور دل سی چیز کو میں نے لگا دیا
ہم نے تو سادگی سے کیا جی کا بھی زیاں — دل جو دیا تھا سو تو دیا سر جدا دیا
تکلیف درد دل کی عبث ہم نشیں نے کی — درد سخن نے میرے سبھوں کو رلا دیا
اُن نے تو تیغ کھینچی تھی پر جی چلا کے میر — ہم نے بھی ایک دم میں تماشا دکھا دیا

دیوانِ دوم

کب میرؔ بسر آئے تم ویسے فریبی سے　　　دل کو تو لگا بیٹھے لیکن نہ لگا ہانا

ہائے خطاب کیا کیا دیکھے عتاب کیا کیا　　　دل کو لگا کے ہم نے کھینچے عذاب کیا کیا
کچھ سوجھتا نہیں ہے مستی میں میرؔ جی کو　　　کرتے ہیں پوچ گوئی پی کر شراب کیا کیا

کچھ بھی معاش ہے یہ کہ اُن نے ایک چشمک　　　جب مدتوں ہمارا جی دیکھنے کو ترسا
انداز سے ہے پیدا سب کچھ خبر ہے اسکو　　　گو میرؔ بے سر و پا ظاہر ہے بے خبر سا

سُکلے گئے ہے دل کی خرابی نہ پوچھیے　　　جیسے کسو کا کوئی نگر ہو لٹا ہوا
کہتا تھا میرؔ حال تو جب تک تھا بولتا　　　کچھ ضبط کرتے کرتے ترا حال کیا ہوا

سب بھی دماغ رفتہ ہمارا ہے عرش پر　　　گو آسماں نے خاک میں ہم کو ملا دیا
کہتے چراغ کی سی نہیں وہ مزاج میں　　　اب دل فسردگی سے ہوا جیسے بجھا دیا
اب گفتنے گفتنے جان میں طاقت نہیں رہی　　　مکتوب آگے چلی صبا کہ دیا سب بڑھا دیا

کیونکہ بھی رہا نہ جان کو نا آزمودہ کار　　　ہوتا نہ میرؔ تا کش مطلب گر عشق کا

حقیقت اسکی نہیں کہتے ہیں جو میرؔ مر گئے　　　کیا جہاں سے ... گلی میں آ نہ رہا

برسوں سے تو یوں ہے کہ گھٹا جب اُمنڈ آئی　　　تب دیدۂ تر سے بھی ہوا ایک جھڑا کا
تلوار کے سائے ہی میں کاٹے ہے تو اے میرؔ　　　کس دل زدہ کو ہوئے ہے یہ ذوق فنا کا

دیکھو تو ہیں جہاں وہ تہاں آگ ہو گیا　　　بھڑکا ہی کھا ہے لوگوں نے اُس کو لگا لگا

عالم کی سیر میر کی صحبت میں ہو گئی — طالع سے میرے ہاتھ یہ بے دست و پا لگا

سمجھے تھے ہم تو میر کو عاشق اسی گھڑی — جب سن کے تیرا نام وہ بیتاب سا ہوا

پھر میر آج مسجد جامع کے تھے امام — داغ شراب دھوتے تھے کل جانماز کا

نظر میں طور رکھ اس کم نما کا — بھروسہ کیا ہے عمر بے وفا کا
پرستش اب اسی بت کی ہے ہر دم — رہا ہوگا کوئی بندہ خدا کا
مروت چشم رکھنا سادگی ہے — نہیں شیوہ یہ اپنے آشنا کا
کہیں اس زلف سے کیا لگ چلی ہے — پڑے ہے پاؤں کے ڈھب کچھ صبا کا
نہ جانو میر کو ایسا ہی چپکا — نمونہ ہے یہ آشوب بلا کا
کرو دن ہی سے رخصت ورنہ شب کو — نہ سونے دیگا شور اس بے نوا کا

کہیں ہیں اب کی بہت رنگ اڑ چلا گل کا — ہزار حیف کہ ہیں بال و پر نہیں رکھتا
جدا جدا پھرے ہے میر سب سے کس خاطر — خیال ملنے کا اس کے اگر نہیں رکھتا

پھرا تھا دور اس سے مدتوں میں کوہ و صحرا میں — بلا کر پاس اپنے کچھ جو بٹھلاتا تو کیا ہوتا
کہے سے غیر کے وہ توڑ بیٹھا دوستی یاروں سے — کئے جاتا اگر ٹک چاہ کا ناتا تو کیا ہوتا
کبھو سرگرم بازی ہمدموں سے یاں بھی آ جاتا — [illegible] اگر وہ اور بہلاتا تو کیا ہوتا

[illegible] شرح حال سے فرصت نہیں ہوئی — کس دن [illegible] ادھر سے چلا گیا
کیا لطف ہے جسے جو برے حال ہوئی میر — [illegible] ہاتھ اٹھایا بھلا کیا

وہ دل کہ تیرے ہونے سے تھا بکھرا بکھرا — [illegible]

بھوؤں تئیں تم جس دم سج نکلے تھے اک بیچا | اس دن ہی تمہیں دیکھے ماتھا مرا ٹھنکا تھا
رہ میر غریبانہ جاتا تھا چلا روتا | ہر گام گلہ لب پر یارانِ وطن کا تھا

کوئی عاشقوں کی پھپٹ انہوں نے اٹھائی کبھی ہے | انہیں بات ہو جو تھوڑی اسے بھی دراز کرنا
یہی میر کھینچے قشقہ در دیر پہ تھے ساجد | نہیں اعتماد قابل انہوں کا نماز کرنا

اک آن اس زمانے میں یہ دل نہ وا ہوا | کیا جانیے کہ میر زمانے کو کیا ہوا
ظاہر کو گو درست رکھا مر کے میں دیے | دل کا لگاؤ کوئی رہا ہے چھپا ہوا
دیکھا نہ ایک گل کو بھی چشمک زنی میں ہائے | جب کچھ رہا نہ باغ میں تب میں رہا ہوا

کل دل آزردہ گلستاں سے گزر ہم نے کیا | گل لگے کہنے کہو منہ نہ ادھر ہم نے کیا
سیدھی تلوار کے منہ پر تو سے ہم آنے چلے | کیا کریں اس دلِ خستہ کو سپر ہم نے کیا
جیسے حسرت لیے جاتا ہے جہاں سے کوئی | آہ یوں کوچۂ دلبر سے سفر ہم نے کیا
بارے کل بگڑ گئے اس ظالم خونخوار سے ہم | منصفی کیجے تو کچھ کم نہ جگر ہم نے کیا

وصل و ہجراں سے نہیں ہے عشق میں کچھ گفتگو | لاگ دل کی چاہیے ہے یاں قریب و دور کیا
سنگِ بالیں میر کا جو بات کا روڑا ہوا | سخت کرجی کو گیا اس جا سے وہ رنجور کیا

جوں ابرِ قبلہ دل تو نہایت ہی بھر رہا | رونا مرا سنو گے کہ طوفان کر رہا
شب مے کدے سے واردِ مسجد ہوا تھا میں | پر شکر ہے کہ صبح تئیں بے خبر رہا
تسکین دل ہو تب کہ کبھو آ گیا بھی ہو | برسوں سے اس کا آنا یہی صبح پر رہا
اس زلف و رخ کو بھولے مجھے مدتیں ہوئیں | لیکن مرا نہ گریۂ شام و سحر رہا
رہتے تو تھے مکاں پہ ولے آپ میں نہ تھے | اس بن ہمیں ہمیشہ وطن میں سفر رہا
اب چھیڑ یہ رکھی ہے کہ پوچھے ہے بار بار | کچھ وجہ بھی کہ آپ کا منہ یوں اتر رہا
کاہے کو میں نے میر کو چھیڑا کہ ان نے آج | یہ دردِ دل کہا کہ مجھے دردِ سر رہا

جلوہ ترا تھا جب تئیں باغ و بہار تھا   اب دل کو دیکھتے ہیں تو صحرا سا ہو گیا
کل تک تو ہم وے ہنستے چلے آئے تھے ہیں   مرنا بھی میرجی کا تماشا سا ہو گیا

دل کی واشد کیلئے کل باغ میں میں ٹک گیا   سُن گلہ بلبل سے گُل کا اور بھی جی رُک گیا
میراس قاضی کے لونڈے کیلئے آخر مُوا   سب کو قضیہ اسکے جینے کا تھا بارے چُک گیا

آخر زمانہ سازی سے کھویا نہ وقر میر   یہ اختیار تم نے کیا روزگار کیا

تیشے سے کوہ کن سے کیا طرفہ کام نکلا   اپنے تو ناخنوں میں اس طور کا ہُنر تھا
پھر آج یہ کہانی کل شب پہ رہ گئی ہے   سوتا نہ رہتا ٹک تو قصہ ہی مختصر تھا
صد رنگ سے یہ خرابی کچھ تو بھی رہ گیا ہے   کیا نقل کریئے یا رو دل کوئی گھر سا گھر تھا

کہتے ہیں ضائع کیا اپنے تئیں   میر تو دانا تھا یہ کیا کر گیا

صنعت گریاں ہم نے کیں سینکڑوں یاں لیکن   جس سے کبھو وہ ملتا ایسا نہ ہُنر آیا

دُود دل کو ہمارے ٹک دیکھو   یہ بھی پُر پیچ اب ہے کاکُل سا
شوق ان اس کے لمبے بالوں کا   یاں چلا جائے ہے تسلسل سا
کب تھی جرأت رقیب کی اتنی   تم نے بھی کچھ کیا تغافل سا
یک نگہ ایک چشمک ایک سخن   اس میں بھی تم کو ہے تامل سا
بارے مستوں نے ہوشیاری کی   دے کے کچھ محتسب کا مُنہ جُھلسا
ٹوٹی زنجیر پائے میر مگر   رات سنتے رہے ہیں ہم غل سا

جی کوئی لگنا نہ سکے اُٹھ گئے پر باغ میں   گُل نے بہتیرا کہا ہم سے کہ ٹک ٹھہرا گیا

کہہ دل کو گنوایا ہے یا رنج اٹھایا ہے — اے میرؔ تجھے ہم نے کچھ آج خفا دیکھا

دیکھیں گے آدمی کی روش میرؔ ہم تری — گر سامنے سے ٹک وہ پری زاد آگیا

گرم مجھ سوختہ کے پاس سے جانا کیا تھا — آگ لینے مگر آئے تھے یہ آنا کیا تھا

خانہ خراب میرؔ بھی کتنا غیور تھا — مرنے موا پر اس کے کبھو گھر نہ جا پھرا

کیا رہیے کب تک شہر میں اب سوئے صحرا اٹھ گیا — کام اپنا اس جنوں میں ہم نے بھی یک سو کیا

مدت ہوئی الفت گئے برسوں ہوئے طاقت گئے — دل مضطرب ایسا نہ تھا کیا جانیے اب کیا ہوا
کل صبح سیر باغ میں دل اور میرا رک گیا — بلبل نہ بولا منہ سے کچھ گل ٹک نہ مجھ سے وا ہوا
مستی میں لغزش ہو گئی معذور رکھا چاہیے — اے اہل مسجد اس طرف آیا ہوں میں بہکا ہوا
فرہاد و مجنوں دو دل گئے ہم اور وامق یوں چلے — اس عارضے سے چاہ کے وہ کون سا اچھا ہوا
یا صرف خط ہے درمیاں یا گفتگو کل تھی بیاں — کیا میرؔ صاحب کے تئیں پھر ان دنوں سودا ہوا

بے رنگ بے ثباتی یہ گلستاں بنایا — بلبل نے کیا سمجھ کر یاں آشیاں بنایا
وہ تو مٹا گیا تھا تربت بھی میرؔ جی کی — دو چار اینٹیں رکھ کر پھر میں نشاں بنایا

کہتے تھے کہ صاحب اتنا کڑھا نہ کریے — اس غم نے میرؔ تم کو جی سے ندان مارا

ایک ڈھیری راکھ کی تھی صبح جائے میرؔ پر — برسوں سے جلتا تھا شاید رات جل کر رہ گیا

گل پھول سے بھی تو جو لیتا ہے منہ کو پھیرے — مکھڑے سے کس کے تو نے اے میرؔ دل لگایا

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو ۔۔۔ دیر سے انتظار ہے اپنا
روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات ۔۔۔ اب یہی روزگار ہے اپنا
صرفہ آزارِ میر میں نہ کرو ۔۔۔ خستہ اپنا ہے یار ہے اپنا

کیونکر نہ مر رہے جو بے تاب میر سا ہو ۔۔۔ اک آدھ دن تو گھر سے دل تھام تھام نکلا

کیا کہیں کچھ کہا نہیں جاتا ۔۔۔ اب تو چپ بھی رہا نہیں جاتا
کب تری رہ میں میر گرد آلود ۔۔۔ لوہو میں آ نہا نہیں جاتا

تحمل نہ تھا جسکو تک سو دو میں ۔۔۔ ستم کیسے کیسے اٹھانے لگا
گزندے عشق میر کو ہی ہوں نہ یک تملک ۔۔۔ جگر آہ منہ تک تو آنے لگا
پریشاں ہیں اس وقت میں [illegible] ۔۔۔ موا جو کوئی وہ ٹھکانے لگا
دل یاد سے ہوں جو میں آپ [illegible] ۔۔۔ سو اب جی ہی اب بھول جانے لگا
نہیں رہتے عاقل خلا تجھ بغیر ۔۔۔ کہیں میر دن کو دوانے لگا

کہتے نہ تھے میر منہ لگا کر ۔۔۔ دل ہو نہ گیا گدا نہ تیرا

نظر میں آئے گا جب جی کا کھونا ۔۔۔ لگے گا نیند بھر تب مجھ کو سونا
وصیت میر نے مجھ کو یہی کی ۔۔۔ کہ سب کچھ ہونا تو عاشق نہ ہونا

آنسو مری آنکھوں میں ہر دم جو نہ آ جاتا ۔۔۔ تو کام مرا اچھا پردے میں چلا جاتا
کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا ۔۔۔ یہ کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا
گر عشق نہیں ہے تو یہ کیا ہے بھلا مجھ کو ۔۔۔ جی خود بخود اے ہمدم کاہے کو کھپا جاتا
تکلیف نہ کی ہم نے اس وحشی کو مرنے کی ۔۔۔ تھا میر تو ایسا بھی دل جی سے اٹھا جاتا

عمامے کے شیخ کہیں میکدے سے جا
بس مغبچوں نے حد سے زیادہ ادب کیا
بچھڑے تمہارے اپنا عجب حال ہو گیا
جس کی نگاہ پڑ گئی اُن نے عجب کیا
کی زندگی سو دہ کی موئے اب سو اس طرح
جو کام میر جی نے کیا وہ کڈھب کیا

جب رات سر پٹکنے نے تاثیر کچھ نہ کی
ناچار میر منڈکری سی مار سو گیا

کبھو جو آن کے ہم سے بھی تُو ملا کرتا
تو تیرے جی میں مخالف نہ اتنی جا کرتا
چمن میں پھول گل اب کے ہزار رنگ کھلے
دماغ کاش کہ اپنا بھی ٹک وفا کرتا
فقیر بستی میں تھا تو ترا زیاں کیا تھا
کبھو جو آن نکلتا کوئی صدا کرتا
گلی سے یار کی ہم تو گئے سر پہ شور
وگرنہ شام سے ہنگامہ ہی رہا کرتا
خراب مجھ کو کیا دل کی اس لگنے نے ورنہ
فقیر تکیے کا ہی کیوں اُٹھا کرتا
گئے پہ تیرے نہ تھا ہم الم کوئی اسے تئیں
کبھو نسیم سے میں درد دل کہا کرتا
کہیں کی خاک کوئی منہ پہ کب تلک ملتا
خراب و خوار کہاں تک بھلا پھرا کرتا
ترے مزاج میں تاب تعب بھی میر کہاں
کبھو یہ عشق نہ کرتا تو تو بھلا کرتا

بندھا رات آنسو کا کچھ تار سا
ہوا ابر رحمت گنہ گار سا
کوئی سادہ ہی اُس کو سادہ کہے
لگے ہے ہمیں تو وہ عیار سا
محبت ہے یا کوئی جی کا ہے روگ
سدا میں تو رہتا ہوں بیمار سا
جو ایسا ہی تم ہم کو سمجھو ہو سہل
ہمیں بھی یہ جینا ہے دشوار سا
مرا آنکھ تیری بھی چھپتی نہیں
ٹپکتا ہے چتون سے کچھ پیار سا
دکھاؤں متاع وفا کب اُسے
لگا واں تو رہتا ہے بازار سا
نہیں میر مستانہ صحبت کا باب
مصاحب کرو کوئی ہوشیار سا

کیا آج کل سے اُس کی یہ بے توجہی ہے
مُنہ اُن نے اس طرف سے پھیرا ہے میر کب کا

کل نہ آنے میں ایک یاں تیرے   آج سو سو طرف گمان گیا
کون جی سے نہ جائے گا اے میر   حیف یہ ہے کہ نوجوان گیا

یا خط چلے ہی آتے تھے یا حرف ہی نہیں   شاید کہ سادگی کا وہ ہنگام ہو چکا
تڑپے ہے جبکہ سینے میں اُچھلے ہے دو دو ہاتھ   گر دل یہی ہے میر تو آرام ہو چکا

دامان و جیب دونوں ہوئے ٹکڑے ایک جا   اب کی یہ کام ہاتھ سے میرے سمٹ گیا

دفتر لکھے ہیں میر نے دل کے الم کے یہ   یاں اپنے طور و طرز میں وہ فرد ہو گیا

کچھ زرد زرد چہرہ کچھ لاغری بدن میں   کیا عشق میں ہوا ہے اے میر حال تیرا

نہ ہولیوں مے کدہ مسجد سا پیرداں ہوش جاتے ہیں   ہوا ہے دونوں جاگہ ایک دو باری گزر اپنا

میر بھی دیر کے لوگوں ہی کی سی کہنے لگا   کچھ خدا لگتی بھی کہتا جو مسلماں ہوتا

میر لے کاش زباں بند رکھا کرتے ہم   صبح کے بولنے نے ہم کو گرفتار کیا

ہوئے یار کیا کیا خراب اُس بغیر   وہ کس خانہ آباد کے گھر گیا
بہت رفتہ رہتے ہو تم اُسکے اب   مزاج آپ کا میر کیدھر گیا

لوگوں کا پاس ہم کو مارے رکھے ہے ورنہ   ماتم میں دل کے شیون دو دو پہر رہے گا
اب رفتگی رویہ اپنا کیا ہے میں نے   میرا یہ ڈھب دلوں میں کچھ راہ کر رہے گا
ہم کوئی بیت جا کر اُسکے ہی مُنہ سُنیں گے   وحشت زدہ کسو دن گر میر گھر رہے گا

کیا کہوں اب کی جنوں میں گھر کا بھی رہنا گیا — کام جو مجھ سے ہوا سو عقل سے باہر ہوا

نہ ترک عشق جو کرتا تو میر کیا کرتا — جفاکشی نہیں ہے کام ناز پرور کا

ہر چند شعر میر کا دل معتقد نہ تھا — پر اس غزل کو ہم نے بھی سن کر لکھا رکھا

میر کے ہوش کے ہیں ہم عاشق — فصل گل جب تلک تھی مست رہا

بہت روئے ہم شبنم و گل کو دیکھ — کہ چپ ہاں ہنس بھی کہیں پیار تھا
گیا میر یاں سے کرو گے جو یاد — کہو گے کہ مسکیں عجب یار تھا

دل گیا مفت اور دکھ پایا — ہو کے عاشق بہت میں پچھتایا

تم کو جیتا رکھے خدا اے بتاں — مر گئے ہم تو کرتے کرتے وفا
اٹھ گیا میر وہ جو بالیں سے — پھر مری جان مجھ میں کچھ نہ رہا

میر اُن نے سرگذشت سنی ساری رات گو — افسانہ عاشقی کا ہماری فسوں ہوا

دم گنتے گنتے اپنی کوئی جان کیوں نہ دو — وہ پاس آن بیٹھے کسو کے حساب کیا
ہر چند میر بستی کے لوگوں سے ہے نفور — پر ہائے آدمی ہے وہ خانہ خراب کیا

اے نکیلے یہ تھی کہاں کی ادا — کھب گئی جی میں تیری بانکی ادا
دل چلے جاتے ہیں خرام کے ساتھ — دیکھی چلنے میں ان بتاں کی ادا

رہا میں تو عزت کا اعزاز کرتا — چلا عشق خواری کو ممتاز کرتا

گو کہ یہی ہو گئی یاوہ گوئی　　　رہا میں خموشی کو آواز کرتا
زیارت گہ کب تو ہو جا سے　　　فلک آ میر کی خاک پہ ناز کرتا

میں تو افسردہ ہر چمن میں پھرا　　　غنچۂ دل مرا کہیں نہ کھلا

اگر جیتا رہا میں تیرا اے یار　　　تو شب کو مُو بمُو قصہ کہوں گا

عشق سے دل پہ تازہ داغ جلا　　　اس سیہ خانے میں چراغ جلا
میر کی گرمی تم سے اچرج ہے　　　کس سے ملتا ہے یہ دماغ جلا

دیوانِ سوم

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے　　　درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

یک جہاں مہر و وفا کی جنس تھی میرے کنے　　　لیکن اس کو پھیر ہی لایا جہاں میں لے گیا

باتیں ہماری ساری بے ڈھنگیاں ہیں ویسے ہی　　　بوڑھے ہوئے پہ ہم کو اب تک نہ ڈھنگ آیا

تسبیح تک تو میر نے رکھا کلال کے　　　وقتِ نماز اب بھی ہوتے تھے امام کیا

چال یہ کیا تھی کہ ادھر کو گزارا نہ کیا　　　دور ہی دور پھرے پاس ہمارا نہ کیا

کہنے لگا کہ شب کو میرے تئیں نشا تھا　　　مستانہ میر کو میں کیا جان کرکے مارا

گیا حسن خوبانِ بدراہ کا　　　ہمیشہ رہے نام اللہ کا

پشیماں ہوا دوستی کرکے میں — بہت مجھکو ارمان تھا چاہ کا
رہوں جا کے مرحضرت یار میں — یہی قصد ہی بندہ درگاہ کا
عدم کو نہیں نل کے جاتے ہیں لوگ — غم اس راہ میں کیا ہی ہمراہ کا

چشم سے خوں ہزار نکلے گا — کوئی دل کا بخار نکلے گا
عزلت میر عشق میں کب تک — ہو کے بے اختیار نکلے گا

راہ اس سے ہوئی خلق کو کس طور سے یارب — ہم کو کبھی ملنے کا تو اُسکے نہ ڈھب آیا
کیا پوچھتے ہو دیکے سخن منہ سے نہ نکلا — کچھ دیکھتے اُس کو مجھے ایسا ادب آیا
کہتے تو ہیں میلان طبیعت ہی اُسے بھی — یہ باتیں ہیں ایدھر کو مزاج اُسکا کب آیا
جاتا تھا چلا راہ عجب چال سے کل میر — دیکھا اُسے جس شخص نے اُسکو عجب آیا

کیا کام کیا ہم نے دل یوں نہ لگانا تھا — اس جان کی جوکھوں کو اس وقت نہ جانا تھا
کیونکر گلی سے اُس کی میں اُٹھ کے چلا جاتا — یاں خاک میں ملنا تھا لوہو میں نہانا تھا
کہتا تھا کسو سے کچھ تکتا تھا کسو کا منہ — کل میر کھڑا تھا یاں سچ ہے کہ دوانا تھا

سہل ایسا نہ تھا آخر جی سے مرا جانا تھا — ٹک رنجہ قدم کرکر مجھ تک اُسے آنا تھا
مت سہل ہمیں سمجھو پہنچے تھے ہم تب ہم — برسوں تئیں گردوں نے جب خاک کو چھانا تھا
کہتے نہ تھے ہم واں سے پھر آچکے جیتے تم — میر اس گلی میں تم کو زنہار نہ جانا تھا

لوگ دل دیتے سُنے تھے میر دے گزرا ہے جی — لیک اپنے طور پر ان نے بھی اک سودا کیا

سینکڑوں افسوں دنوں کو پڑھتے تھے تس پر بھی میر — بیٹھ ساراتوں کو باہم اب فسانہ ہوگیا

لوگ ہی اس کارواں کے حرف نشنو تھے تمام — راہ چلتے تو جرس ہر گام چلاتا رہا

میرؔ دیوانہ ہے اچھا بات کیا سمجھے مری	یوں تو مجھ سے جب ملا میں اسکو سمجھاتا رہا

میں گلستاں میں آکے عبث آشیاں کیا	بلبل نے بھی نہ طور گلوں کا بیاں کیا

وفا تھی مہر تھی اخلاق تھا تلطف تھا	کبھو مزاج میں اُس کے ہمیں تصرف تھا
جہاں میں میرؔ سے کاہیکو ہوتے ہیں پیدا	سُنا یہ واقعہ جن نے اُسے تاسف تھا

گلی میں اُس کے میری رات کیا آرام سے گزری	یہی تھا سنگ بالیں خاک تھی بستر جہاں میں تھا
غضب کچھ شور تھا سر میں بلا بے طاقتی جی میں	قیامت لحظہ لحظہ تھی مرے دل پر جہاں میں تھا
عجب دن میرؔ تھے دیوانگی میں دشت گردی سے	سر اُوپر سایہ گستر ہوتے تھے کیکر جہاں میں تھا

عاقلانہ حرف زن ہو میرؔ تو کر جیئے بیاں	زیر لب کیا جانیئے کہتا ہے کیا مجذوب سا

نہیں اُس طرف میرؔ جانے سے رہتا	رہے گا تو اُودھر ہی مر کر رہے گا

میرؔ کو کتنے دنوں سے رہتی تھی بے طاقتی	رات دل تڑپا بہت شاید کہ مر کر رہ گیا

دن جی کے اُلجھنے کے ہی جھگڑے میں کٹے ہے	رات اُسکے خیالات سے رہتے ہیں قضایا
کیا کہیئے دماغ اُس کا کہ گل گشت میں کل میرؔ	گل شاخوں سے جھک آئے تھے پر منہ نہ لگایا

اب کی ہے حدیث اس سے سخن کرنیکی میں نے	کیا میرؔ سے بولے کوئی ہے بیہودہ گو سا

کسو ہنر سے تو ملتے تھے باہم اگلے لوگ	ہمیں بھی کاش کہ ایسا کوئی ہنر آتا
شراب خانے میں شب مست ہو رہا شاید	جو میرؔ ہوش میں ہوتا تو اپنے گھر آتا

کیا تم کو پیار سے وہ اے میر منہ لگا دے ۔۔۔ پہلے ہی چومے تم تو کاٹو ہو گال اُس کا

زار رکھا بے حال رکھا بیتاب رکھا بیمار رکھا ۔۔۔ حال رکھا تھا کچھ بھی ہم میں عشق نے آخر مار رکھا

میلان اُس کا تھا کا ہیکو جانب اُلفت کیشوں کے ۔۔۔ اپنی طرف سے ہم نے اب تک اس ظالم سے پیار رکھا

عشق بھی ہم میں ہائے تصرّف کیسے کیسے کرتا ہے ۔۔۔ دل کو چاک جگر کو زخمی آنکھوں کو خوں بار رکھا

کام اس سے اک طور پہ لیتے بے طور اسکو ہونے نہ دیتے ۔۔۔ حیف ہے میر سپہر دَدنی ہم سے نہ اُس کو یار رکھا

تکلیفِ باغ ہم کو یاروں نے کی وگر نہ ۔۔۔ گُل پھُول سے کوئی دم اپنا ہے دل بہلتا

کرتا ہے وے سلوک اب جس سے کہ جان جاوے ۔۔۔ ہم میر یوں نہ مرتے اس پر جو دل نہ جلتا

بوسہ اُس بُت کا لیکے مُنہ موڑا ۔۔۔ بھاری پتھر تھا چُوم کر چھوڑا

دل نے کیا کیا نہ رات درد دئے ۔۔۔ جیسے پکتا رہے کوئی پھوڑا

دیکھو ہو تو دُور بھاگتے ہو ۔۔۔ کچھ پاس نہیں تمہیں ہمارا

کیا کہے حال کہیں دل زدہ جا کر اپنا ۔۔۔ دل نہ اپنا ہے محبّت میں نہ دلبر اپنا

دوریٔ یار میں ہے حالِ دل ابتر اپنا ۔۔۔ ہم کو سو کوس سے آتا ہے نظر گھر اپنا

کہتے تھے ہم تباہ ہے اب حال میر کا ۔۔۔ دیکھا نہ تم نے اُس میں بھلا کچھ بھی حال تھا

دل عجب شہر تھا خیالوں کا ۔۔۔ لوٹا مارا ہے حُسن والوں کا

جی کو جنجال دل کو ہے اُلجھاؤ ۔۔۔ یار کے حلقہ حلقہ بالوں کا

دم نہ لے اُس کی زلف کا مارا ۔۔۔ میر کاٹا جئے نہ کالوں کا

پھرتا تھا میر غمزدہ یک عمر سے خراب ۔۔۔ اب منہ کرے ہے کم یار سے کسی در پہ جا گرا

یاں شہر شہر بستی اوجڑی پڑی ہے ساری　　اقلیم عاشقی میں بستا نگر نہ دیکھا
اب کیا کریں کہ آیا آنکھوں میں جی ہمارا　　افسوس پہلے ہم نے ٹک سوچ کر نہ دیکھا
سوجھا نہ چاہ میں کچھ برباد کر چکے دل　　میر اندھے ہو رہے تھے اپنا بھی گھر نہ دیکھا

خراب احوال کچھ بکتا پھرے ہے دیر و کعبے میں　　سخن کیا معتبر ہے میر سے واہی تباہی کا

ساون ہرے نہ بھادوں یاں ہم سوکھے اہل درد　　سبزہ ہماری پلکوں کا سیراب تھا سو تھا
برسوں سے ہے تلاوت و سجادہ و نماز　　پر میلِ دل جو سوئے مے ناب تھا سو تھا
ہم خشک لب جو روتے رہے جوئیں سا بہہ چلیں　　پر میر دشتِ عشق کا بے آب تھا سو تھا

دیوان چہارم

غیرت سے تنگ آتے غیروں سے لڑ مریں گے　　آگے بھی میر سید کرتے گئے ہیں ساکا

گل پھول فصلِ گل میں صد رنگ ہیں شگفتہ　　میں دل زدہ ہوں اب کی رنگینی ہوا کا
عاشق کی چشمِ تر میں گو دبتے آویں لیکن　　پاؤں کا دلبروں کے چھپتا نہیں جھپاکا

قصہ کہیں تو کیا کہیں ملنے کی رات کا　　پہروں جو واں اُن نے رکھا بات بات کا
واعظ کہے سو سچ ہے ولے مے فروش سے　　ہم ذکر بھی سنا نہیں صوم و صلوٰۃ کا

تجاہل تغافل تساہل کیا　　ہوا کام مشکل توکل کیا
زمینِ غزل ملک سی ہو گئی　　یہ قطعہ تصرف میں بالکل کیا
جنوں تھا نہ مجھ کو نہ چپ رہ سکا　　کہ زنجیر ٹوٹی تو میں غل کیا
ہمیں شوق نے صاحبو کھو دیا　　غلاموں سے اُسکے توسل کیا
حقیقت نہ میر اپنی سمجھی گئی　　شب و روز ہم نے تامل کیا

رفتۂ عشق کیا ہوں میں اب کا — جا چکا ہوں جہان سے کب کا
لوگ جب ذکر یار کرتے ہیں — دیکھ رہتا ہوں میں منہ سب کا
مست رہتا ہوں جب سے ہوش آیا — میں بھی عاشق ہوں اپنے مشرب کا
ہم تو ناکام ہی چلے یاں سے — تم کو ہوگا وصول مطلب کا
زلف سا پیچدار ہے ہر شعر — ہے سخن میر کا عجب ڈھب کا

کیا یاری کر دور پھرا وہ کیا کیا اُن نے فریب کئے — جس کے لئے آوارہ ہوئے ہم چھوٹا شہر و دیار اپنا
بات کہے تلوار نکالے آنکھ لڑائے جی مارے — کیونکہ جتاوے اُس سے کوئی ربط محبت پیار اپنا
ہم نے یار وفاداری میں کوتاہی تقصیر نہ کی — کیا رو ویں چاہت کے اثر کو وہ نہ ہوا ٹک یار اپنا
رحم کیا کر لطف کیا کر پوچھ لیا کر آخر ہے — میر اپنا غم خوار اپنا پھر زار اپنا بیمار اپنا

---

۸ اے کاش مرے سر پہ اک بار وہ آ جاتا — ٹھہراؤ سا ہو جاتا یوں جی نہ چلا جاتا
تب تک ہی تحمل ہے جب تک نہیں آتا وہ — اس رستے نکلتا تو ہم سے نہ رہا جاتا
وسواس نہ کرتا تھا مر جانے سے ہجراں میں — تھا میر تو ایسا بھی دل جیسے اُٹھا جاتا

مستانہ اگرچہ میں طاعت کو لگا جاتا — پر بعد نماز اُٹھ کر مے خانے چلا جاتا
تھا میر بھی دیوانہ پر ساتھ ظرافت کے — ہم سلسلہ داروں کی زنجیر ہلا جاتا

گو بے کسی سے عشق کی آتش میں جل بجھا — میں جوں چراغ گور اکیلا جلا کیا
بد حال ٹھنڈی سانسیں بھرا کب تلک کرے — سرگرم مرگ میر ہوا تو بھلا کیا

یہ نذر بدی ہے میں کعبے سے جو اُٹھتا ہوں — بت خانے میں جاؤں گا زنار بندھاؤں گا
سرگرم طلب ہو کر کھویا سا گیا آپ ہی — کیا جانیے پاؤں گا یا اُس کو نہ پاؤں گا
گر میر ہوں چپکا سا پر طرفہ ہنر در ہوں — بگڑے گا نہ ٹک وہ تو سو باتیں سناؤں گا

گردن کشی سے اپنی مارے گئے ہم آخر　　عاشق اگر ہوئے تھے نازو غرور کیا تھا
ہائے وائے یہ نہ سمجھے مارے پڑینگے اسمیں　　اظہار عشق کرنا ہم کو ضرور کیا تھا
مرتا تھا جس کی خاطر اُس کی طرف نہ دیکھا　　میر ستم رسیدہ ظالم غیور کیا تھا

دل کو گل کہتے تھے درد و غم سے مرجھایا گیا　　جی کو مہماں سنتے تھے مہمان سا آیا گیا
عشق سے ہو حال جی میں کچھ تو کہیئے دیکھیو　　ایک دن باتیں ہی کرتے کرتے سنّاٹا آیا گیا
جیسے پرچھائیں دکھائی دیکے ہو جاتی ہے محو　　میر بھی اُس کام جاں کا وہیں تھا سایا گیا

کہتے ہیں میر کعبے گیا ترکِ عشق کر　　راہِ دلِ شکستہ کدھر وہ کدھر گیا

دن رات خوں کیا ہی کئے ہم جگر کو پھر　　گر پھول گل سے کوئی گھڑی جی بہل گیا
تیور بدلنے سے تو نہیں اُسکے بے حواس　　اندیشہ یہ ہے طور ہی اُس کا بدل گیا
ہر چند میں نے شوق کو پنہاں کیا ولے　　اک آدھ حرف پیار کا مُنہ سے نکل گیا
چلنے لگے تھے راہِ طلب پر ہزار شکر　　پہلے قدم ہی پاؤں ہمارا پھسل گیا
میں دو دلا تو آگے ہی تھا فرطِ شوق سے　　طور اُس کا دیکھ اور بھی کچھ دل دہل گیا
سر اب لگے جُھکانے بہت خاک کی طرف　　شاید کہ میر جی کا دماغی خلل گیا

عشقِ رُسوائی طلب نے مجھکو سرگرداں کیا　　کیا خرابی سر پہ لایا صومعہ ویراں کیا
ہم سے تو جُز مرگ کچھ تدبیر بن آتی نہیں　　تم کہو کیا تم نے دردِ عشق کا درماں کیا
لکھنؤ دلّی سے آیا یاں بھی رہتا ہے اُداس　　میر کو سرگشتگی نے بے دل و حیراں کیا

سوزشِ دل کے سبب مرگ نہ تھی عاشق کی　　اپنی غیرت میں وہ کچھ آپ ہی جلا جاتا تھا
میر کو واقعہ کیا جانیئے کیا تھا درپیش　　کہ طرف دشت کے جوں سیل چلا جاتا تھا

ترکِ لباس سے میر کے اُسے کیا وہ رفتہ رعنائی کا　　جامے کا دامن پاؤں میں اُلجھا ہاتھ آنچل کلائی کا

No ۶۹۹

میر سختی کش تھا غافل بے خبر اس نے خبر کی — حادثے کا کیسا اس کے سر پہ سے چکر گیا

کیا عشق سو پھر مجھے غم رہا — مژہ نم رہیں حال درہم رہا
ہوا غم مجھے خوں جگر میں نہیں — اگر آنسو آتے کوئی تھم رہا
رہی آتی آندھی سی سینے میں میر — بہت دن تڑپنے کا اودھم رہا

مکے گیا مدینے گیا کربلا گیا — جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آ گیا
دیکھا ہو کچھ اس آمد و شد میں تو میں کہوں — خود گم ہوا ہوں بات کی تہ اب جو پا گیا
بیٹھا تو بوریے کے تئیں سر پہ رکھ کے میر — صف کس ادب سے ہم فقرا کی اٹھا گیا

عشق کی ہے بیماری ہم کو دل اپنا سب درد ہوا — رنگ بدن میت کے رنگوں جیتے جی ہی یہ زرد ہوا

عشق کیا کیا آفتیں لاتا رہا — آخر اب دوری میں جی جاتا رہا
کیسے کیسے رک گئے ہیں میر ہم — مدتوں منہ تک جگر آتا رہا

لطف سے پوچھتا تھا ہر کوئی — جب تلک لطف کچھ تمہارا تھا
موسم گل میں ہم نہ چھوٹے حیف — گشت تھا دید تھا نظارا تھا
عشق بازی میں کیا موئے ہیں میر — آگے ہی جی انہوں نے ہارا تھا

خوب کیا جو اہل کرم کے جود کا کچھ نہ خیال کیا — ہم جو فقیر ہوئے تو ہم نے پہلے ہی ترک سوال کیا
میر سدا بے حال رہو ہو مہر و وفا سب کرتے ہیں — تم نے عشق کیا سو صاحب کیا یہ اپنا حال کیا

خلوت ہی رہا کی ہے مجلس میں تو یوں اس کی — ہوتا ہے جہاں یک جا میں میر جہاں آیا

آنکھیں لگی رہتی ہیں اکثر چاک قفس سے اسیروں کی — جھونکا باد بہاری کا گل برگ کوئی یاں لاوے گا

لیک تلطف کی امید بھی اس کی چشم غضب سے ہم کو نہیں — ایدھر اودھر دیکھے گا پر ہم سے آنکھ چھپا دے گا

بہار آئی چلو چمن میں ہوا کے اوپر بھی رنگ آیا — کہاں تلک گل نہ ہووے غنچہ رہا مندے منہ بہو تنگ آیا
ہیں موند [illegible] پھٹی ہے کہنی چشمی ہو چولی پہنی ہو مہری — قیامت اسکی ہے تنگ پوشی ہمارا جی تو بہ تنگ آیا
رہا ہے رونا ہی ہے کڑھنا ہی، وہ سوزش جوانی کی سی — بڑھاپا آیا ہے عشق ہی میں پہ میر ہم کو نہ ڈھنگ آیا

دل کو کہیں لگنے دو میرے کیا کیا رنگ دکھاؤں گا — چہرے سے خوں ناب ملوں گا پھولوں سے گل کھاؤں گا
گرچہ نصیحت سب ضائع ہے لیکن خاطر ناصح کی — دل دیوانہ کیا سمجھے گا اور بھی میں سمجھاؤں گا
دل کے تئیں اس راہ میں کھو افسوس کناں اب پھرتا ہوں — یعنی رفیق و شفیق پھر ایسے میر کہاں میں پاؤں گا

جانا تھا تجھ کو ہم نے تو پختہ مغز ہوگا — دیکھا تو میر تیرا سودا ابھی خام نکلا

نے ہم سے کچھ نہ اس ستم ایجاد سے ہوا — ظلم صریح عشق کی امداد سے ہوا
شیریں کا حسن ایسا تھا خستہ جان دیں — جو کچھ ہوا سو خواہش فرہاد سے ہوا

زار کیا بیمار کیا اس دل نے کیا آزار کیا — داغ سے تن گل زار کیا سب آنکھوں کو خوں بار کیا
چاہا ہم نے کیا کیا تھا پر اپنا چاہا کچھ نہ ہوا — عزت کھینچی، ذلت کھینچی عشق نے خوار و زار کیا
سادگی میری نے آہ نہ جانا جی ہی اس میں جاتا ہے — عشق کا اس پر کار کے میں نے لوگوں میں اقرار کیا

چڑھی تیوری کبھو اسکی نہ اتری — غضب ہے قہر ہے پیارا ہمارا
گلہ لب تک نہ آیا میر ہرگز — کھپا جی ہی میں غم سارا ہمارا

دیوان پنجم

دور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھے طریق غزالوں کا — وحشت کرنا شیوہ ہے کیا اچھی آنکھوں والوں کا

پہلے تدارک کچھ ہوتا تو نفع بھی ہوتا سو تو میر — کام ہے آخر عشق میں اُسکے بیماروں بدحالوں کا

رُسوائے شہر ہے یاں حرف و سخن ہمارا — کیا خاک میں ملا ہے افسوس فن ہمارا

سخن مشتاق ہے عالم ہمارا — غنیمت ہے جہاں میں دم ہمارا
رہے ہم عالمِ مستی میں اکثر — رہا کچھ اور ہی عالم ہمارا
بہت ہی دُور ہم سے بھاگتے ہو — کرو ہو پاس کچھ تو کم ہمارا

کیا پوچھو ہو کیا کہیے یاں دل نے بھی کیا کام کیا
عشق کیا ناکام رہا آخر کو کام تمام کیا

عجز کیا سو اس مفسد نے قدر ہماری یہ کچھ کی
تیوری چڑھائی غصہ کیا جب ہم نے جھک کے سلام کیا

کہنے کی بھی لکھنے کی بھی ہم تو قسم کھا بیٹھے تھے
آخر دل کی بیتابی سے خط بھیجا پیغام کیا

عشق کی تہمت جب تک ہوئی تھی کاہیکو ایسی شہرت تھی
شہر میں اب رُسوا ہیں یعنی بدنامی سے کام کیا

ریگستاں میں جاکے رہیں یا سنگستاں میں ہم جوگی
رات ہوئی جس جاگہ ہم کو ہم نے وہیں بسرام کیا

جیسے کوئی جہاں سے جاوے رخصت اس حسرت سے ہوئی
اس کوچے سے نکل کر ہم نے رُو بہ قفا ہر گام کیا

عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گیا آرام گیا — جی کا جانا ٹھہر رہا ہے صبح گیا یا شام گیا
عشق کیا سو دین گیا ایمان گیا اسلام گیا — دل نے ایسا کام کیا کچھ جس سے میں ناکام گیا
کس کس اپنی کل کو رووے ہجراں میں بیکل اس کا — خواب گئی ہے تاب گئی ہے چین گیا آرام گیا
آمایاں سے جانا ہے تو جی کا چھپانا کیا حاصل — آج گیا یا کل جاوے گا صبح گیا یا شام گیا

ہائے جوانی کیا کیا کہیے شور سروں میں رکھتے تھے
اب کیا ہے وہ عہد گیا وہ موسم وہ ہنگام گیا

گالی جھڑکی خشم و خشونت یہ تو سر دست اکثر ہیں
لطف گیا احسان گیا انعام گیا اکرام گیا

لکھنا کہنا ترک ہوا تھا آپس میں تو مدت سے
اب جو قرار کیا ہے دل سے خط بھی گیا پیغام گیا

نالۂ میر سواد میں ہم تک دوشیں شب سے نہیں آیا
شاید شہر سے ظالم کے عاشق وہ بدنام گیا

وصل میں رنگ اُڑ گیا میرا
کیا جدائی کو منہ دکھاؤں گا

چھانتا ہوں کسی گلی کی خاک
دل کو اپنے کبھو تو پاؤں گا

کیسا کیا جگر خوں آزار کیسے کھینچے
آساں نہیں ہوا دل اندوہ گیں ہمارا

رنج بہت کھینچے تھے ہم نے طاقت جی کی تمام ہوئی
اپنے گئے پر یاد رہے یہ وہ بھی بہت پچھتاوے گا

اندھے سے ہم چاہ میں اُسکی گو اُسے ناسمجھ پھرتے ہیں
سوجھتا بھی کچھ کر آئیں گے کیا تو ہم کو سجھاوے گا

عاشق کی دل جوئی کی بھی راہ و رسم سے واقف رہ
ہو جو ایسا گم شدہ اپنا اس کو نہ تو پھر پاوے گا

چتون بے ڈھب آنکھیں پھری ہیں پلکوں سے بھی نظر چڑھی
عشق ابھی کیا جانیے ہم کو کیا کیا میر دکھاوے گا

اے سنکیلے یہ تھی کہاں کی ادا
کھپ گئی جی میں تیری بانکی ادا

خاک میں مل کے میر ہم سمجھے
بے ادائی تھی آسماں کی ادا

رہا میں تو عزت کا اعزاز کرتا
چلا عشق خواری کو ممتاز کرتا

گلوگیر ہی ہو گئی یاد گوئی
رہا میں خموشی کو آواز کرتا

زیارت گہ کبک تو ہو بلا سے
ملک آ میر کی خاک پر ناز کرتا

شیخ حرم سے لڑکے چلا ہوں سب کعبے میں آؤں گا
تا بُت خانہ ہر قدم اوپر سجدہ کرتا جاؤں گا
بہر پرستش پیش صنم ہاتھوں سے قیس بیاباں کے

رشتۂ سبحہ توڑاؤں گا زنار گلے سے بندھاؤں گا

طائف رستہ کعبے کا جو کوئی مجھ سے پوچھے گا

جانب دیر اشارت کر کے راہ اُدھر کی بھلاؤں گا

بے دین اب جو ہوا سو ہوا ہوں طوف حرم سے مجھکو کیا

غیر از سوئے صنم خانہ میں رُو نہ اِدھر کو لاؤں گا

آ کے مسافر میر عرب میں اور عجم میں کہتے ہیں

اب شہروں میں ہندوستاں کے کافر میر کہاؤں گا

خوگر ہو نا حزن و بکا سے میر ہمارا یوں ہی نہیں
برسوں روتے کڑھتے رہے تب ہم دل کو غم ناک کیا

بعد ہمارے اس فن کا جو کوئی ماہر ہووے گا
درد آگیں انداز کی باتیں اکثر پڑھ پڑھ رووے گا

میر افسردہ دل چمن میں پھرا
غنچۂ دل کہیں نہ اس کا کھلا

نہ وہ آوے نہ جاوے بے قراری
کبھو دن میر یوں ہی مر رہوں گا

گرم مزاج رہا نہیں اپنا ویسے اس کی ہجراں میں
ہوتے ہوتے افسردہ دیکھو گے اک دن سرد ہوا

میر نہ اپنے دردِ دل کو مجھ سے کہا کر روز و شب
صبح جو گوش دل سے سنا تھا دل میں میرے درد ہوا

دل تڑپے ہے جان کھپے ہے حال جگر کا کیا ہوگا
مجنوں مجنوں لوگ کہے ہیں مجنوں کیا ہم سا ہوگا

کیا جانیں آشفتہ دلاں کچھ ان سے ہمکو بحث نہیں
وہ جانے گا حال ہمارا جس کا دل بے جا ہوگا

رُو بہ ہی اب لاہی چکے ہیں ہم سے قطع اُمید کرد
روگ لگا ہے عشق کا جسکو وہ اب کیا اچھا ہوگا

صنعت گریاں بہتیری کیں لیک دریغ ہزار دریغ
جس سے یار بھی ملتا ہم سے ایسا وہ نہ ہنر آیا

میر پریشاں خاطر آکر رات رہا بت خانے میں
راہ رہی کعبے کی اُودھر یہ سودائی کدھر آیا

اب یاں سے ہم اُٹھ جائیں گے خلقِ خدا ملکِ خدا
ہرگز نہ ایدھر آئیں گے خلقِ خدا ملکِ خدا

مطلب اگر یاں گم ہو اندیشے کی جاگہ نہیں
جا کر کہیں کچھ پائیں گے خلقِ خدا ملکِ خدا

دل میں نہ جانے یہ کوئی ہم کھانے کو دیں مرا نہیں
جو ہے مقدر کھائیں گے خلقِ خدا ملکِ خدا

گو لکھنؤ ویراں ہوا ہم اور آبادی میں جا
مقسوم اپنا لائیں گے خلقِ خدا ملکِ خدا

اس بستی سے اُٹھ جائیں گے درویشوں کی کیا مشورت
وہ بھی یہی فرمائیں گے خلقِ خدا ملکِ خدا

حسن والے ہیں کج روش سارے
ہوئے دو چار رُو بماہ تو کیا

دل رہے وصل جو مدام رہے
مل گئے اُس سے گاہ گاہ تو کیا

میر کیا ہے فقیرِ مستغنی
آوے اُس پاس بادشاہ تو کیا

تیری ہی رہ گزر میں یہ جی جا رہا ہے شوخ
سنیو کہ میر آج ہی کل میں گزر گیا

دل گیا مفت اور دُکھ پایا
ہو کے عاشق بہت میں پچھتایا

جب سے بے خود ہوا ہے اس کو دیکھ
آپ میں میر پھر نہیں آیا

اس بلا سے آہ میں غافل رہا
یک بیک دل کا لگانا ہو گیا

کنج لب سے یار کے چپانا تک
الغرض دل کا ٹھکانا ہو گیا

رفتہ رفتہ اُس پری کے عشق میں
میر سا دانا دوانا ہو گیا

چاہ میں جو رہیم یہ کم نہ ہوا
عاشقی کی تو کچھ ستم نہ ہوا

جدا اس سیم تن سے کیا ہے سونا
کہ مٹی کوڑے کا اب ہے بچھونا

وصیت میر نے مجھ کو یہی کی
کہ سب کچھ ہونا تو عاشق نہ ہونا

کون مل سکتا ہے اُس اوباش سے
اختلاط اُس سے نہیں اک ڈھب سے تھا

عشق کئے پچھتائے ہم تو دل نہ کسو سے لگانا تھا — جیدھر ہو وہ مہ نکلا اُس راہ نہ ہم کو جانا تھا
غیرت کی اُس کی شکایت بارے عبث اب کرتے ہیں — طور اُس شوخ ستم پیشہ کا طفلی سے بیگانا تھا
طُرفہ خیال کیا کرتا تھا عشق و جنوں میں روز و شب — روتے روتے ہنسنے لگا یہ میرؔ عجب دیوانا تھا

کیا کیا عشق میں رنج اٹھائے دل اپنا سب خون ہوا — کیسے رُکتے تھے خفگی سے آخر کار جنون ہوا

دیوانِ ششم

فلک نے پیس کر سُرمہ بنایا — نظر میں اُس کی میں تو بھی نہ آیا
تمامی عمر جس کی جستجو کی — اُسے پاس اپنے اک دم بھی نہ پایا
نہ تھی بیگانگی معلوم اُس کی — نہ سمجھے ہم اُسی سے دل لگایا

ہونے سے پر وہ ملتفت بھی ہوا — نہ کسی سے ہمیں حجاب رہا
نہ اٹھا لطف کچھ جوانی کا — کم بہت موسمِ شباب رہا
گھر سے آتے گلی میں سو بار اسے — یار بن دیر اضطراب رہا
نیک ہے میرؔ کی جناب سے یاں — ہم کو ان سمجھے اجتناب رہا

کیا جانوں عشق جان سے کیا چاہتا ہے میرؔ — خوں ریزی کا مجھے تو سزاوار کر دیا

موئے ہم جس کی خاطر بے وفا تھا — نہ جانا اُن نے تو یوں بھی کہ کیا تھا
نہ ملیو چاہنے والے سے اپنے — نہ جانا تجھ سے یہ کن نے کہا تھا
پریشاں کر گئی فریادِ بلبل — کسو سے دل ہمارا آ لگا تھا
ملے برسوں وہی بیگانگی تھی — ہمارے زعم میں وہ آشنا تھا
نہ دیوانے تھے ہم سے قیس و فرہاد — ہمارا طورِ عشق اُن سے جدا تھا
بدن میں صبح سے تھی سنسناہٹ — انہیں سناٹوں میں جی چلا تھا

صنم خانے سے اُٹھ کعبے گئے ہم　　کوئی آخر ہمارا بھی خدا تھا
چڑھی تیوری چمن میں میر آیا　　گلِ حسن آج شاید کچھ خفا تھا

رہتا نہیں تڑپنے سے ٹک ہاتھ کے تلے　　کیا جانوں میر دل کو مرے کیا بلا ہوا

کیا کہوں کیا طرح بدلی یار نے　　جا ؤ تھا دل میں سو اب غم ہو گیا

وہ دیکھنے ہمیں ٹک بیماری میں نہ آیا　　سو بار آنکھیں کھولیں بالیں سے سر اُٹھایا
گلشن کے طائروں نے کیا بے مروتی کی　　یک برگِ گل قفس میں ہم تک نہ کوئی لایا
عاشق جہاں ہوا ہے بے ڈھنگیاں ہی کی ہیں　　اس میر بے خرد نے کب ڈھب سے دل لگایا

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سُنیئے گا　　پڑھتے کسو کو سُنیئے گا تو دیر تلک سر دُھنیئے گا
سعی و تلاش بہت سی رہیگی اس انداز کے کہنے کی　　صحبت میں علما فضلا کی جا کر پڑھیئے گنیئے گا
دل کی تسلی جب کہ ہوگی گفت و شنود سے لوگوں کی　　آگ پھنکے گی غم کی بدن میں اس میں جلئے بھنیئے گا
گرم اشعار میر درونہ داغوں سے یہ بھر دیں گے　　زرد رُو شہر میں پھریئے گا گلیوں میں نے گل چُنیئے گا

تھا اندوہ گرہ میں مُدّت سے دل میں خوں ہو درد ہوا　　چاہ نے بدلے رنگ کئی اب جسم سراسر زرد ہوا
وعدہ خلافی اس ظالم کی کھا گئی میری جانِ غمیں　　گرمی کرے وہ مجھ سے جب تا تب تک میں ہی سرد ہوا

سائے میں تاک کے مجھے رکھا اسیر کر　　صیاد کے کرم سے قفس آشیاں ہوا
کہتے ہیں میر سے کہیں اوباش لڑ گئے　　ہنگامہ ان سے ایسا الٰہی کہاں ہوا

دشمن ہو جی کا گاہک ہونا ہے جس کو چاہا　　کی دوستی کہ یارو اک روگ میں بسایا
تازہ جھمک تھی شب کو تارو نہیں آسماں کے　　اس آسیا کو شاید پھر کر کسو نے راہا
آنکھیں مری الگو میں بے جا نہیں لگیں ہیں　　دیکھا ہے جن نے اُسکو اُس نے مجھے سراہا

بلبل کا شور سن کے نہ مجھ سے رہا گیا	میں بے دماغ باغ سے اٹھ کر چلا گیا
دل دیکھے جان میر نے پایان کار دی	یہ سادہ لوح طرح نئی دل لگا گیا

سر جو دے دست ملتے گھر میں پھرے	رنگ دیگر ہے در و دیوار کا
عشق کا مارا ہے کیا جیتے گا میر	حال ہے بد حال اس بیمار کا

اچھی ملاقات کب تک رہیگی	کبھو تو تہ دل سے بھی یار ہوگا
تجھے دیکھ کر لگ گیا دل نہ جانا	کہ اس سنگدل سے ہمیں پیار ہوگا
یہی ہوگا کیا ہوگا میر ہی نہ ہونگے	جو تو ہوگا بے یار غم خوار ہوگا

دیر بد عہد وہ جو یار آیا	دور سے دیکھتے ہی پیار آیا
بے قراری نے مار رکھا ہمیں	اب تو اس کے تئیں قرار آیا
گرد رہ اس کی اب اٹھو نہ اٹھو	میری آنکھوں ہی پر غبار آیا
اک خزاں میں نہ طیر بھی بولا	میں چمن میں بہت پکار آیا

زمانہ ہجر کا آسان کیا بسر آیا	ہزار مرتبہ منہ تک مرے جگر آیا
جوان مارے ہیں بے ڈھنگی ہی سے ان نے بہت	ستم کی مشق کی پر خون اسے نہ کر آیا

ہو کوئی اس بے وفا دلدار سے کیا آشنا	آشنا رہ بیٹھوں جو اک دم میں ہو نا آشنا
ملتے جلتے منہ چھپانا بھی لطیفہ ہے نیا	آشنائی یا نہ کرئیے ہو جیئے یا آشنا
تھا جنوں کا لطف مجنوں سے سو دنیا سے گیا	مغفرت ہو اس کو وحشی ہم سے بھی تھا آشنا
اب جو ہاتھ آئے ہیں ہم سے مفت کھو دیجو ہمیں	پھر نہ ہوگا تم کو ایسا کوئی پیدا آشنا
کیسا ہی پانی ہوا اس کو پیری میں جاتا ہے پھیر	تھا جوانی میں مگر تو میر دانا آشنا

گئے تھے سیر چمن کو اٹھ کر گلوں میں ٹک جی لگا نہ اپنا	تلاش جوش بہار میں کی بکار گلشن میں تھا نہ اپنا

ملا تو تھا وہ بخواہش دل منہ بھی پلتے لے سے لیکن
پھریں جو مستی میں اُسکی آنکھیں سو ہوش ہم کو رہا نہ اپنا

جہاں کا دریا ہے بےکراں تو سراب پایان کار نکلا
جو لوگ تہ سے کچھ آشنا تھے اُنہوں نے لب تر کیا نہ اپنا

نکالی سرکش نے چال ایسی کہ دیکھ حیرت سے رہ گئے ہم
دلوں میں کیا کیا ہما رہے آیا کریں سو کیا بس چلا نہ اپنا

کہے بھی کوئی تو اس سے جس میں سخن کسو کا اثر کرے کچھ
بکا کئے ہم ہمیشہ مانا کسو دن اُن نے کہا نہ اپنا

نہ ہوش ہم کو نہ صبر دل کو نہ شور سر میں نہ زور پا میں
جو رو دیں کس کس کو رو دیں باہم فغاں کیا کیا گیا نہ اپنا

جہاں میں رہنے کو جی بہت تھا نہ کر سکے میر کچھ توقف
بنا تھی ناپائدار اس کی اسی سے رہنا بنا نہ اپنا

دماغ اپنا تو اپنی فکر میں ہی ہو چکا یک سر
خیال اب کس کو ہے اے ہم نشیں نازک خیالی کا

ڈرو چونکو جو چھپاں اختلاطی تم سے ہو مجھ کو
تشتت کیا ہے میری دور کی اس دیکھا بھالی کا

دل جو ناگاہ بے قرار ہوا
اس سے کیا جانوں کیا قرار ہوا

مجھ سے لینے لگے ہیں عبرت لوگ
عاشقی میں یہ اعتبار ہوا

روز و شب روتے کڑھتے گزرے ہے
اب یہی اپنا روزگار ہوا

روؤں کیا اپنی سادگی پہ میر
میں نے جانا کہ مجھ سے یار ہوا

پیار کی دیکھی جو چتون کسو کی میں جاتا
کہ یہ اب سادہ دپرکار مرا یا نہ ہوا

کیونکہ سب عمر صعوبت میں کٹی تیری میر
اپنا جینا تو کوئی دن ہمیں دشوار ہوا

مرتے جیتے صبر کیا تھا ویسی ہی بے صبری کی
ہائے دریغ افسوس کوئی دن اور نہ یہ بیمار جیا

جو قافلے گئے تھے انہوں کی اٹھی بھی گرد
کیا جانیے غبار ہمارا کہاں رہا

اُسکے فریب لطف پہ مت جا کہ ہم نشیں
وہ دیر میرے حال پہ بھی مہرباں رہا

ترک شراب خانہ ہی پیری میں ورنہ میر
ترسا بچوں ہی سے ہمارا جب تک جواں رہا

سخن مشتاق ہے عالم ہمارا
بہت عالم کرے گا غم ہمارا

پڑھیں گے شعر رو رو لوگ بیٹھے — رہے گا دیر تک ماتم ہمارا

متفرقات

یک پارہ جیب کا بھی بجا میں نہیں سیا — وحشت میں جو سیا سو کہیں کا کہیں سیا

اٹھوں نہ خاک سے کشتہ میں کم نگاہی کا — دماغ کس کو ہے محشر کی داد خواہی کا

دل گیا رسوا ہوئے آخر کو سودا ہو گیا — اس دو روزہ زیست میں ہم پر بھی کیا کیا ہو گیا

کیا کہوں میں میر اپنی سرگزشت — ابتدا ہی قصے میں وہ سو گیا

دل تاب ٹک بھی لاتا تو کہنے میں کچھ آتا — اس تشنہ کام نے تو پانی بھی پھر نہ مانگا

شب ہی عالم میں ہو گئی تھی — اپنے دل کا غبار دیکھا
اب وعدہ نہ کر زیادہ بس ہم — جاناں ترا اعتبار دیکھا
کہتے تھے یہ ہم نہ کر تمنا — اے جان امیدوار دیکھا

تم کو تو ہے کیا مرے ملے سے — پر اس میں بتاں بھلا ہے میرا

ایسا ہی نہ تھا بتوں میں آگے — آخر کوئی میرا بھی خدا تھا

ردیف بائے موحّدہ

دیوانِ اوّل

مایوسِ وصل اُس کے کیا سادہ مُردماں ہیں ——— گزُرے ہے میر اُن کو اُمید وار ہر شب

اب رسم ربط اُٹھو ہی گئی ورنہ پیش ازیں ——— بیٹھے ہی رہتے تھے ہم احباب روز و شب

یہ اتّصال اشک جگر سوز کا کہاں ——— روتی ہے یوں تو شمع بھی کم کم تمام شب
گزرا کسے جہاں میں خوشی سے تمام روز ——— کس کی کٹی زمانے میں بے غم تمام شب

کس کی مسجد کیسے بُت خانے کہاں کے شیخ و شاب ——— ایک گردش میں تری چشم سیہ کے سب خراب
وائے اس جینے پر اے مستی کہ دورِ چرخ میں ——— جام مے پر گردش آوے اور مے خانہ خراب

میر شاعر بھی زور تھا کوئی ——— دیکھتے ہو نہ بات کا اسلوب

دیوانِ دوم

پیش از دمِ سحر مرا رونا لہو کا دیکھ ——— پھُولے ہے جیسے سانجھ وہی یاں سماں ہے اب
برسوں ہوئے گئے اُسے پر بھُولتا نہیں ——— یادش بخیر میر رہے خوش جہاں ہے اب

جیتا مزاج آگے تھا میرا سو کب ہے اب ——— ہر روز دل کو سوز ہے ہر شب تعب ہے اب
دُوری سے اُسکی آہ عجب حال میں ہیں لوگ ——— کچھ بھی جو پاس وہ نہ کرے تو عجب ہے اب

نے چاہ وہ اُسے ہے نہ مجھ کو ہے وہ دماغ — جانا مرا اُدھر کو بشرطِ طلب ہے اب
جاتا ہوں دن کو ملنے تو کہتا ہے دن کو میرؔ — جو شب کو جائیے تو کہے ہے کہ شب ہے اب

ناسازیٔ طبیعت ایسی پھر اُس کے اُوپر — ہے ہر کسو سے مجھ کو ناچار ساز واجب
صرفہ نہیں ہے سارق جانِ عزیز کا بھی — اے میرؔ تجھ سے ظالم ہے احتراز واجب

یہ بستیاں اُجڑ کے کہیں بستیاں بھی ہیں — دل ہو گیا خراب جہاں پھر رہا خراب

جو کہو تم سو ہے بجا صاحب — ہم بُرے ہی سہی بھلا صاحب
سادہ ذہنی میں نکتہ چیں تھے ہم — اب تو ہیں حرف آشنا صاحب
نہ دیا رحم ٹک بتوں کے تئیں — کیا کیا ہائے یہ خدا صاحب
بندگی ایک اپنی کیا کم ہے — اور کچھ تم سے کہیے کیا صاحب
مہر افزا ہے منہ تمہارا ہی — کچھ غضب تو نہیں ہوا صاحب
پھر گئیں آنکھیں تم نہ آن پھرے — دیکھا تم کو بھی واہ وا صاحب
کس نے سن شعر میرؔ یہ نہ کہا — کہیو پھر ہائے کیا کہا صاحب

عجب صحبت ہے کیوں کر صبح اپنی شام کریے اب — جہاں تک آن بیٹھے ہم کہا آرام کریے اب
بلا آشوب تھا گو جان پر آغازِ اُلفت میں — ہوا سو تو ہوا اندیشۂ انجام کریے اب
بہت کی یاں صنم گوئی ہوئے مشہور کافر ہم — وظیفہ کوئی دن اپنا خدا کا نام کریے اب

نکلی ہیں اب کی کلیاں اس رنگ سے چمن میں — سر جوڑ جوڑ جیسے مل بیٹھتے ہیں احباب

دیوانِ سوم

ماہِ صیام آیا ہے قصدِ اعتکاف اب — جا بیٹھیں میکدے میں مسجد سے اُٹھ کے صاف اب

مشکل ہیں اب رفتہ رو کے کافر ہیں خستہ مو کے   یہ پیچ سے اٹھے گا کس طور اختلاف اب

کل کچھ صبا ہوئی تھی گل افشاں قفس میں بھی   وہ بے کلی تو جان کو بارے نہیں ہے اب
مسکن جہاں تھا دل زدہ مسکیں کا ہم تو واں   کل دیر میر میر پکارے نہیں ہے اب

بولا جو مو بہ ریش ان آ نکلے میر صاحب   آنا ہوا کہاں سے کہیے فقیر صاحب
ہر لحظہ اک شرارت ہر دم ہے یک اشارت   اس عمر میں قیامت تم ہو شریر صاحب

کب ہیں جوانی کے سے اشعار شور آور   شاید کہ کچھ ہوئے ہیں اب پیر میر صاحب
تم کس خیال میں ہو تصویر سے جو چپ ہو   کرتے ہیں لوگ کیا کیا تقریر میر صاحب

جنوں میں اب کی نے دامن ہے نے جیب   کمی آئی بہت اسباب میں اب

دیوانِ چہارم

یہ عرض مری یاد رہے بندگی میں میر   جی بچتے نہیں عشق کے اظہار میں صاحب

کیا ہمیں ہم تو ہو چلے ٹھنڈے   گرم گو یار کی خبر ہے اب
غزلتی میر جوں صبا اس بن   خاک بہ سر ہے دربدر ہے اب

میر شاید کعبے ہی میں رہ پڑے   دیر سے تو یاں خدا لایا ہے اب

جن دنوں ہم کافروں سے ربط تھا سو ہو چکے   وہ محبت بے مہر اپنی اور سے پتھر ہے اب
وہ طبیعت ہی نہیں ہے میری اے مشفق طبیب   کر دوا جو بیچ میں آوے تمہے بہتر ہے اب

خلافِ وعدہ بہت ہوئے ہو کوئی تو وعدہ وفا کرو اب
ملا کے آنکھیں دروغ کہنا کہاں تلک کچھ حیا کرو اب

خیال رکھیئے نہ سرکشی کا سُنو ہو صاحب کہ پیری آئی
خمیدہ قامت بہت ہوا ہے جُھکائے ہی سر رہا کرو اب

کہاں ہے طاقت جو میرؔ کا دل سبک بلاؤں کی تاب لاوے
کرشمے غمزے کو ناز سے ٹک ہماری خاطر جُدا کرو اب

دیوانِ پنجم

کب سے صحبت بگڑی سی ہے کیوں کر کوئی بنا دے اب
ناز و نیاز کا جھگڑا ایسا کس کے کہنے لے جاوے اب

دم دو دم گھبراہٹ ہو تو ہو سکتا ہے تدارک بھی
جی کی چال سے پیدا ہے سو تین گھڑی میں جاوے اب

---

۸ دل خوں ہوا تھا ایک سر پانی ہوا جگر سب — خوں بستہ رہتیاں تھیں پلکیں سو اب ہیں تر سب
یا رب کدھر گئے وے جو آدمی روش تھے — اُوجڑ دکھائی دے ہیں شہر دہ دیگر سب
میرؔ اس خرابے میں کیا آباد ہووے کوئی — دیوار و در گرے ہیں ویراں پڑے ہیں گھر سب

تابِ عشق نہیں ہے دل کو جی بھی بے طاقت سا ہے اب
یعنی سفر ہے دُور کا آگے اور اپنی رُخصت ہے اب

وصل میں کیا کیا صحبتیں رنگیں کس کس عیش میں دن گزرے
تنہا بیٹھے رہے ہیں یک سُو ہجر میں یہ صحبت ہے اب

چور اُچکّے سکھ مرہٹے شاہ و گدا زرخواہاں ہیں
چین میں ہیں جو کچھ نہیں رکھتے فقر ہی اک دولت ہے اب

سادے جتنے نظر آتے ہیں دیکھو تو عیار ہیں سب
زرد و زار و نزار ہیں جو ہم ہیں چاہت کے بیمار ہیں سب
سیل سے ملکے عاشق ہو دیں تو جوش و خروش بھری آویں
تہ پائی نہیں جاتی ان کی دریا سے تہ دار ہیں سب
ایک پریشاں طرفہ جماعت دیکھی چاہنے والوں کی
جینے کے خواہاں نہیں ہیں مرنے کو تیار ہیں سب
کیا کیا خواہشیں بے کس بے بس مشتاق اُس کے کھتے تھے
لیکن دیکھ کے رہ جاتے ہیں چُپکے سے ناچار ہیں سب
عشق جنہوں کا پیشہ ہووے سینکڑوں ہوں تو ایک ہی ہیں
کوہکن و مجنوں و وامق میر ہمارے یار ہیں سب

موسم گل کا شاید آیا داغ جنوں کے سیاہ ہوئے
دل کھنچتا ہے جانب صحرا جی نہیں لگتا گھر میں اب
ایک جگہ پر جیسے بھنور ہیں لیکن چکر رہتا ہے
یعنی وطن دریا ہے اس میں چار طرف ہیں سفر میں اب

باہم ہوئی ہے ترک ملاقات کیا سبب
اب کم بہت ہے ہم پہ عنایات کیا سبب
ہم تو تمہارے حسن کی حیرت سے ہیں خموش
تم ہم سے کوئی کرتے نہیں بات کیا سبب

دل کے گئے بے کس کہلائے ایسا کہاں ہمدم ہے اب
کون ایسے محروم و غمیں کا ہم راز و محرم ہے اب
سینہ زنی سے غم زدگی ہے سر دُھننا ہے رونا ہے
دل جو ہمارا خون ہوا ہے اس سے بلا ماتم ہے اب
سُن کے حال کسو کے دل کا رونا ہی مجھکو آتا تھا
یعنی کبھو جو کڑھتا تھا میں وہ رونا ہر دم ہے اب

زردیٔ چہرہ تن کی نزاری بیماری پر چاہت ہے
دل میں غم ہے مژگاں نم ہیں حال بہت درہم ہے اب

دیکھیں دن کٹتے ہیں کیونکر راتیں کیونکہ گزرتی ہیں
بے تابی ہے زیادہ زیادہ صبر بہت کم کم ہے اب

عشق ہمارا آہ نہ پوچھو کیا کیا رنگ بدلتا ہے
خون ہوا دل داغ ہوا پھر درد ہوا پھر غم ہے اب

ملنے والو پھر ملیئے گا ہے وہ عالم دیگر میں
میرؔ فقیر کو سُکر ہے یعنی مستی کا عالم ہے اب

دیوان ششم

ٹک ٹھہرتا بھی تو کہتے تھا کسو بجلی کی تاب — یا کہ نکہت گل کی تھا آیا گیا عہد شباب

آج کل سے مجھ کو بے تابی و بدحالی ہے کیا — مجھ مریض عشق کے کب سے نہ تھے آثار خوب

ردیف تا

دیوان اوّل

روزانہ ملوں یار سے یا شب ہو ملاقات — کیا فکر کروں میں کہ کسو ڈھب ہو ملاقات
نے بخت کی یاری ہے نہ کچھ جذب ہے کامل — وہ آپ ہی ملے تو ملے پھر جب ہو ملاقات
دوری میں کروں نالہ و فریاد کہاں تک — اک بار تو اس شوخ سے یارب ہو ملاقات
جاتی ہے غشی بھی کبھو آتے ہیں بخود بھی — کچھ لطف اٹھے بارے اگر اب ہو ملاقات
وحشت ہے بہت میرؔ کو مل آیئے چل کر — کیا جانیے پھر یاں سے گئے کب ہو ملاقات

سب ہوئے نادم پئے تدبیر جاناں سمیت
تیر تو نکلا مرے سینے سے لیکن جاں سمیت

اُٹھ گیا پردہ نصیحت گر کے لگ پڑنے سے میرؔ
پھاڑ ڈالا میں گریباں رات کو داماں سمیت

پلکوں پہ تھے پارۂ جگر رات
ہم آنکھوں میں لے گئے بسر رات

اک دن تو وفا بھی کرتے وعدہ
گزری ہے اُمیدوار ہر رات

مکھڑے سے اُٹھائیں اُن نے زلفیں
جانا بھی نہ ہم گئی کدھر رات

تُو پاس نہیں ہوا تو روتے
رہ رہ گئی ہے پہر پہر رات

کیا دن تھے کہ خون تھا جگر میں
رو اُٹھتے تھے بیٹھ دوپہر رات

واں تم تو بناتے ہی رہے زُلف
عاشق کی بھی یاں گئی گزُر رات

ساقی کے جو آنے کی خبر تھی
گزری ہمیں ساری بے خبر رات

کُھلتی ہے جب آنکھ شب کو تجھ بن
کٹتی نہیں آتی پھر نظر رات

دن وصل کا یوں کٹا کہے تُو
کاٹی ہے جُدائی کی مگر رات

کل تھی شبِ وصل اک ادا پر
اُس کے گئے ہوتے ہم تو مر رات

جاگے تھے ہمارے بختِ خفتہ
پہنچا تھا بہم وہ اپنے گھر رات

تھی صبح جو مُنہ کو کھول دیتا
ہر چند کہ تب تھی اک پہر رات

پر زُلفوں میں مُنہ چھُپا کے بولا
اب ہووے گی میرؔ کس قدر رات

جی میں ہے یادِ رُخ و زلفِ سیہ فام بہت
رونا آتا ہے مجھے ہر سحر و شام بہت

دستِ صیاد تلک بھی نہ میں پہنچا جیتا
بے قراری نے لیا مجھ کو تہِ دام بہت

ایک دو چشمک اِدھر گردشِ ساغر کہ مدام
سر چڑھی رہتی ہے یہ گردشِ ایام بہت

دل خراشی و جگر چاکی و خوں افشانی
ہوں تو ناکام پہ رہتے ہیں مجھے کام بہت

پھر نہ آئے جو ہوئے خاک میں جا آسودہ
غالباً زیرِ زمیں میرؔ ہے آرام بہت

کیا کہیں اپنی اُس کی شب کی بات
کہیئے ہووے جو کچھ بھی ڈھب کی بات

اب تو چُپ لگ گئی ہے حیرت سے
پھر کھُلے گی زبان جب کی بات

نکتہ دانانِ رفتہ کی نہ کہو — بات وہ ہے جو ہووے اب کی بات
کس کا روئے سخن نہیں ہے اُدھر — ہے نظر میں ہمارے سب کی بات
ظلم ہے قہر ہے قیامت ہے — غصّے میں اُس کے زیرِ لب کی بات
کہتے ہیں آگے تھا بتوں میں رحم — ہے خُدا جانیئے یہ کب کی بات
گو کہ آتش زباں تھے آگے میرؔ — اب کی کہیئے گئی وہ تب کی بات

کیا کیا لکھا ہے میں نے وہ میرؔ کیا کہے گا — گم ہووے نامہ برسے یا رب مری کتابت

دیوانِ دوم

دیر کُجھ کھنچی تو کہتے بھی ملاقات کی بات — ملنا اپنا جو ہوا اُس سے سو وہ بات کی بات
گفتگو شاہدوں سے ہے نہ غیبت نہ گِلہ — خانقہ کی سی نہیں بات خرابات کی بات
مُنہ اِدھر اور سُخن زیرِ لبی غیر کے ساتھ — اس فریبندہ کی ناگفتنی ہے گھات کی بات
یہ کہیں آشفتہ کی جمعیّتِ دل تھی منظور — بال بکھرے ترے مُنہ پر کہیں ہیں رات کی بات

ہم تم سے چشم رکھتے تھے دل داریاں بہت — سو التفات کم ہے دل آزاریاں بہت
دیکھیں تو کیا دکھائے یہ افراطِ اشتیاق — نکلی ہیں تیری آنکھیں ہمیں پیاریاں بہت
آزار میں تو عشق کے جاتا ہے بھُول جی — یوں تو ہوئیں تھیں یاد ہمیں بیماریاں بہت
شکوہ خراب ہونے کا کیا چاہئے میں میرؔ — ایسی تو اے عزیز ہیں یاں خواریاں بہت

کیا کہوں پھر کیسے کیسے دن دکھاتا سا اُہا — وہ سُخن نشنو جو ٹک میرا کہا کرتا تھا رات
دیکھ خالی جا کہیں گے برسوں اہلِ روزگار — میرؔ اُن دنوں کا قصہ یاں کہا کرتا تھا رات

کیا پوچھتے ہو آہ مرے جنگ جو کی بات — گویا وفا ہے عہد میں اُسکے کبھو کی بات
اس باغ میں نہ آئی نظر خُرمی مری — گر سبز بھی ہوا ہوں تو جیسے کسو کی بات

آئینہ پانی پانی رہا اُس کے سامنے — کہیے جہاں کہوں یہ تو ہے روبرو کی بات

یوں بارِ گل سے اب کی جھکے ہیں نہالِ باغ — جھک جھک کے جیسے کرتے ہیں دو چار یار بات
یوں چپکے چپکے میر تلف ہو گا کب تلک — کچھ ہووے بھڑ کر اُس سے کبھی کر ایک بار بات

ہوتی ہے گرچہ کہنے سے یارو پرائی بات — پر ہم سے تو تھمی نہ کبھو منہ پر آئی بات
اب مجھ ضعیف و زار کو مت کچھ کہا کرو — جاتی نہیں ہے مجھ سے کسو کی اٹھائی بات
خط لکھتے لکھتے میر نے دفتر کیے رواں — افراطِ اشتیاق سے آخر بڑھائی بات

سخت کرچی کیونکہ یک بادی کریں ہم ترکِ شہر — ان گلی کوچوں میں ہم نے کھائے ہیں پتھر بہت
کیا سبب ہے اب مکاں پر جو کوئی پاتا نہیں — میر صاحب آ گئے تو رہتے تھے اپنے گھر بہت

دیوانِ سوم

میرِ گم گشتہ کا ملنا اتفاقی امر ہے — جب کبھو پایا ہے خواہش مند پایا ہے بہت

عجب نہیں ہے نہ جانے جو میر چاہ کی ریت — سنا نہیں ہے مگر یہ کہ جوگی کس کے میت
مت ان نمازیوں کو خانہ سازِ دیں جانو — کہ ایک اینٹ کی خاطر یہ ڈھاتے ہیں گے مسیت
ملے تھے میر سے ہم کل کنارِ دریا پر — فتیلہ مو وہ جگر سوختہ ہے جیسے اتیت

ہے شام سے جہاں میں پہر تا صبح ایک شور — اپنی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتی یاں کی بات

منہ لگانا تو در کنار اُن نے — نہ کہا ہے یہ آشنا صورت
حلقے آنکھوں میں پڑ گئے منہ زرد — ہو گئی میر تیری کیا صورت

زخم جھیلے داغ بھی کھائے بہت — دل لگا کر ہم تو پچھتائے بہت
جب نہ تب جاگہ سے تم جایا کیے — ہم تو اپنی اور سے آئے بہت
گر بُکا اس شور سے شب کو ہے تو — روویں گے سونے کو ہمسائے بہت
میر سے پوچھا جو میں عاشق ہو تم — ہو کے کچھ چپکے سے شرمائے بہت

کوشش اپنی تھی عبث پر کی بہت — کیا کریں ہم چاہتا تھا جی بہت
آج در ہم کرتے تھے کچھ گفتگو — میر نے شاید کہ دارو پی بہت

دیوان چہارم

جب سے آنکھیں لگی ہیں ہماری نیند نہیں آتی ہے رات
تکتے راہ رہے ہیں دن کو آنکھوں میں جاتی ہے رات
سخت ہیں کیا ایامِ جُدائی دشواری سے کٹتے ہیں
دن دیواروں سے سر ماروں ہوں پتھر سی چھاتی ہے رات
جوں توں ہجر کے غم میں اُس کے شام و سحر ہم کرتے ہیں
ورنہ کسے دن خوش آتا ہے کس کے تئیں بھاتی ہے رات
روز و شب کی اپنی معیشت نقل کریں کیا تم سے میر
دن کو قیامت جی پہ رہے ہے سر پہ بلا لاتی ہے رات

دل گئے پر آجکل سے چُپ نہیں مجھ کو لگی — گزری اس بھی بات کو لے ہم نفس مدت بہت
دل میں جا کرتا ہے طورِ میر شاید دوستاں — اُن نے صاحبِ دل کسو سے رکھی ہے صحبت بہت

چشم رہنے لگی پُر آب بہت — شاید آوے گا خونِ ناب بہت
دیر و کعبے میں اُس کے خواہش مند — ہوتے پھرتے ہیں ہم خراب بہت

دل نے کام کئے ہیں ضائع دل بر ہے دل خواہ بہت
قدر بہت ہی کم ہے دل کی پھر دل میں ہے چاہ بہت

حیرانی ہے کیونکر ہووے نسبت اپنی اُس سے دُرست
بندہ تو ہے عاجز عاجز اُس کو غرور اللہ بہت

سب کہتے ہیں رُدئے توجہ ایدھر کرنے کہتا تھا
شاید یوں بھی ظاہر ہووے ہر تو یہی افواہ بہت

اب تو ہے پیری حضرت ہو کر ایک کنارے بیٹھے ہیں
جب تھی جوانی تب تو ہم بھی جاتے تھے درگاہ بہت

کیا گزری ہے جی پہ تمہارے ہم سے تو کچھ میر کہو
آنے لگی ہے دردِ و الم سے صاحب لب پر آہ بہت

اب تو وفا و مہر کا مذکور ہی نہیں | تم کس سمیں کی کہتے ہو یہ ہے کہاں کی بات
شب باش اُن نے کہتے ہیں آنے کہا ہے میر | دن اچھے ہوں تو یہ بھی ہو اُس مہرباں کی بات

دیوانِ پنجم

دل کی تہ کی کہی نہیں جاتی نازک ہیں اسرار بہت
انچھر ہیں تو عشق کے دو ہی لیکن ہے بستار بہت

کافر مسلم دونوں ہوئے پر نسبت اُس سے کچھ نہ ہوئی
بہت لئے تسبیح پھرے ہم پہنا ہے زنار بہت

ہجر نے جی ہی مارا ہمارا کیا کہئیے کیا مشکل ہے
اُس سے جُدا رہنا ہوتا ہے جس سے ہمیں ہی پیار بہت

مُنہ کی زردی تن کی نزاری چشم تر پر چھائی ہے
عشق میں اُس کے یعنی ہم نے کھینچے ہیں آزار بہت

رات سے شہرت اس بستی میں میر کے اُٹھ جانیکی ہے | جنگل میں جو جلد بسا جا شاید تھا بیمار بہت

کس کو دماغ جواب رہا ضعف سے اب خاموش رہے
پہروں بکنا نصیحت گر سے میر یہ ہے طاقت کی بات

دیوانِ ششم

چشمک گل کا لطف بھی نہ اٹھا　　کم رہا موسمِ شباب بہت
ڈھونڈتے اسکو کوچے کوچے پھرے　　دل نے ہم کو کیا خراب بہت
دیر تک کعبے میں تھے شب بیہوش　　پی گئے میر جی شراب بہت

کیا کہیں ہے حالِ دل درہم بہت　　کڑھتے ہیں دن رات اس پر ہم بہت
رہتا ہے ہجراں میں غم غصے سے کام　　اور وے بھی سن کے ہیں برہم بہت
میر کی بدحالی شب مذکور تھی　　کڑھ گئے یہ حال سن کر ہم بہت

خشکی لب کی زردی رخ کی نمناکی دو آنکھوں کی　　جو دیکھے ہے کہے ہے ان نے کھینچا ہے آزار بہت
جی کے لگاؤ کئے سے ہم نے جی ہی جاتے دیکھے ہیں　　اس پہ نہ جانا آہ برا ہے الفت کا آزار بہت
میر دعا کر حق میں میرے تو بھی فقیر ہے مدت سے　　اب جو کبھو دیکھوں اس کو تو مجھ کو نہ آوے پیار بہت

متفرقات

غیروں کے رہو گے دیر تک تم　　ہم کو تو سویرے کریئے رخصت
کیا تم سے کہیں سلوکِ ہجراں　　دل میں نہ رکھی ہمارے حسرت

ہمیں عشق میں میر چپ لگ گئی ہے　　نہ شکر و شکایت نہ حرف و حکایت

ردیف جیم

دیوانِ چہارم

حال بُرا ہے تم کو ہم سے اتنی غفلت کیا ہے آج ۔ کوئی گھڑی تو پاس رہو یاں پھر دن فرصت کیا ہے آج
میرؔ کھڑے اک ساعت ہی میں غش تم کرنے لگتے ہو ۔ تاب نہیں کیا ضعف ہے دل میں جی بے طاقت کیا ہے آج

جینے سے ہم غم کشتوں کے خاطر تم بھی جمع کرو ۔ کل تک کام نہیں کھنچنے کا غش آتا ہے اکثر آج
عشق کیا ہو ہم نے کہیں تو عشق ہمارا جی مارے ۔ یوں نہیں نکو رُو دلبر اپنا ہم سے ہوا ہے بدتر آج
رحم کی جا گہ کی ہے پیدا شاید اُسکے دل میں بھی ۔ دیکھ رہا ہے مُنہ کو ہمارے حال ہمارا سُن کر آج

کرتی ہے بُو زلفِ معنبر آئے ہوئے ہو بے خود سے کچھ
یارے مزاج شریف تمہارا میرؔ گیا کیدھر ہے آج

دیوانِ پنجم

کل ہی زیاں جیوں کے کئے ہیں عشق میں کیا کیا لوگوں نے
سادگی میری چاہ میں دیکھو میں ڈھونڈوں ہوں دارا آج
میرؔ ہوئے بے خود کب کے آپ میں بھی تو ٹک آؤ
ہے دروازے پر انبوہ اک رفتۂ شوق تمہارا آج

اُس کا بحرِ حُسن سراسر اوج و موج و تلاطم ہے
شوق کی اپنے نگاہ جہاں تک جاوے بوس و کنار ہے آج

گھر آئے ہو فقیر دل کے تو آؤ بیٹھو لطف کرو
کیا ہے جان بن اپنے کنے سوان قدموں پہ نثار ہے آج

کیا پوچھو ہو سانجھ تلک پہلو میں کیا کیا تڑپا ہے
کل کی نسبت دل کو ہمارے بارے کچھ تو قرار ہے آج

سر اپنا عشق میں ہم نے بھی یوں تو پھوڑا تھا — پہ اس کو کیا کریں اوروں کا اعتبار ہے آج
سحر سواد میں چل زرد پھولی ہے سرسوں — ہوا ہے عشق سے گل زرد کیا بہار ہے آج
کسو کے آنے سے کیا اب کہ غش ہے کل دن سے — ہمیں تو اپنا ہی اے میرؔ انتظار ہے آج

ردیف جیم فارسی

دیوانِ اوّل

عاشقی و بے کسی و رفتگی — جی رہا کب ایسے آزاروں کے بیچ
یارو مت اُس کا فریب مہر کھاؤ — میرؔ بھی تھے اُس کے ہی یاروں کے بیچ

کر نہ تاخیر تو اک شب کی ملاقات کے بیچ — دن نہ پھر جائیں گے عشاق کے اک رات کے بیچ
حرف زن مت ہو کسی سے تو کہ اے آفتِ شہر — جاتے رہتے ہیں ہزاروں کے سر اک بات کے بیچ
زندگی کس کے بھروسے پہ محبت میں کروں — اک دلِ غم زدہ ہے سو بھی ہے آفات کے بیچ

دیوانِ دوم

فرہاد و قیس و میر یہ آوارگانِ عشق — ایسے گئے ہیں سب کی رہی من کی من کے بیچ

جھوٹ ہر چند نہیں یار کی گفتار کے بیچ — دیر لیکن ہے قیامت ابھی دیدار کے بیچ

کس کی خوبی کے طلب گار ہیں عزت طلباں   خستے بکنے کو چلے آتے ہیں بازار کے بیچ

دیوانِ چہارم

آگے تو رسم دوستی کی تھی جہاں کے بیچ   اب کیسے لوگ آنے زمیں آسماں کے بیچ
میں بے دماغِ عشق اٹھا سو چلا گیا   بلبل پکارتی ہی رہی گلستاں کے بیچ

دیوانِ پنجم

آج ہمیں بدحالی سی ہے حال نہیں ہے جان کے بیچ   کیا عاشق ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے جہان کے بیچ
وعدے کرو ہو برسوں کے تم دم کا بھروسا ہم کو نہیں   کچھ کچھ ہو جاتا ہے یاں اک پل میں اک اک آن کے بیچ

فصلِ گل میں اسیر ہوئے تھے من ہی کی رہی من کے بیچ   اب یہ ستم تازہ ہے ہم پر قید کیا ہے چمن کے بیچ

دیوانِ ششم

لطف جیسے ہیں اسکی چاہ کے بیچ   رنج ویسے ہی ہیں نباہ کے بیچ

وامق و فرہاد و مجنوں کون ہے یاروں کے بیچ   جو کہوں میں کوئی ہے میرے بھی غمخواروں کے بیچ
رونا کڑھنا عشق میں دیکھا مرا جن نے کہا   کیا جئے گا یہ ستم دیدہ ان آزاروں کے بیچ
منتظر برسوں رہے افسوس آخر مر گئے   دیدنی تھے لوگ اس ظالم کے بیماروں کے بیچ

ردیف حائے حطی

دیوانِ اوّل

لوہو میں شور بور ہے دامان و جیب میرؔ   بپھرا ہے آج دیدۂ خوں بار کس طرح

میں اور قیس و کوہ کن اب جو زباں پہ ہیں — مارے گئے ہیں سب یہ گنہ گار اک طرح
سب طرح میں اسکی اپنی نظر میں تھیں کیا کہیں — پر ہم بھی ہو گئے ہیں گرفتار اک طرح

دیوان دوم

یوں بھی سر چڑھتا ہے اے ناصح کوئی مجھ سے کہ ہائے — ایسے دیوانے کو سمجھاتے ہیں سمجھانے کی طرح
جان کا صرفہ نہیں ہے کچھ تجھے کڑھنے میں میر — غم کوئی کھاتا ہے میری جان غم کھانے کی طرح

دیوان پنجم

وہ نو بادۂ گلشن خوبی سب سے رکھے ہے نرالی طرح
شاخ گل سا جائے ہے لہکا اُن نے نئی یہ ڈالی طرح
مونڈھے چلے ہیں چولی چسپی ہے پھر پھنسی ہے بند کسے
اُس اوباش نے پہناوے کی ایسی نرالی نکالی طرح

ردیف دال

دیوان اوّل

نہ پڑھا خط کو یا پڑھا قاصد — آخر کار کیا کہا قاصد
اب غرض خامشی ہی بہتر ہے — کیا کہوں تجھ سے ماجرا قاصد

ایذا ہے میر بہ جو وہ تو کہوں ہی گا میں — باڑے یہ کہہ کہ تیری خاطر میں کیا ہے شاہد

اے گل نو دمیدہ کے مانند — ہے تو کس آفریدہ کے مانند
ہم امید وفا پہ تیری ہوئے — غنچۂ دیر چیدہ کے مانند

میر صاحب بھی اُسکے ہاں تھے لیک　　بندۂ زرخریدہ کے مانند

قفس تو یاں سے گئے پر مُدام ہے صیّاد　　چمن کی صبح کوئی دم کو شام ہے صیّاد
بہت ہیں ہاتھ ہی تیرے نکر قفس کی فکر　　مرا تو کام انہیں میں تمام ہے صیّاد
چمن میں پر نہیں ایسا پھنسا کر یں چھوڑوں　　مجھے تو ہر رگِ گُل تارِ دام ہے صیّاد
یہی گلوں کو تنک دیکھوں اتنی مہلت ہو　　چمن میں اور تو کیا مجھ کو کام ہے صیّاد
ابھی کہ وحشی ہو اس کشمکش کے بیچ ہے میر　　خدا ہی اُس کا ہے جو تیرا دام ہے صیّاد

بھولا جاتا ہے غمِ بتاں میں جی　　غرض آتا ہے پھر خدا ہی یاد
ہر طرف ہیں اسیر ہم آواز　　باغ ہے گھر ترا تو اے صیّاد

دیوانِ دوم

کیا صحبتیں اگلی گئیں خاطر سے ہماری　　اپنی بھی وفا یاد ہے اُس کی بھی جفا یاد
کعبے تو گئے بھول کے ہم دیر کا رستہ　　آتا تھا ولے راہ میں ہر گام خدا یاد
اک لُطف کے شرمندہ نہیں میر ہم اُس سے　　گو یاں سے گئے اُن نے بہت ہمکو کیا یاد

رہے گی ایسی ہی گر بے کلی ہمیں اس سال　　تُو دیکھیو کہ رہے ہم قفس میں مر صیّاد
چمن کی یاد کے آتے خبر نہ اتنی رہی　　کہ میں کدھر ہوں کدھر ہے قفس کدھر صیّاد
شکستہ بالی کو چاہے تو ہم سے ضامن لے　　شکارِ موسمِ گُل میں ہمیں نہ کر صیّاد
ہوا نہ وا درِ گلزار اپنے ڈھب سے کبھو　　کُھلا سو مُنہ پہ ہمارے قفس کا در صیّاد
سُنا ہے بھڑکی ہے ابکی بہت ہی آتشِ گُل　　چمن میں اپنے بھی ہیں خار و خس کے گھر صیّاد
لگی بہت رہیں چاکِ قفس سے آنکھیں لیک　　پڑا نہ اب کی کوئی پھول گُل نظر صیّاد

لوہو آنکھوں میں اب نہیں آتا　　زخم اب دل کے بھر گئے شاید

بے کلی بھی قفس میں ہے دشوار — کام سے بال و پر گئے شاید
شور بازار سے نہیں اٹھتا — رات کو میر گھر گئے شاید

لگا آگ پانی کو دوڑے ہے تو — یہ گرمی تری اس شرارت کے بعد
کہے کو ہمارے کب اُن نے سُنا — کوئی بات مانی سو منت کے بعد
سخن کی نہ تکلیف ہم سے کرو — لہو ٹپکے ہے اب شکایت کے بعد
نظر میر نے کیسی حسرت سے کی — بہت روئے ہم اُس کی رخصت کے بعد

دیوان سوم

ہمیں اسیر تو ہونا ہے اپنا اچھا یاد — کشش نہ دام کی دیکھی نہ کوشش صیاد
چمن میں یار ہمیں لے گئے تھے وا نہ ہوئے — ہمارے ساتھ ہی غم ہی دلِ ناشاد

دفترِ اعمال میرا کھول جا دیں میر کاش — ہے قیامت اس جریدے کو جو دیکھیں فرد فرد

گزرتی ہے کیا میر دل پر ترے — تو ہوتا ہے ہر لحظہ کچھ زرد زرد

دیوان پنجم

اُس سے نہ اُلفت ہو مجھکو تو ہووے میرا چہرہ زرد
ہاتھ نہ رکھوں کیوں میں دل پر رنج و بلا ہے قیامت درد
برسوں میں اقلیم جنوں سے دو دیوانے نکلے تھے
میر آوارۂ شہر ہوا ہے قیس ہوا ہے بیاباں گرد

یہ عشق ہے یقینی حال ایسا کم سنا ہے — اے میر دل کسو سے تیرا لگا ہے شاید

کیا جانے میت کس کے غم سے ہو جیب و گریبان
حرف و سخن میں کیا ہی ہے یہ جواں زباں زد

کچھ ہوش نہ تھا منبر و محراب کا ہم کو
صد شکر کہ مسجد میں ہوئے مستی میں وارد

کچھ تدبیر بتاؤ ہم کو دل اپنا ہے دردآلود
خاک اُڑاتے کہاں تک پھریئے چہرہ سب ہے گردآلود

اسلامی کُفری کوئی ہو ہے شرطِ دردِ عشق
دونوں طریق میں نہیں ناکارہ دردمند

ردیف رائے مہملہ

دیوانِ اوّل

کرتا ہے کون منع کہ سج اپنی تُو نہ دیکھ
لیکن کبھی تو میرؔ کے کر حال پہ نظر

غیروں سے دیے اشارے ہم سے چھپا چھپا کر
پھر دیکھنا ادھر کو آنکھیں ملا ملا کر
ہر گام سدِّ رہ تھی بُت خانے کی محبت
کعبے تلک تو پہنچا لیکن خدا خدا کر
ناصح مرے جنوں سے آگہ نہ تھا کہ ناحق
گودڑ کیے گریباں سارا سلا سلا کر
اس حرف ناشنو سے صحبت بگڑ ہی جا ہے
ہر چند لاتے ہیں ہم باتیں بنا بنا کر
میں منع میرؔ تجھ کو کرتا نہ تھا ہمیشہ
کھوئی نہ جان تُو نے دل کو لگا لگا کر

نہ ہو ہرزہ درا اتنا، خموشی لے جرس بہتر
نہیں اس قافلے میں اہلِ دل ضبطِ نفس بہتر

کیا زمزمہ کروں ہوں خوشی تجھ سے ہم صفیر
آیا جو میں چمن میں تو جاتی رہی بہار
کس ڈھب سے راہِ عشق چلوں ہے یہ ڈر مجھے
پھوٹیں کہیں نہ آبلے ٹوٹیں کہیں نہ خار

خدا جانے کہ کیا خواہش ہے جی کو
نظر اپنی نہیں ہے جھڑ دکیں پر
پرافشانی قفس ہی کی بہت ہے
کہ پروازِ چمن قابل نہیں پر

میر صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامیئے دستار
سہل سی زندگی پہ کام کے تئیں
اپنے اُوپر نہ کیجئے دُشوار
چار دن کا ہے مجہلہ یہ سب
سب سے رکھیئے سلوک ہی ناچار
کوئی ایسا گناہ اور نہیں
یہ کہ کیجے ستم کسی پر بار
واں جہاں خاک کے برابر ہے
قدر ہفت آسمانِ ظلم شعار
یہی درخواست پاس دل کی ہے
نہیں روزہ نماز کچھ درکار
درِ مسجد پہ حلقہ زن ہو تم
کہ رہو بیٹھ خانۂ خمار
جی میں آوے سو کیجیو پیارے
ایک ہو نا نہ درپئے آزار
حاصلِ دو جہان ہے اک حرف
ہو مری جان آگے تم مختار

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سُنو ہو یہ بستی اُجاڑ کر
یارب رہِ طلب میں کوئی کب تلک پھرے
تسکین دے کہ بیٹھ رہوں پاؤں گاڑ کر
منظور ہو نہ پاس ہمارا تو حیف ہے
آئے ہیں آج دُور سے ہم تجھ کو تاڑ کر

جاتا ہے آسماں لئے کوچے سے یار کے
آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھ کر
تیرے خرامِ ناز پہ جاتے ہیں جی چلے
رکھ ٹک قدم زمیں پہ ستم گار دیکھکر
جی میں تھا اُس سے ملیئے تو کیا کیا نہ کہیئے میر
پر جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھکر

کہتا ہے کون تجھ کو یاں یہ نہ کر تو وہ کر
پر ہو سکے تو پیارے دل میں بھی ٹک جگہ کر
کیا قصرِ دل کی تم سے ویرانی نقل کریئے
ہو ہو گئے ہیں ٹیلے سارے مکان ڈھہ کر
رنگِ شکستہ اپنا بے لُطف بھی نہیں ہے
یاں کی تو صبح دیکھی اک آدھ رات رہ کر
ایکوں کی کھال کھینچی، ایکوں کو وار کھینچا
اسرارِ عاشقی کا پچھتائے یار کہہ کر

کیوں تو نے آخر آخر اس وقت منہ دکھایا — دی جان میر نے جو حسرت سے اک نگہ کر

شیخ کا اب کمال ہے کچھ اور — حال ہے اور قال ہے کچھ اور
وعدے ہیں سو کے کن نے دیکھے ہیں — دم میں عاشق کا حال تو کچھ اور
نہ ملیں گو کہ ہجر میں مر جائیں — عاشقوں کا وصال ہے کچھ اور
میر تلوار چلتی ہے تو چلے — خوش خراموں کی چال ہے کچھ اور

شکوۂ آبلہ ابھی سے میر — ہے پیارے ہنوز دلّی دور

ہو آدمی اے چرخ ترک گردشِ ایام کر — خاطر سے ہی مجھ مست کی تائید دورِ جام کر
مردہ کہیں بھی میر جو سرگشتہ پھرتا آگیا — ظالم کسو کا سن کہا کوئی گھڑی آرام کر

کوئی ہوتا ہے دل طپش سی بُرا — ایک دم کے لہو نہ پینے پر
جورِ دل پر ہے کیا ہوں آزردہ — میر اس چار دن کے جینے پر

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے — یعنی آگے چلیں گے دم لے کر
رہنے اُدھر کہ دل سے تھا نزدیک — غمِ دُوری چلے ہیں ہم لے کر
میر صاحب ہی چوکے اے بدعہد — ورنہ دینا تھا دل قسم لے کر

سوتا تھا بے خبر تو نشے میں جو رات کو — سو بار میر نے تری اٹھ اٹھ کے خبر لی

وے لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے — پیدا کئے تھے چرخ نے جو خاک چھان کر
جھمکے دکھا کے باعثِ ہنگامہ ہی رہے — پر گھر سے در پہ آئے نہ تم بات مان کر
افسانے ما و من کے سنیں میر کب تلک — چل اب کہ سو رہیں منہ پہ دوپٹہ کو تان کر

دیوان دوم

پھر بھی اٹھائی سر پہ تم نے زمیں سب آکر　　کیا کیا ہوا تھا تم سے کچھ آگے یاں زمیں پر
پست و بلندیاں کا ہے اور ہی طرفہ　　اپنی نظر نہیں ہے کچھ آسماں زمیں پر

اک بار تو نے آکر خاطر نہ رکھی میری　　میں جی سے اپنے گزرا سو بار تیری خاطر
گو دل دھسک ہی جاوے آنکھیں ابل ہی آویں　　سب اونچ نیچ کی ہے ہموار تیری خاطر
تجھ سے دو چار ہونا پھر آہ بن نہ آیا　　دی جان میر جی نے ناچار تیری خاطر

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز　　آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر
موزوں کرو کچھ اور بھی شاید کہ میر جی　　رہ جائے کوئی بات کسو کی زبان پر

دامن میں آج میر کے داغ شراب ہے　　تھا اعتماد ہم کو بہت اس جوان پر

دل لے چھپے دکھا کے رخ خوب کو کبھی　　اب منہ چھپا جو بیٹھے یہ حسن طلب ہے اور
اسباب مرگ کے تو مہیا ہیں سارے میر　　شاید کہ زندگانی کا اپنی سبب ہے اور

بے بس ہے میر تجھ بن رہتا نہیں دل اس کا　　ٹک تو بھی اے ستم جو جور و ستم کو بس کر

وہ کیا یہ دل لگی ہے فنا میں کہ رفتگاں　　منہ کر کے بھی نہ سوتے کبھو پھر جہاں کی اور
کیا حال ہو گیا ہے ترے غم میں میر کا　　دیکھا گیا نہ ہم سے تو ٹک اس جواں کی اور

نئے طور سیکھے نکالے ڈھب اور　　مگر اور تھے تب ہوئے ہو اب اور
نہ گرمی نہ جوشش نہ اب وہ تپاک　　تکلف نہیں اس میں تھے تم تب اور
زمانہ مرا کیونکہ یکساں رہے　　اٹھا دیں گے تیرے ستم ہی کب اور

جُدا اتفاق رہا ایک میر — وگرنہ ملے یوں تو اُس سے سب اور

مرتے ہیں میر سب پہ نہ اس طرح کسی کے ساتھ — ماتم میں تیرے کوئی نہ رویا پکار کر

یکایک یوں نہیں ہوتے ہیں پیارے جان کے لاگو — کبھو آدم ہی سے ہو جاتی ہے تقصیر بھی آخر
پھرے ہے باؤلا سا پیچھے ان شہری غزالوں کے — بیاباں مرگ ہو گا اس چلن سے میر بھی آخر

یہ بے مُرَوَّتی کہ نگہ کا مضائقہ — اِتنا تو میری جان نہ مجھ سے سیان کر

جب تک شگاف تھے کچھ اتنا نہ جی رُکے تھا — پچھتائے ہم نہایت سینے کے چاک سی کر
تھی جب تلک جوانی رنج و تعب اُٹھائے — اب کیا ہے میر جی میں ترکِ ستم گری کر

اے صبا گر شہر کے لوگوں میں ہو تیرا گزار — کہیو ہم صحرا نوَردوں کا تمامی حالِ زار
خاکِ دہلی سے جُدا ہم کو کیا یک بارگی — آسماں کو تھی کدورت سو نکالا یوں غبار
منصبِ بُلبُل غزل خوانی تھا سو تُو ہے اسیر — شاعری زاغ و زغن کا کیوں نہ ہووے اب شعار
طائرِ خوش زمزمہ کُنجِ قفس میں ہے خموش — چہچہے چڑیاں کریں ہیں صحنِ گلشن میں ہزار
برگِ گل سے بھی کیا نہ ایک نے ٹک ہم کو یاد — نامہ و پیغام پرسش بے مراتب درکنار
بُلبلِ خوش لہجہ کے جانے پہ گو غوغائیاں — طرح غوغا کی چمن میں ڈالیں پر کیا اعتبار
طائرانِ خوش لب و لہجہ نہیں رہتے چھُپے — شور سے ان کے بھرے ہیں قریہ و شہر و دیار
شہر کے کیا ایک دو کوچوں میں تھی شہرت رہی — شہروں شہروں ملکوں ملکوں ہے اُنھوں کا اشتہار
کیا کہوں سوئے چمن ہوتا جو میں سرگرمِ گشت — پھُول گل جب کھِلنے لگتے جوش زن ہوتی بہار
شور سُن سُن کر غزل خوانی کا میرے ہم صفیر — غنچہ ہو آتے جو ہوتا آب و رنگِ شاخسار
خوش نوائی کا جنھیں دعویٰ تھا وہ رہتے خموش — جن کو میں کرتا مخاطب اُن کو ہوتا افتخار
بعضوں کو رشکِ قبولِ خاطر و لطفِ سخن — بعضوں کا سینہ فگار و بعضوں کا دل داغ دار
ایک کے ہونٹوں کے اُوپر آفریں اُستاد تھا — ایک کہتا تھا رسوخِ دل ہے اپنا استوار

رابط کا دعویٰ تھا جن کو کہتے تھے مخلص ہیں ہم
جانتے ہیں ذاتِ سامی ہی کو ہم سب خاکسار

نقل کرتے کیا یہ صحبت منعقد جب ہوتی بزم
بیٹھ کر کہتے تھے منہ پر میرے بعضے بعضے یار

بندگی ہے خدمتِ عالی میں ہم کو دیر سے
کر رکھی ہے جان اپنی ہم نے حضرت پر نثار

سو نہ خط ان کا نہ کوئی پرچہ پہنچا مجھ تک
واہ واہی رابطہ رحمت ہے یہ اخلاق و پیار

رفتہ رفتہ ہوگئیں آنکھیں مری دونوں سفید
بسکہ نامے کا کیا یاروں کے میں نے انتظار

لکھتے گر دو حرف لطف آمیز بعد از چند روز
تو کبھی ہوتا اس دلِ بے تاب و طاقت کو قرار

سو تو یک نوشتہ کاغذ بھی نہ آیا میرے پاس
ان ہم آوازوں سے جنکا میں کہا رابطہ آشکار

خط لتاحت سے یہ کہتے تھے نہ بھولیں گے تجھے
آویں گے گھر بار کی تیرے خبر کو بار بار

جب گیا میں یاد سے تب کس کا گھر کاہے کا پاس
آفریں صد آفریں اے مردمانِ روزگار

اب بیاباں در بیاباں ہے مرا شور و فغاں
گو چمن میں خوش کی تم نے میری جاگے نالہ زار

منہ پر آویں گے سخن آلودۂ خونِ جگر
کیونکہ یارانِ زماں سے چاک ہو دل جوں انار

لب سے لے کر تا سخن ہیں خونچکاں شکوے بھرے
لیک ہے اظہار ہر ناکس سے اپنا ننگ و عار

عیب بھی گو تلخ کامی کھینچی اس میں پڑے
بیت بحثی طبعِ نازک پر ہے اپنی ناگوار

بس قلم رکھ ہاتھ سے جانے بھی دے یہ حرف میر
کاہ کے جا ہے نہیں کہسار ہوتے بے وقار

کم ہے کے جو لوگ صاحب فن ہیں وہ محسود ہیں
بے ادبی کرتے رہیں گے حاسدانِ نابکار

دیوان سوم

اے مرغِ چمن صبح ہوئی زمزمہ سر کر
دم کھینچ تہِ دل سے کوئی ٹکڑے جگر کر

کسب اور کیا ہوتا عوض ریختے کے کاش
پچھتائے بہت میر ہم اس کام کو کر کر

میں میر ترک کر دنیا سے ہاتھ اٹھایا
درویش تو بھی تو ہے حق میں مرے دعا کر

دل جو بچا نہیں ہے وحشی سا میں پھرتا ہوں
تم جائیو نہ ہرگز میرے دوانے پن پر

تب ہی بھلے تھے جب تک حرف آشنا نہ تھے ہم
لینے لگے لڑائی اب تو سخن سخن پر

کس طرح میر جی کا ہم توبہ کرنا مانیں
کل تک تھے داغ مے کے سب اُن کے پیرہن پر

مبارک تمہیں میر ہو عشق کرنا
بہت ہم تو پچھتائے دل کو لگا کر

مذہب سے میرے کیا تجھے تیرا دیار اور
میں اور یار اور مرا کاروبار اور

بندے کو ان فقیروں میں گنیئے نہ شہر کے
صاحب نے میرے مجھ کو دیا اعتبار اور

کس کو فقیری میں سرِ دل حرف کا ہے میر
کرتے ہیں اس دماغ پہ ہم انکسار اور

جب تک بہار رہتی ہے رہتا ہے مست تو
عاشق ہیں میر ہم تو ترے عقل و ہوش پر

دیوانِ چہارم

تقریبِ دل تو دیکھ ہوئی جس کو اُس سے راہ
سر دیں ہیں لوگ اُس کے قدم کے نشان پر

میر نہ ہم کہتے تھے تجھ سے حال نہیں کچھ رہنے کا
چاہ بلائے جان و دل ہے آ جانے سے چاہ کر

جُدائی تا جدائی فرق ہے ملتے بھی ہیں آ کر
فراق ایسا نہیں ہوتا کہ پھر آتے نہیں جا کر

سبد پھولوں بھرے بازار میں آئے ہیں موسم میں
نکل کر گوشۂ مسجد سے تو بھی میر سودا کر

آگے زمیں کی تہ میں ہم سے بہت تھے تو بھی
سر پر زمیں اُٹھا لی ہم بے تہوں نے آ کر

اب تو پھرو ہو بے غم تب میر جانیں گے ہم
اچھے رہو گے جب تم دل کو کہیں لگا کر

دل نہیں درد مند اپنا میر
آہ نالے اثر کریں کیوں کر

دیوانِ پنجم

اپنے موئے بھی رنج و بلا ہے ہمسایوں کی جانوں پر
کیا کیا سینہ زنی رہتی ہے درد و غم کے فسانوں پر
میں تو کیا کیا حرف و سخن تھے میرے جہاں میں جاتے رہے
باتیں درد آگیں ہیں اب تک کیسی کیسی زبانوں پر
عشق عجائب زور آور ہے کشتی سب کی پاک ہوئی
ذکرِ میر ہے کیا پیری میں حرفِ سخن ہے جوانوں پر

عشق خدائی خراب ہے ایسا جس سے گئے ہیں گھر کے گھر
کعبہ و دیر کے ایوانوں کے گر پڑے ہیں در کے در
حالِ پریشاں سن مجنوں کا کیا جلتا ہے جی اپنا
عاشق ہم بھی میر رہے ہیں اس ڈھب کے دیوانے پر

دیوانِ ششم

دل گئے آفت آئی جانوں پر		یہ فسانہ رہا زبانوں پر
عشق میں ہوش و صبر سنتے تھے		رکھ گئے ہاتھ سو تو کانوں پر
عرش و دل دونوں کا ہے پایہ بلند		سیر رہتی ہے ان مکانوں پر

بس نہ لگ چل نسیم مجھ سے کہ میں		رہ گیا ہوں چراغ سا بجھ کر

ردیف رائے ہندی

دیوان اوّل

زخمِ دردوں سے میرے نہ ٹک بے خبر رہو
اب ضبطِ گریہ سے ہے اِدھر ہی کو سب نچوڑ

کچھ کوہ کن ہی سے نہیں تازہ ہوا یہ کام
بہتیرے عاشقی میں موئے سر کو پھوڑ پھوڑ

بے طاقتی سے میر لگے چھوٹنے پران
ظالم خیال دیکھنے کا اُسکے اب تو چھوڑ

ردیف زائے معجمہ

دیوان اوّل

مرگیا میں پہ مرے باقی ہیں آثار ہنوز
تر ہیں سب سر کے لہو سے در و دیوار ہنوز

دل بھی پُر داغِ چمن ہے پہ اسے کیا کیجے
جی سے جاتی ہی نہیں حسرتِ دیدار ہنوز

بدنہ لے جا تیو پوچھوں ہوں تجھی سے یہ طبیب
بہ ہوا کوئی بھی اس درد کا بیمار ہنوز

دیوان دوم

مدّت سے ترکِ عشق کیا میر نے ولے
زار و زبون و زرد ہے بیمار سا ہنوز

برسوں ہوئے کہ رات کو ٹک بیٹھتے نہیں
رہتے ہیں تم کو میر جی کیا ایسے کام روز

دیوان چہارم

مُدّت سے میر بے دل و دیں دلبروں میں ہے
کرتا نہیں ہے اسکی کوئی دلبری ہنوز

سادگی دیکھ اُس جفا جو سے　　　　ہم نہیں کرتے احتراز ہنوز
مست کیا ہے میر کی طاعت　　　　رہن بادہ ہے جانماز ہنوز

دیوان پنجم

کچھ کئے [illegible] عشق ہو پیدا ہیں ہنوز　　　　ملتے ہیں معشوق اگر تو ملتے ہیں شرمانے ہنوز
ایسی وحشت کم کسو سے جیسی غم کش میر نے کی　　　　برسوں ہوئے ہیں اٹھ گئے مجنوں دشت میں ہم [illegible] ہنوز

ردیف سین

دیوان اوّل

یوں گنواتا ہے دل کوئی مجھ کو　　　　یہی آتا ہے بار بار افسوس
قتل تو نے نہیں کرے کا خوشی　　　　یہ توقع تھی تجھ سے یار افسوس
فرصتِ سیر باغ تک نہ ہوئی　　　　یونہی جاتی رہی بہار افسوس
خوب بدعہد تو نہ مل لیکن　　　　میرے تیرے تھا یہ قرار افسوس

دیوان دوم

یہی گالی یہی جھڑکی یہی چھیڑ　　　　نہ کچھ میرا کیا تو نے کبھو پاس

دردمندوں سے تمہیں دُور پھرا کرتے ہو کچھ　　　　پوچھنے ورنہ سبھی آتے ہیں بیمار کے پاس
اختلاط ایک تمہیں میر ہی غم کش سے نہیں　　　　جب نہ تب یوں تو نظر آتے ہو دو چار کے پاس

رہتے تھے ہم وے اکٹھے پھر یا تو پاس پاس　　　　یا اب پھٹک نہیں ہے کہیں اُن کے آس پاس

۱۱۵ وحشی ہے میر ربط ہے اُس سے خلافِ عقل — بیٹھے سوچا کے کیا کوئی ایسے اُداس پاس

دیوانِ سوم

چمن کے غم میں سینہ داغ ہے میر — بہت نکلی ہماری بھی ہوس بس

جاہ میں ہم نہیں زیادہ طلب — کبھو پوچھو جو تم خبر ہے بس
چشم پوشی نہ کر فقیر ہے میر — مہر کی اُس کو اک نظر ہے بس

لگا ہے حوصلہ بھی کرنے تنگی — غموں کی اب سمائی ہوچکی بس
گلے میں گیروی کفنی ہے اب میر — تمہاری میرزائی ہوچکی بس

دیوانِ چہارم

خوش حال وے جو جان کبھو لبرُدن دیر — رو یا نہیں تو ایک گھڑی اپنے یار پاس

اب نہیں ہوتی چشم تر افسوس — بہ گیا خون ہو جگر افسوس
دیدنی ہے یہ خستہ حالی لیک — ایدھر اس کی نہیں نظر افسوس
میر اُتھر بہت ہی دل کا حال — یعنی ویراں پڑا ہے گھر افسوس

دیوانِ پنجم

یار ہم سے جُدا ہوا افسوس — نہ جُدا ہو کے پھر ملا افسوس
جب تلک آن کر رہے تجھ پاس — مجھ میں تب تک کچھ رہا افسوس
سب سے بیگانگی کی جس کے لئے — وہ نہیں ہم سے آشنا افسوس
رات دن ہاتھ ملتے رہتے ہیں — دل کے جانے کا ہے بڑا افسوس
مجھ کو کرنا تھا احتراز اُس سے — ہائے افسوس کیا کیا افسوس

کوئی دن کریئے معیشت جا کِسو کامل کے پاس   ناقصوں میں رہیئے کیا رہیئے تو صاحبِ دل کے پاس

کیا میر اسیروں کو دیر باغ جودا ہو   ہے رنگ ہوا دیکھنے کو چاکِ قفس بس

آنکھ کھلتے گئی بہار افسوس   گُل کو دیکھا بھی نہ ہزار افسوس
جس کی خاطر ہوئے کنارہ گزیں   نہ ہوئے اُس سے ہم کنار افسوس
بے قراری نے یوں ہی جی مارا   اُس سے نے عہد نے قرار افسوس
خوں ہوئی دل ہی میں اُمیدِ وصال   مر رہے جی کو مار مار افسوس
چارۂ اشتیاق کچھ نہ ہوا   وہ نہ ہم سے ہوا دوچار افسوس

کیا کیا تم نے ہم سے کہا تھا کچھ نہ کیا افسوس افسوس
کیا کیا کڑھایا جی سے مارا لوہو پیا افسوس افسوس
نورِ چراغِ جان میں تھا کچھ یو نہیں نہ آیا لیکن وہ
گُل ہو ہی گیا آخر کو یہ بجھتا سا دیا افسوس افسوس
میر کی آنکھیں مُندنے پر وہ دیکھنے آیا تھا ظالم
اور بھی یہ بیمارِ محبت ٹک نہ جیا افسوس افسوس

متفرقات

گردِ سر پھر کے کرتے پہروں پاس   سو تو ہم لوگ اُس کے آس نہ پاس
دل نہ باہم لے تو ہجراں ہے   ہم دے لیتے ہیں گو کہ پاس ہی پاس
میرِ وحشی کا دل ہے بے طاقت   چلتا پھرتا ہے پر اُداس اُداس

ردیف شین

دیوانِ اوّل

ان مُغبچوں کے کوچے ہی سے میں کیا سلام — کیا مجھ کو طوف کعبہ سے میں رندِ دُرد نوش

دیوانِ دوم

گُل کو ہوتا صبا قرار اے کاش — رہتی اک آدھ دن بہار اے کاش
یہ جو دو آنکھ مُند گئیں میری — اس پہ وا ہوتیں ایکبار اے کاش
کن نے اپنی مصیبتیں نہ گنیں — رکھتے میرے بھی غم شمار اے کاش
جان آخر تو جانے والی تھی — اس پہ کی ہوتی میں نثار اے کاش
اس میں راہِ سخن نکلتی تھی — شعر ہوتا ترا شعار اے کاش
بے اجل میرؔ اب پڑا مرنا — عشق کرتے نہ اختیار اے کاش

کرتے ہیں سب تمنا پر میرؔ جی نہ اتنی — رکھے گی مار تم کو پایانِ کار خواہش

کس اعتبار دل کے تئیں گُل کہیں ہیں لوگ — مجھ پاس تو مُندی ہی کلی سا رہا ہمیش
واقف نہیں ہوں میرؔ سے تو پر تمام شب — کرتا ہے شور آن کر ایک لے نوا ہمیش

دیوانِ سوم

پاؤں پڑتا ہے کہیں آنکھیں کہیں — اُس کی مستی دیکھ کر جاتا ہے ہوش

طرح خوش ناز خوش اُسکی ادا خوش — خوشا ہم جو نہ رکھے ہم کو ناخوش
بُتوں کے غم میں نالاں جب تب ہوں — نہ راضی خلق مجھ سے نے خُدا خوش
کلی رُکتی ہے گُل ہے دل پریشاں — کسو کی اس چمن میں گزرے کیا خوش

جہانِ تنگ کرڑھنے ہی کی جاتھی　　کوئی دن میں تکلف سے رہا خوش
گیا اس شہر ہی سے میرؔ آخر　　تمہاری طرزِ بد سے کچھ نہ تھا خوش

کیا پتنگے کو شمع رونے میرؔ　　اس کی شب کو بھی ہے سحر درپیش

دیوانِ چہارم

جاتے ہیں رنگ و بوئے گل وآب جو چلے　　آئی نہ خوش ہمیں تو یہ گلزار کی روش
مائل ہوا ہے سروِ گلستاں کا دل بہت　　کچھ آ گئی تھی اس میں قدِ یار کی روش
یوں سر بکھیرے عشق میں پھرتے نہیں ہیں میرؔ　　اظہار بھی کریں ہیں تو اظہار کی روش

ہمواری سے ہیں نرم و خشن ایک سے دونوں　　خوش ہیں نہ گل تر سے نہ ہم خار سے ناخوش
سر رشتۂ دل بند نہیں زلف و کمر میں　　کیا جانیے ہم کس لئے ہیں یار سے ناخوش
ہے عشق میں صحبت مرے خوباں کی عجب کچھ　　اقرار سے بیزار رہیں انکار سے ناخوش
خوش رہتے ہیں احباب بہم ربط کئے سے　　رہتے ہو تمہیں ایک مرے پیار سے ناخوش
اک بات کا بھی لوگوں میں کھٹ پٹ اسے کرنا　　ہم ہیں گے بہت میرؔ کے بستار سے ناخوش

دیوانِ پنجم

رکھتے رہے بتوں سے مہر و وفا کی خواہش　　اس آرزو نے مارا یہ بھی خدا کی خواہش
حیران کارِ الفت اے میرؔ چپ ہوں میں تو　　پوچھا کرو ہو ہر دم کیا بے نوا کی خواہش

رنج و غم آتے بیشتر درپیش　　راہ رفتن ہے اب مگر درپیش
خانہ روشن پتنگوں نے نہ کیا　　ہے چراغوں کو بھی سحر درپیش

کیا خود گم سر بکھیرے میرؔ ہے بازار میں　　ایسا اب پیدا نہیں ہنگامہ آرا دل فروش

پھول گل کچھ نہ تھے کھلی جب چشم		اور بھی رہتی اب بہار اے کاش
اب وہی میر سر کھپاتا ہے		ہم کو ہوتا نہ اُس سے پیار اے کاش

آباد اُجڑا لکھنؤ چغدوں سے اب ہوا		مشکل ہے اس خرابے میں آدم کی بُود و باش
عمرِ عزیز یاس ہی میں جاتی ہے چلی		اُمیدوار اُس کے نہ ہم ہوتے میر کاش

ردیفِ صاد

دیوانِ پنجم

شاعری شیوہ ہے شعار اخلاص		دین و مذہب مرا ہے پیار اخلاص
اب کہاں وہ مودّتِ قلبی		ہو دے ظاہر میں یوں ہزار اخلاص

ردیفِ طا

دیوانِ دوم

عشق کی رہ نہ چل خبر ہے شرط		اوّلِ گام ترکِ سر ہے شرط
دعوئ عشق یوں نہیں صادق		زردئ رنگ و چشمِ تر ہے شرط
دل کا دینا ہے سہل کیا اے میر		عاشقی کرنے کو جگر ہے شرط

کرتے نہیں ہیں اُس سے نیا کچھ ہم اختلاط		ہوتا تھا اگلے لوگوں میں بھی باہم اختلاط
کس طور اتفاق پڑی صحبت اس سے دیر		ہے میر بے دماغ و قیامت کم اختلاط

دیوانِ چہارم

دل کا لگانا جی کھوتا ہے اس کو جگر ہے پیارے شرط
سو تو بہا تھا خون ہو آگے پہلے داؤ میں ہارے شرط

دیوانِ پنجم

جس کو ہوا ہے اُس صنم بے وفا سے ربط　　اُس کو خُدا ہی ہووے تو ہو کچھ خدا سے ربط
گُل ہو کے برگ برگ ہوئے پھر ہوا ہوئے　　رکھتے ہیں اس چمن کے جو غنچے صبا سے ربط
کرتی ہے آدمی کو دُنی صحبتِ فقیر　　اچھا نہیں ہے میر سے بے تہ گدا سے ربط

شیریں زباں جہاں کے نہیں جھوٹ جانتے　　ہوں گو کہ میر صاحب و قبلہ کم اختلاط

ردیف ظا

دیوانِ سوم

کہا دردِ دل رات کیا میر نے　　اُٹھایا بہت اس کہانی سے حظ

دیوانِ پنجم

رونے کڑھنے کو عیش کہو ہو ہم تو تمہارے دعاگو ہیں
یونہیں ہمیشہ عشق میں اُس کے رکھتے ایسا خدا محظوظ
زردی مُنہ کی اشک کی سُرخی دونوں اب تو رنگ پہ ہیں
شاید میر بہت رہتے ہو اس سے ہو کے جدا محظوظ

ردیف غین

دیوان سوم

صحبت کسو سے رکھنے کا اُسکو نہ تھا دماغ — تھا میرؔ بے دماغ کو بھی کیا بلا دماغ
باتیں کرے برشتگیٔ دل کی پر کہاں — کرتا ہے اس دماغ جلے کا وفا دماغ
دو حرف زیر لب کہے پھر ہو گیا خموش — یعنی کہ بات کرنے کا کس کو رہا دماغ
کر فکر اپنی طاقت فکری جو ہو ضعیف — اب شعر شاعری کی طرف کب لگا دماغ
آتش زبانی شمع نمط میرؔ کی بہت — اب چاہیئے معاف رکھیں جل گیا دماغ

دیوان چہارم

دل جلے ہم نہیں رہے بے کار — زخم کاری اُٹھائے کھائے داغ
جل گئے دیکھ گرمیٔ اغیار — آئے اس کوچے سے تو آئے داغ
دیکھے دامن کے نیچے سے دیئے — میرؔ نے گرتلے چھپائے داغ

دیوان پنجم

غم کھنچا رائگاں دریغ دریغ — ہم ہوئے خستہ جاں دریغ دریغ
عشق میں جی بھی ہم گنوا بیٹھے — ہو گیا کیا زیاں دریغ دریغ
سب سے کی دشمنی جنھوں کے لئے — وے ہیں نامہرباں دریغ دریغ

ہم کو شہر سے اس مہ کے ہے عزم راہ دروغ دروغ
یہ حرکت تو ہم نہ کریں گے خانہ سیاہ دروغ دروغ
عشق کے مارے غم زدگاں سے اُنس کرے بہتانِ کذب
اُس بے مہر کی ہم لوگوں سے اُلفت چاہ دروغ دروغ
کس دلبر کو شوق سے دیکھا میرؔ غلط ہے تہمت شب
مُنہ پہ کسو کے پڑی ہنس ہر گاہ نگاہ دروغ دروغ

کیا کہیے یاں اب کی جنوں میں سینا اپنا ایک سر داغ
ہاتھ گلوں سے گل دستے ہیں شمع نمط ہے سر پر داغ

صحبت درگیر آتے اُس کی پہر گھڑی ساعت نہ ہوئی
جب آئے ہیں گھر سے اُس کے تب آئے ہیں اکثر داغ

ردیفِ فا

دیوانِ اوّل

آج کل کاہے کو بتلاتے ہو گستاخی معاف — راستی یہ ہے کہ وعدے ہیں تمہارے سب خلاف
شیخ مت رُو کش ہو مستوں کا تو اس جبّے اُپر — لینے استنجے کو ڈھیلا تیری ٹل جاتی ہے ناف

کوئی دادِ دل آہ کس سے کرے — ہر اک ہو سو اُس فتنہ گر کی طرف ۲
محبت نے شاید کہ دی دل میں آگ — دُھواں سا ہے کچھ اُس نگر کی طرف
لگیں ہیں ہزاروں ہی آنکھیں اُدھر — اِک آشوب ہے اُس کے گھر کی طرف

دیوانِ سوم

کیا پیام و سلام ہے موقوف — رسم ظاہر تمام ہے موقوف
اقتدا میرؔ ہم سے کس کی ہوئی — اپنے ہاں اب امام ہے موقوف

دیوانِ چہارم

آج ہمارا سر پھرتا ہے باتیں جتنی سب موقوف
حرف و سخن جو باہم دیگر رہتے تھے سو اب موقوف

کس کو دماغ اب اُس سے رہا یاں آٹھ پہر کی منت کا
ربط اخلاص سے دن گزرے ہے خلط اُس سے سب موقوف

اُس کی گلی میں آمد و شد کی گھاتیں ہی میں ہم رہتے تھے

اب جو شکستہ پا ہو بیٹھے ڈھب کرنے کے ڈھب موقوف

وہ جو مانع ہو تو کیا ہے شوق کمال کو پہونچا ہے
وقفہ ہوگا آپ ملنے میں ہم بھی کریں گے جب موقوف

حلقے پڑے ہیں چشم تر میں سوکھے ایسے تم نہ رہے
رونا کڑھنا عشق میں اپنے میر کروگے کب موقوف

دیوان پنجم

ظلم و ستم سے جور و جفا سے کیا کیا عاشق مارے گئے
شہر حسن کے لوگوں میں کرتا نہیں کوئی وفا کی طرف

کس سے کہوں جو میر طرف کر اس سے داد دلا دیوے
چھوٹے بڑے ہر ایک نے کی ہے اس اوباش جواں کی طرف

کیا نیچی آنکھوں دیکھو ہو تلوار کی طرف — دیکھو کن انکھیوں ہی سے گنہ گار کی طرف
آوارگی کے محو ہیں ہم خانماں خراب — مطلق نہیں نظر ہمیں گھر بار کی طرف

اسے ڈھونڈتے میر کھوئے گئے — کوئی دیکھے اس جستجو کی طرف

ردیف قاف

دیوان دوم

اس پردے میں غم دل کہتا ہے میر اپنا — کیا شعر و شاعری ہے یارو شعار عاشق

میر جی زرد ہوتے جاتے ہو — کیا کہیں تم نے بھی کیا ہے عشق

دیوانِ سوم

کیا حقیقت کہوں کہ کیا ہے عشق
حق شناسوں کا ہاں خدا ہے عشق
کوہ کن کیا پہاڑ کاٹے گا
پردے میں زور آزما ہے عشق
کون مقصد کو عشق بن پہنچا
آرزو عشق مدّعا ہے عشق
میر مرنا پڑے ہے خوباں پر
عشق مت کر کہ بد بلا ہے عشق

وصل و جدائی سے ہے مبّرا وہ کام جاں
معلوم کچھ ہوا نہیں ہاں سوائے شوق

دیوانِ چہارم

الفت سے پرہیز کیا کر کلفت اس میں قیامت ہے
یعنی درد و رنج و تعب ہے آفتِ جان و بلا ہے عشق
میر خلافِ مزاجِ محبت موجبِ تلخی کشیدن ہے
یار موافق مل جاوے تو لطف ہے چاہ مزا ہے عشق

جی سارے تن کا کھنچ کر آنکھوں میں آرہا ہے
کس مرتبے میں ہم بھی ہیں دیکھنے کے شائق
کل میر جی نے ضائع اپنے تئیں کیا ہے
یہ کام تھا نہ اُن کی شائستگی کے لائق

دیوانِ پنجم

مہر قیامت چاہت آفت فتنہ فساد بلا ہے عشق
عشق اللہ صیاد انہیں کہیو جن لوگوں نے کیا ہے عشق
عشق سے نظمِ کل ہے یعنی عشق کوئی ناظم ہے خوب
ہر شے یاں پیدا جو ہوئی ہے موزوں کر لایا ہے عشق

خاک و باد و آب و آتش سب ہے موافق اپنے تئیں
جو کچھ ہے سو عشقِ بتاں ہے کیا کہیے اب کیا ہے عشق

میرؔ کہیں ہنگامہ آرا میں تو نہیں ہوں چاہت کا
صبر نہ مجھ سے کیا جاوے تو معاف رکھو کہ نیا ہے عشق

ردیفِ کاف

دیوانِ اوّل

کیا آسماں پہ کھینچے کوئی میرؔ آپ کو — جانا جہاں سے سب کو مسلّم ہے زیر خاک

روتے پھرے ہیں لوہو اک عمر اس گلی میں — باغ و بہار ہی ہے جاوے نظر جہاں تک
مانند طیر نوپر اُٹھے جہاں گئے ہم — دشوار ہے ہمارا آنا پھر آشیاں تک
تن کام میں ہمارے دیتا نہیں دہی کچھ — حاضر ہیں میرؔ ہم تو اپنی طرف سے جاں تک

کیا جانیے ہوتے ہیں سخن لطف کے کیسے — پوچھا نہیں اُن نے تو ہمیں پیار سے اب تک

میرؔ گم کردہ چمن زمزمہ پرداز ہے ایک — جس کی لے دام سے تا گوشِ گل آواز ہے ایک
کچھ ہوا ہے مرغِ قفس لطف نہ جاوے اُس سے — نوحہ یا نالہ ہر اک بات کا انداز ہے ایک
ناتوانی سے نہیں بال فشانی کا دماغ — ورنہ تا باغ قفس سے مری پرواز ہے ایک

دُور اب بیٹھتے ہیں مجلس میں — ہم جو تم سے تھے بیشتر نزدیک
خبر آتی ہے سو بھی دُور سے یاں — آؤ یک بار بے خبر نزدیک
دُور پھرنے کا ہم سے وقت ہے کیا — پوچھ کچھ حال بیٹھ کر نزدیک
مر بھی رہ میرؔ شب بہت رویا — ہے مری جان اب سحر نزدیک

گلی تک تیری لایا تھا ہمیں شوق — کہاں طاقت کہ اب پھر جائیں گھر تک
کہاں پھر شور و شیون جب گیا میرؔ — یہ ہنگامہ ہے اُس ہی نوحہ گر تک

نہ گیا میر اپنی کشتی سے ایک بھی تختہ پارہ ساحل تک

شاید کہ دیوے رخصتِ گلشن ہوپے قرار میرے قفس کو لے تو چلو باغباں تک
قیدِ قفس سے چھوٹ کے دیکھا جلا ہوا پہنچے نہ ہوتے کاش کہ ہم آشیاں تک
میں ترکِ عشق کر کے ہوا گوشہ گیر میر ہوتا پھروں خراب جہاں میں کہاں تک

مارا گیا خرامِ بتاں پر سفر میں میر اے کبک کہتا جو کوئی اس کے وطن تلک

دیوانِ دوم

پھر کہیں کیا دل لگا یا میر جو ہے زرد رو منہ پر آیا تھا ترے دو چار دن سے لوہو تک

دل تنگ ہو جیسے تو نہ بیٹھے کسو کے ساتھ ہوتے ہیں ایسے وقت ہیں یہ لوگ کم شریک
شاید کہ سرنوشت میں مرنا ہے گھٹ کے میر کاغذ نہ محرمِ غمِ دل نے قلم شریک

خاک ہی میں ملانے رکھتے ہو ہو کوئی تم سے آشنا کیا خاک
سب موئے ابتدائے عشق ہی میں ہووے معلوم انتہا کیا خاک
تربتِ میر پہ جیسے تم دیر اتنی مدت میں واں رہا کیا خاک

اٹھایا پاس بے اختیاری نے سب کا بکا بیٹھے کرتے ہیں دو دوپہر تک
محبت میں جی سے گئے میر آخر خبر گفتنی ہے یہ ہر بے خبر تک

دیوانِ چہارم

وحشت تھی ہمیں بھی وہی گھر بار سے اب تک سر ماریں ہیں اپنے در و دیوار سے اب تک
مرتے ہی سنا اُن کو جنہیں دل لگی تھی کچھ اچھا بھی ہوا کوئی اس آزار سے اب تک
جب سے لگی ہیں آنکھیں کھلی راہ تکے ہیں سوئے نہیں ساتھ اس کے کبھو پیار سے اب تک

کچھ ہے تو دل میں میرے جوانی میں کچھ تھا　　زردی نہیں جاتی مرے رخسار سے اب تک

نہ ہو گو جنون میر جی کو بہار کی　　طبیعت ہے آشفتہ وحشت سے اب تک

دیوان پنجم

نفع کثیر اُٹھایا کر عشق کی تجارت　　راضی ہیں میر اب تو ہم جان کے زیاں تک

اُنس نہیں انسان سے اچھا عشق و جنوں کی آفت ہے
فرق ہوئے کیا چھوڑے ہی آدم میں اُسکی جدائی خاک
ہوکے فقیر گلی میں اُس کی جبین بہت سلپا یا ہم
لے کے سرہانے پتھر رکھا جائے فرش بچھائی خاک
قلب گداز ہیں جن کے دے بھی مٹی سونا کرتے ہیں
میر اکسیر بنائی اُنہوں نے جن کی جہاں سے اُٹھائی خاک

عشقِ مرد آزمانے آخرکار　　کئے فرہاد و قیس و میر ہلاک

جب رکھی نوبت تم نے تو گوش ہوش نہ کھولے ٹک
چُپکے چُپکے کسو کو چاہا پُوچھنے آئے نہ بولے ٹک
اب جو چھاتی جلی فی الواقع کُلفت نہیں ہو شکایت کا
صبر کرو کیا ہوتا ہے یوں پھوڑیں دل کے پھپھولے ٹک
آنکھیں کھولیں حال کے کہتے دیر ہوئی ہے بس یعنی
ساری رات کہانی کہی ہے میر اب پلک کر سولے ٹک

دیوان ششم

ایسے دردِ دل کہنے کو میر کہاں سے جگر آوے　　گرم سخن لوگوں میں ہو کوئی بات کرے تو رو لے ٹک

بہت میر پھر ہم جہاں میں رہیں گے　　اگر رہ گئے آج شب کی سحر تک

ردیف گاف فارسی

دیوان اول

کس طرح اُن سے کوئی گرم ملے　　سیم تن پگھلے جاتے ہیں جوں رانگ
نقرہ باطل تھا طور پر اپنے　　ورنہ جاتے یہ دوڑ ہم بھی پھلانگ
میر بندوں سے کام کب نکلا　　مانگنا ہے جو کچھ خدا سے مانگ

دیوان دوم

مجنوں و کوہ کن نہ تلف عشق میں ہوئے　　مرنے پہ جی ہی دیتے ہیں اس خانداں کے لوگ
تو ہم میں اور آپ میں مت دے کسی کو دخل　　ہوتے ہیں فتنہ ساز یہی درمیاں کے لوگ
مرتے ہیں اس کی واسطے یوں تو بہت ولے　　کم آشنا ہیں طور سے اس کام جاں کے لوگ
بُت چیز کیا کہ جس کو خُدا مانتے ہیں سب　　خوش اعتقاد کتنے ہیں ہندوستاں کے لوگ
کیا سہل جی سے ہاتھ اُٹھا بیٹھتے ہیں ہائے　　یہ عشق پیشگاں ہیں الٰہی کہاں کے لوگ

افسردگی سوختہ جاناں ہے قہر میر　　دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہے آگ

رہِ مرگ سے کیوں ڈراتے ہیں لوگ　　بہت اُس طرف کو تو جاتے ہیں لوگ
رہے ہم تو کھوئے گئے سے سدا　　کبھو آپ میں ہم کو پاتے ہیں لوگ
نہ سویا کوئی شورِ شب سے مرے　　قیامت! اذیت اُٹھاتے ہیں لوگ
اُن آنکھوں کے بیمار ہیں میر ہم　　بجا دیکھنے ہم کو آتے ہیں لوگ

دیوان سوم

کج روی ہم عاشقوں سے اُس کی بس اب جا چکی　　ایک تو ناساز پھر اُس سے ملے بے طور لوگ

دیوانِ چہارم

کیا چلے جاتے ہیں جہاں سے لوگ　　مگر آئے تھے میہمان سے لوگ
شہر میں گھر خراب ہے اپنا　　آتے ہیں یاں اب اس نشان سے لوگ
آدمی اب نہیں جہاں میں میرؔ　　اُٹھ گئے اس بھی کاروان سے لوگ

دیوانِ پنجم

رات کی بات کہیں ہم کس سے بے ترِیاں اکثر ہیں لوگ
سرگرمِ بے راہ روی ہیں خود گم بے رہبر ہیں لوگ

بدتر آپ سے پاؤں کسو کو تو میں اس کا عیب کہوں
خوب تامل کرتا ہوں تو سب مجھ سے بہتر ہیں لوگ

دیوانے ہیں شہرِ وفا کی راہ و رسم کے ہم تو میرؔ
دل کے کہے جی دینے والے قاطبۃً گھر گھر ہیں لوگ

وہ نہیں ملتا ایک کسو سے مرتے ہیں اُودھر جا جا لوگ
یعنی ضائع اپنے تئیں کرتے ہیں اُس بن کیا کیا لوگ

جیسے غمِ ہجراں میں اُس کے عاشق جی کھو بیٹھے ہیں
برسوں مارے چرخِ فلک تو ایسے ہو ویں پیدا لوگ

زلف و خال و خط سے اُسکے جہاں تہاں اب بحث ہے
عقل ہوئی ہے گم خلقت کی یا کہتے ہیں سودا لوگ

دُنیا جائے نہیں رہنے کی میرؔ غرور تمہیں اچھا
جو جاگہ سے جاتے ہیں اپنی وے کرتے ہیں بیجا لوگ

ردیفِ لام

دیوانِ اوّل

گُل کی جفا بھی جانی دیکھی وفائے بُلبُل　　یک مُشتِ پر پڑے ہیں گلشن میں جائے بُلبُل

کھٹکے ہیں خار ہو کر ہر شب دلِ چمن میں		اتنے لب و دہن پر یہ نالہائے بلبل

کس کو دماغِ شعر و سخن ضعف میں کہ میر		اپنا رہے ہے اب تو ہمیں بیشتر خیال

تپِ غم تو گئی طبیب و لے		پھر نہ آیا کبھو مزاج بحال
کیوں نہ دیکھوں چمن کو حسرت سے		آشیاں تھا مرا بھی یاں پرسال
ہم تو سہ گزرے کج روی تیری		نہ نبھے گی پر اے فلک یہ چال

جانیں ہیں فرشِ رہ تری مت ہال ہال چل		اے رشکِ حور آدمیوں کی سی چال چل

مندا ہے اختلاط کا بازار آج کل		لگتا نہیں ہے دل کا خریدار آج کل
اوباشوں ہی کے گھر تجھے پانے لگے ہیں روز		مارا پڑے گا کوئی طلبگار آج کل
ملنے کی رات دن فکر ایام کیا نہیں		برسوں ہوئے کہاں تئیں اے یار آج کل
گلزار ہو رہا ہے مرے دم سے کوئے یار		اک رنگ پر ہے دیدۂ خوں بار آج کل
کعبہ تلک تو سنتے ہیں ویرانہ و خراب		آباد ہے سو خانۂ خمّار آج کل
حیران میں ہی حال کی تدبیر میں نہیں		ہر اک کو شہر میں ہے یہ آزار آج کل
اچھا نہیں ہے میر کا احوال ان دنوں		غالب کہ ہو چکے گا یہ بیمار آج کل

دیوان دوم

تم نے دیکھا ہوگا بچپن میر کا		ہم کو آیا نظر وہ خام سہل

مدّت تو وا ہوا ہی نہیں غنچہ وار دل		اب جو کھلا سو جیسے گل بے بہار دل
ظالم بہت ضرور ہے اُن بیکسوں کا پاس		ناچار اپنے رہتے ہیں جو مار مار دل

بہت مدت گئی ہے اب ٹک آ مل		کہاں تک خاک میں میں تو گیا مل

پس از مدت سفر سے آئے ہیں میر — کہیں وہ اگلی باتیں تو بھی جاہل

دیوان سوم

اب کی ہزار رنگ گلستاں میں آئے گل — پر اُس بغیر اپنے تو جی کو نہ بھائے گل
ہم طرح آشیاں کی نہ گلشن میں ڈالتے — معلوم ہوتی آگے جو ہم کو وفائے گل

نہ ٹک واشد ہوئی جب سے لگا دل — الٰہی غنچہ ہے پژمردہ یا دل
نہ اُس سے یاں تئیں آیا گیا حیف — رہے ہم جب تلک اُسمیں رہا دل
سبھوں سے میر بیگانے سے رہتے — جو ہوتا اس سے کچھ بھی آشنا دل

پھر امت میر سر اپنا گراں گوشوں کی مجلس میں — سُنے کوئی تو کچھ کہیے بھی اس کہنے کا کیا حاصل

دیوان چہارم

خون ہوا ہے چاک ہوا ہے جلتے جلتے داغ ہوا
خواہش اُس کو کیا ہے یارے کس کے لئے بیدل ہے دل
آنکھوں کی دیکھا دیکھی ہرگز دل کو اُس سے نہ لگنا تھا
جیسی سزا پہنچا دے کوئی اب اُس کے قابل ہے دل

حال فکر سخن میں کچھ نہ رہا — شعر میرا شعار ہے تا حال
حال مستی جوانی تھی سو گئی — میر اُس کا خمار ہے تا حال

آزردہ خاطری کا ہماری نہ کر عجب — اک عمر ہم رہا کئے ہیں مار مار دل

دیوان پنجم

دل دل لوگ کہا کرتے ہیں تم نے جانا کیا ہے دل
چشم بصیرت وا ہووے تو عجائب دید کی جا ہے دل

ہائے غیوری دل کی اپنے دماغ کیا ہے خود سر نے
جی ہی جس کے لئے جاتا ہے اُس سے بے پروا ہے دل

مت پوچھو کیوں زیست کرو ہو مردے سے افسردہ دل
ہجر میں اُس کے ہم لوگوں نے برسوں تک مارا ہے دل

میرؔ پریشاں دل کے غم میں کیا کیا خاطر داری کی
خاک میں ملتے کیوں نہ پھریں اب خوں ہو بہہ بھی گیا ہے دل

دیوانِ ششم

قیامت تھا مروّت آشنا دل — موئے پر بھی مرا اُس میں رہا دل
جسے مارا اُسے پھر کر نہ دیکھا — ہمارا طرفہ ظالم سے لگا دل
گئے وحشت سے باغ و راغ میں بھی — کہیں ٹھیرا نہ دُنیا سے اُٹھا دل
اسیری میں تو کچھ واشد کبھو تھی — رہا غمگیں ہوا جب سے رہا دل
نہ پوچھا اُن نے جس بن خوں ہوا سب — نہ سمجھا اُس کے کینے کی ادا دل
ہوا پژمردہ بے صبر و بے تاب — کریگا اس طرح کب تک وفا دل

ردیفِ میم

دیوانِ اوّل

اِس جستجو میں اور خرابی تو کیا کہیں — اتنی نہیں ہوئی ہے صبا دربدر کہ ہم

آئے تو ہو طبیباں تدبیر گر کرو تم — ایسا نہ ہو کہ میرے جی کا ضرر کرو تم
رنگِ شکستہ میرا بے لطف بھی نہیں ہے — اک آدھ رات کو تو یاں بھی سحر کرو تم
ہے پیچ دار از بس راہِ وصال و ہجراں — ان دو ہی منزلوں میں برسوں سفر کرو تم
روئے سخن کہاں تک غیروں کی اور آخر — ہم بھی تو آدمی ہیں ٹک منہ ادھر کرو تم

جاناکہ شغل رکھتے ہو تیر و کماں سے تم پر ہاں چلا کرو بھی کسو خستہ جاں سے تم
ہم اپنی چاک جیب کو سی رہتے یا نہیں پھاٹے میں پاؤں دینے کو آئے کہاں سے تم
اب دیکھتے ہیں خوب تو وہ بات ہی نہیں کیا کیا دگر نہ کہتے تھے اپنی زباں سے تم
قصہ مرا سنو گے تو جاتی رہے گی نیند آرام چشم مت رکھو اس داستاں سے تم
جتنے تھے کل تم آج نہیں پاتے اتنا ہم ہر دم چلے ہی جاتے ہو آب رواں سے تم
رہتے نہیں ہو بن گئے میر اس گلی میں رات کچھ راہ بھی نکالو سگ پاسباں سے تم

مدت ہوئی کہ چاک قفس ہی سے اب تو میر دکھلا رہے ہیں گل کو دل چاک چاک ہم

نہ پھر رکھیں گے تیری رہ میں پا ہم گئے گزرے ہیں آخر ایسے کیا ہم
کھنچے گی کب وہ تیغ ناز یارب رہے ہیں دیر سے سر کو جھکا ہم
نہ جانا یہ کہ کہتے ہیں کسے پیار رہیں بے لطفیاں ہی یاں تو باہم
تجھے کیا خال و زلف و خط سے دیکھیں ہوئے ہیں کتنے یہ کافر فراہم
مرض ہی عشق کا بے ڈول ہے کچھ بہت کرتے ہیں اپنی سی دوا ہم
کہیں پیوند ہوں یارب زمیں کے پھریں گے اس سے یوں کب تک جدا ہم
ہوس تھی عشق کرنے میں ولیکن بہت نادم ہوئے دل کو لگا ہم
کب آگے کوئی مرتا تھا کسی پر جہاں میں کر گئے رسم وفا ہم
تعارف کیا رہا اہل چمن سے ہوئے اک عمر کے پیچھے رہا ہم
موا جس کے لئے اس کو نہ دیکھا نہ سمجھے میر کا کچھ مدعا ہم

اگر راہ میں اس کی رکھا ہے گام گئے گزرے خضر علیہ السلام
قیامت ہی یاں چشم و دل سے رہی چلے بس تو واں جاکے کریئے قیام
نہ دیکھے جہاں کوئی آنکھوں کی اور نہ لیوے کوئی جس جگہ دل کا نام

گرچہ آوارہ جوں صبا ہیں ہم لیک لگ چلنے میں بلا ہیں ہم

کام کیا آتے ہیں گے معلومات — یہ تو سمجھے ہی نہ کہ کیا ہیں ہم
اے بتاں اس قدر جفا ہم پر — عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم
سرمہ آلودہ مت رکھا کر چشم — دیکھ اس وضع سے خفا ہیں ہم
کوئی خواہاں نہیں ہمارا میر — گویا جنس ناروا ہیں ہم

گیا جہان سے خورشید ساں اگرچہ میر — ولیک مجلس دنیا میں اس کی جا ہے گرم

دو چار دن تو اور بھی آ تو کراہتاً — اب ہو چکے ہیں روز کی تیری جفا سے ہم

دیوان دوم

کچھ نہ پوچھو بہک رہے ہیں ہم — عشق کی مے سے چھک رہے ہیں ہم
وقفۂ مرگ اب ضروری ہے — عمر طے کرتے تھک رہے ہیں ہم
کون پہنچے ہے بات کی تہ کو — ایک مدت سے بک رہے ہیں ہم
میر شاید لیں اس کی زلف سے کام — برسوں سے تو لٹک رہے ہیں ہم

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے — سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

جوں ابر میں روتا تھا جوں برق تو ہنستا تھا — صحبت نہ رہی یوں ہی اک آدھ برس ظالم

تربت سے ہماری نہ اٹھی گرد بھی ای میر — جی سے گئے لیکن نہ کیا ترک ادب ہم

آوارہ گرد باد سے تھے ہم پہ شہر میں — کیا خاک میں ملا ہے یہ دیوانہ پن تمام
اک گل زمیں نہ وقفے کے قابل نظر پڑی — دیکھا برنگ آب رواں یہ چمن تمام

گزرے ہے جی میں گہ وہ دہن گاہ وہ کمر   کیا جانیں لوگ رکھتے ہیں کیا کیا خیال ہم
جاتی نہیں اُٹھائی یہ اب سرگرانیاں   مقدور تک تو اپنے گئے ٹال ٹال ہم
وہ تو ہی ہے کہ مرتے ہیں سب تیرے طور پر   حور و پری کو جان کے کب ہیں دوال ہم
نقصان ہوگا اُس میں نہ ظاہر کہاں تلک   ہو دیں گے جس زمانے کے صاحب کمال تم

حکمِ آبِ رواں رکھے ہے حسن   بہتے دریا میں ہاتھ دھولو تم
کیا سراہیں ہم اپنی جنس کو ییک   دل عجب ہے متاع جو لو تم
جانا آیا ہے اب جہاں سے ہمیں   تھوڑی تو دُور ساتھ ہولو تم
آتے ہیں متصل چلے آنسو   آہ کب تک یہ موتی رو لو تم
رات گزری ہے سب تڑپتے میر   آنکھ لگ جائے ٹک تو سو لو تم

رکھا جس کو آنکھوں میں اک عمر اب   اُسے دیکھ رہتے ہیں حسرت سے ہم

اُڑتی ہے خاک شہر کی گلیوں میں اب جہاں   سونا لیا ہے گود میں بھر کر دہیں سے ہم
آوارہ گردی اپنی کھنچی میر طول پر   اب چاہیں گے دعا کسو عزلت نشیں سے ہم

دیوانِ سوم

اپنے خیال ہی میں گزرتی ہے اپنی عمر   پر کچھ نہ پوچھو سمجھے نہیں جاتے ہم سے ہم
طرفیں رکھے ہے ایک سخن چار چار میر   کیا کیا کہا کریں ہیں زبانِ قلم سے ہم

جو رہے یوں ہی غم کے مارے ہم   تو ہیں آج کل سدھارے ہم
بے مروت سے اپنی وحشت دُور   اُنس رکھتے ہیں تم سے پیارے ہم
زندگی بارِ دوش آج ہے یاں   دیکھیں گے کل جو ہونگے بارے ہم
میر آؤگے آپ میں بھی کبھو   سخت مشتاق ہیں تمہارے ہم

گئے عشق کی راہ سر کر قدم بلا پر چلے آئے ہر ہر قدم
عجب راہ پُر خوف و مشکل گزر اُٹھایا گیا ہم سے مر مر قدم
بہت مستیٔ عشق با لغزش تھی خدا جانے پڑتا تھا کیدھر قدم

یک بار ہوا دل کی تسلّی کا وہ باعث یہ کیا کہ اسی طور پہ ہر بار رہو تم

اُلجھاؤ دل کا جس سے ہی جھنجھلا کے اُس بغیر جھگڑا کیا کریں ہیں زمیں آسماں سے ہم

لیتا ہے میر عبرت کوئی جو دیکھتا ہے کیا یار کی گلی میں بے اعتبار ہیں ہم

یاں آپ ہی آپ آکر گم آپ میں ہوئے ہو پیدا نہیں کہ کس کی کرتے ہو جستجو تم

دیوان چہارم

بن میں چمن میں جی نہیں لگتا یار کدھر کو جاویں ہم
راہ خرابے سے نکلی گھر کی بستی میں کیوں کر جاویں ہم
کیسی کیسی خرابی کھینچی دشت و در میں سر مارا
خانہ خراب کہاں تک پھریئے ایسا ہو گھر جاویں ہم
خواہ نماز خضوع سے ہووے خواہ نیاز اک ہوئے دل
وقت رہا ہے بہت کم اب تو بارے کچھ کر جاویں ہم

شاید ہم سے ضد رکھتے ہو آتے نہیں ٹک ادھر تم
سب سے گلی کوچوں میں ملو ہو پھرتے رہو ہو گھر گھر تم
اس سے زیادہ ہوتا نہ ہوگا دُنیا میں بھی نچلا پن
سُون کیسے بیٹھے رہتے ہو حال ہمارا سُن کر تم

لطف و مہر و خشم و غضب ہر صورت میں لاحق ہیں
حق میں ہمارے کر گزرو بھی جو کچھ جانو بہتر تم
چُھپکے سے کچھ آ جاتے ہو آنکھیں بھر بھر لاتے ہو
میر گزرتی کیا ہے دل پہ کڑھا کرو ہو اکثر تم

شورش دیوانگی اُس کی نہیں جانتی لیک   ایک دو دن میر کو زنجیر کر دیکھیں گے ہم

صبر کیا جاتا نہیں ہم سے رہ کے جدا نہ ستاؤ تم
پاؤں کا رکھنا گرچہ اِدھر کو عار سی ہے پر آؤ تم
جس کے تئیں پروا ہو کسی کی آنا جانا اُس کا ہے
نیک ہو یا بد حال ہمارا تم کو کیا ہے جاؤ تم
چُپ ہیں کچھ جو نہیں کہتے ہم کارِ عشق کے حیراں ہیں
سوچو حال ہمارا ٹک تو بات کی تہ کو پاؤ تم
میر کو وحشت ہے گی قیامت واہی تباہی بکتے ہیں
حرف و حکایت کیا مجنوں کی دل میں کچھ مت لاؤ تم

ظلم ہوئے ہیں کیا کیا ہم پر صبر کیا ہے کیا کیا ہم
آن لگے ہیں گور کنارے اُس کی گلی میں جا جا ہم
میر فقیر ہوئے تو اک دن کیا کہتے ہیں بیٹے سے
عمر رہی ہے تھوڑی اسے اب کیونکر کاٹیں بابا ہم

اک آدھ دن سُنوگے ستا کے رہ گئے ہم   کانپا کرے ہے جی سو ٹھٹھرائے رہ گئے ہم

مُرید پیرِ خرابات یوں نہ ہوتے میر   سمجھتے عارف اگر اور بھی کسو کو ہم

عشق بتوں سے اب نہ کریں گے عہد کیا ہے خدا سے ہم
آجاویں جو یہ ہرجائی تو بھی نہ جاویں جا سے ہم

چپکی کیا انواع اذیت عشق میں کھینچی جاتی ہے
دل تو بھرا ہے اپنا تو بھی کچھ نہیں کہتے حیا سے ہم

چاہیئے یوں تھا بگڑی صحبت آپ ہی آ کے بناتے تم
رحلت کرنے سے آگے مجھ کو دیکھنے آتے جاتے تم

کیا دن تھے وے دیکھتے تم کو نیچی نظریں کر لیتا
شرما شرما لوگوں سے جب آنکھیں مجھکو دکھاتے تم

چہرہ زرد بجا ہے سارا عشق میں غم کا مارا ہوں
رنگ یہ دیکھا ہوتا تو دل میرؔ کہیں نہ لگاتے تم

صبر بہت تھا ایک سمیں میں جا سے اپنی نہ جاتے ہم
کس کس ناز سے وے آتے پر آنکھ نہ اُن سے ملاتے ہم

کعبہ سے کر نذر اُٹھے سو خرچ راہ لے ولئے ہوتی
ورنہ صنم خانے میں جا زنّار گلے سے بندھاتے ہم

دیوان پنجم

عشق ہمارے درپئے جاں ہے آئے گھر سے نکل کر ہم
سر پر دیکھا یہی فلک ہے جاویں کیدھر چل کر ہم

عشق جو ہوتا واقع میں تو سید سے جاتے تیغ تلے
راہ ہوس کی پکڑ لی ہم نے یعنی چلے ہیں ٹل کر ہم

ہائے جوانی شور کناں باہوس کو اُسکے پھرتے تھے
اب چپ بیٹھ رہے ہیں یکسُو ہاتھ بہت سے مل کر ہم

ڈ دل لگائے بہتیرے پہ ڈھب پہ کبھو نہیں آتے تم
آنا یک شو کب دیکھو ہو ایدھر آتے جاتے تم

ہر صورت کو دیکھ رہو ہو ہر کوچے کو جھانکو ہو
آگے عشق کیا ہوتا تو پھرتے جی نہ کھپاتے تم

چاہت آفت اُلفت کلفت مہر و وفا و رنج و بلا
عشق ہی کے سب نام ہیں یہ دل کاش کہیں نہ لگاتے تم

دونوں طرف سے کشش رہتی تھی نیا نیا تھا عشق اپنا
دھوپ میں آتے داغ ہوئے تو گرمی سے گل کھاتے تم

کیدھر اب وہ یک رنگی جو دیکھ نہ سکتے دل تنگی
رُکتے پاتے ٹک جو ہمیں تو دیر تلک گھبراتے تم

بعد نماز دُعائیں کیں سو میر فقیر ہوئے تم تو
ایسی تمنا جاتوں سے آگے کاش کہ ہاتھ اُٹھاتے تم

خاک برابر عاشق ہیں اس کوچے میں ناچاری سے
گھر ہوں خانہ خرابوں کے تو اپنے بھی گھر جاویں ہم

ہم تو یہی کہتے تھے ہمیشہ دل کو کہیں نہ لگاؤ تم
کیا کہیئے نہ ہماری سُنی اب بیٹھے رنج اُٹھاؤ تم

صبر کرو بے تاب رہو خاموش پھرو یا شور کرو
کس کو یاں پروا ہے کسو کی ٹھیرو آؤ جاؤ تم

دانے کہ اس ہجراں کُشتے نے باغ سے جاتے ٹک نہ سُنا
گل نے کہا جو خوبی سے اپنی کچھ تو ہمیں فرماؤ تم

در پہ حرم کے کشود نہیں تو دیر میں جا کر کافر ہو
قشقے کھینچو پوتھی پڑھو زنار گلے سے بندھاؤ تم

بود نبود ثبات رکھے تو یہ بھی اک بابت ہے میر
اس صفحے میں حرف غلط ہیں کاش کہ ہم کو مٹاؤ تم

کہا سُنتے تو کاہے کو کسو سے دل لگاتے تم
نہ جاتے اُس طرف تو ہاتھ سے اپنے نہ جاتے تم

یہ حُسن خلق تم میں عشق سے پیدا ہوا ورنہ
گھڑی کے روٹھے کو دو دو پہر تک کب مناتے تم

ہم نہ کہا کرتے تھے تم سے دل نہ کسو سے لگاؤ تم
جی دینا پڑتا ہے اس میں ایسا نہ ہو پچھتاؤ تم

سو نہ سنی تم نے تو ہماری آنکھیں تکو ہیں لگ پڑیاں
رو رو کر سر دھنتے ہو اب بیٹھے رنج اٹھاؤ تم

ہر کوچے میں کھڑے رہ رہ کر ایدھر اودھر دیکھو ہو
ہائے خیال یہ کیا ہے تم کو جانے بھی دو اب آؤ تم

فاش نہ کریے راز محبت جانیں اسمیں جاتی ہیں
درد دل آنکھوں سے ہر ایک تا مقدور چھپاؤ تم

تظلم نہ کھینچے الم پر الم
ترحم کہ مت کر ستم پر ستم

جو سو بسر کے ہو آؤ مانوں نہ میں
عبث کھاتے ہو تم قسم پر قسم

خطرناک تھی وادی عشق میر
گئے اس پہ بھی ہم قدم بر قدم

دیوان ششم

عشق کیا ہے اُس گل کا یا آفت لائے سر پر ہم
جھانکتے اُس کو ساتھ صبا کے صبح پھریں ہیں گھر گھر ہم

پوچھتے راہ شکستہ دل ہی جا نکلے تھے کعبے میں
سوچ وہاں تو گزرا جی میں آئے کدھر سے کیدھر ہم

برسوں خس و خاشاک پہ سوئے مدت گلخن تابی کی
بخت نہ جاگے جو اُس سے ہوں ایک بھی شب ہم بستر ہم

روز بسر ہے حالت عشقی جیسے ہوں بیمار اجل
ہے نہ دوا نے کوئی معالج کیونکر ہوں گے بہتر ہم

اب تو ہماری طرف سے اتنا دل پتھر مت کریو
سختی سے ایام کی اب تک جیتے رہے ہیں مر مر ہم

نہ ہوئے تھے ابھی جواں افسوس
صبر مغفور و طاقت مرحوم

جب غبار اپنے دل کا نکلے ہے
دیر رہتی ہے آندھی کی سی دھوم

ہم دام بہت وحشی طبیعت تھے اُٹھے سب
تھی چوٹ جو دل پر سو گرفتار ہوئے ہم

گھٹ گھٹ کے جہاں میں رہے ہے جب میر سے مرتے
تب جا کے یہاں واقف اسرار ہوئے ہم

دے ہم ہیں جن کو کہیے آزار دیدہ مردم
اُلفت گزیدہ مردم کلفت کشیدہ مردم

تھے دست بستہ حاضر خدمت میں میر گویا
سیمیں تنوں کے عاشق ہیں زر خریدہ مردم

دھوپ میں جلتے ہیں پہروں آگے اسکے میر جی
رفتگی سے دل کی شمشیر سے ہیں گنہگاروں میں ہم

ردیف نون

دیوان اوّل

بے کلی بے خودی کچھ آج نہیں
ایک مدت سے وہ مزاج نہیں

درد اگر یہ ہے تو مجھے بس ہو
اب دوا کی بھی احتیاج نہیں

ہم نے اپنی سی کی بہت لیکن
مرضِ عشق کا علاج نہیں

شہرِ خوبی کو خوب دیکھا میر
جنسِ دل کا کہیں رواج نہیں

ہنس کر کبھو بلایا تو برسوں تک رلایا
اس کی ستم ظریفی کس کے تئیں دکھاؤں

آسودگی تو معلوم اے میر جیتے جی یاں
آرام تب ہی پاؤں جب جی سے ہاتھ اٹھاؤں

اس طرح دل گیا کہ اب تک ہم
بیٹھے روتے ہیں ہاتھ ملتے ہیں

دمِ آخر ہے بیٹھ جا مت جا
صبر کر ٹک کہ ہم بھی چلتے ہیں

تیرے بے خود جو ہیں سو کیا چیتیں
ایسے ڈوبے کہیں اچھلتے ہیں!

فتنہ در سر بتانِ حشر خرام
ہائے رے کس ٹھسک سے چلتے ہیں

نظر اٹھتی نہیں کہ جب خوباں
سوتے سے اٹھ کے آنکھ ملتے ہیں

شمع رو موم کے بنے ہیں مگر
گرم ٹک ملیئے تو پگھلتے ہیں

میر صاحب کو دیکھیئے جو بنے
اب بہت گھر سے کم نکلتے ہیں

ناکام رہنے ہی کا تمہیں غم ہے آج میر
بہتوں کے کام ہو گئے ہیں کل تمام یاں

نہ گیا خیالِ زلفِ سیہ جفا شعاراں
نہ ہوا کہ صبح ہووے شبِ تیرہ روزگاراں

تو جہاں سے دل اٹھایاں نہیں رسم دردمندی
کسی نے بھی یوں نہ پوچھا ہوئے خاک یاں ہزاراں

یہ سُنا تھا میرؔ ہم نے کہ فسانہ خواب لائے — تری سرگزشت سُن کر گئے اور خواب یاراں

اُس کے کوچے سے جو اُٹھ اہلِ وفا جاتے ہیں — تا نظر کام کرے رُو بقفا جاتے ہیں

متصل روتے ہی رہیے تو بجھے آتشِ دل — ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں

وقتِ خوش اُن کا جو ہم بزم ہیں تیرے ہم تو — در و دیوار کو احوال سُنا جاتے ہیں

جائیگی طاقتِ پا آہ تو کریے گا کیا — اب تو ہم حال کبھو تم کو دکھا جاتے ہیں

ایک بیمارِ جُدائی ہوں میں آپھی تس پر — پُوچھنے والے جُدا جان کو کھا جاتے ہیں

میرؔ صاحب بھی ترے کوچے میں شب آتے ہیں لیک — جیسے دریوزہ گری کرنے گدا جاتے ہیں

تُو پری شیشے سے نازک ہے نہ کر دعویٰ مہر — دل ہیں پتھر کے اُنہوں کے جو وفا کرتے ہیں

یہ زمانہ نہیں ایسا کہ کوئی زیست کرے — چاہتے ہیں جو بُرا اپنا بھلا کرتے ہیں

محض ناکارہ بھی مت جان ہمیں تو کہ کہیں — ایسے ناکام بھی بے کار پھرا کرتے ہیں

تجھ بن اس جانِ مصیبت زدہ غمدیدہ پہ ہم — کچھ نہیں کرتے تو افسوس کیا کرتے ہیں

کیا کہیں میرؔ جی ہم تم سے معاش اپنی غرض — غم کو کھایا کریں ہیں لوہو پیا کرتے ہیں

مستوجبِ ظلم و ستم و جور و جفا ہوں — ہر چند کہ جلتا ہوں پہ سرگرمِ وفا ہوں

آتے ہیں مجھے خوب سے دونوں ہنرِ عشق — رونے کے تئیں آندھی ہوں کڑھنے کو بلا ہوں

اس گلشنِ دُنیا میں شگفتہ نہ ہوا میں — ہوں غنچۂ افسردہ کہ مردودِ صبا ہوں

دامن نہ جھٹک ہاتھ سے میرے کہ ستم گر — ہوں خاکِ سرِ راہ کوئی دم میں ہوا ہوں

گو طاقت و آرام خور و خواب گئے سب — بارے یہ غنیمت ہے کہ جیتا تو رہا ہوں

اِتنا ہی مجھے علم ہے کچھ میں بھی بہر چیز — معلوم نہیں خوب مجھے بھی کہ میں کیا ہوں

تب گرمِ سخن کہنے لگا ہوں میں کہ اک عمر — جوں شمع سرِ شام سے تا صبح جلا ہوں

سینہ تو کیا فضلِ الٰہی سے سبھی چاک — ہے وقتِ دُعا میرؔ کہ اب دل کو لگا ہوں

جنسِ گراں کو تجھ سے جو لوگ چاہتے ہیں — وے روگ اپنے جی کو ناحق بسا ہتے ہیں

اس مے کدے میں ہم بھی مدت سے ہیں ولیکن
خمیازہ کھینچتے ہیں ہر دم جماہتے ہیں

ناموس دوستی سے گردن بندھی ہے اپنی
جیتے ہیں جب تلک ہم تب تک نباہتے ہیں

سہل اس قدر نہیں ہے مشکل پسندی میری
جو تجھ کو دیکھتے ہیں مجھ کو سراہتے ہیں

وے دن گئے کہ راتیں نالوں سے کاٹتے تھے
بے ڈول میر صاحب اب کچھ کراہتے ہیں

تمہیں بھی چاہیئے ہے کچھ تو پاس چاہت کا
ہم اپنی اور سے یوں کب تلک نباہ کریں

ہمیشہ کون تکلف ہے خوب رو یوں کا
گزار ناز سے ایدھر بھی گاہ گاہ کریں

اگر اٹھیں گے اسی حال سے تو کہیو تو
جو روز حشر تجھی کو نہ عذر خواہ کریں

بڑی بلا ہیں ستم کشتۂ محبت ہم
جو تیغ برسے تو سر کو نہ کچھ پناہ کریں

اگرچہ سہل ہیں پر دیدنی ہیں ہم بھی میر
ادھر کو یار تامل سے گر نگاہ کریں

تربت سے عاشقوں کے نہ اٹھا کبھو غبار
جی سے گئے نہ دل سے گئیں رازداریاں

اب کس کس اپنی خواہش مردہ کو روئیے
تھیں ہم کو اس سے سینکڑوں امیدواریاں

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں!

کیا جانتے تھے ایسے دن آ جائیں گے شتاب
روتے گزرتیاں ہیں ہمیں راتیں ساریاں

گل نے ہزار رنگ سخن سر کیا ولے
دل سے گئیں نہ باتیں تری پیاری پیاریاں

بچ جاتا ایک رات جو کٹ جاتی اور میر
کاٹی تھیں کوہکن نے بہت راتیں بھاریاں

کاسۂ سر کو لئے مانگتا دیدار پھرے
میر وہ جان سے بیزار گدا میں ہی ہوں

غافل نہ رہیو ہم سے کہ ہم وے نہیں رہے
ہوتا ہے اب تو حال عجب ایک آن میں

زباں رکھ غنچہ ساں اپنے دہن میں
بندھی مٹھی چلا جا اس چمن میں

رکھا کر ہاتھ دل پر آہ کرتے
نہیں رہتا چراغ ایسی پون میں

جن کے لئے اپنے تو یوں جان نکلتے ہیں — اس راہ میں وے جیسے انجان نکلتے ہیں
مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں — تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں
جا اُس سے بھی جاتے ہو مُنہ سے بھی خشن ہو کر — وے حرف نہیں ہیں جو شایان نکلتے ہیں
سو کاہے کو اپنی تو جوگی کی سی پھیری ہے — برسوں میں کبھو ایدھر ہم آن نکلتے ہیں
ان آئینہ رُویوں کے کیا میر بھی عاشق ہیں — جب گھر سے نکلتے ہیں حیران نکلتے ہیں

تُو گلی میں اُس کی جا آ و لے اسے صبا نہ چنداں — کہ گڑے ہوئے پھر اُکھڑیں دلِ چاکِ دردمنداں
کھُلیں آنکھیں میں جو دیکھا سو غم اور چشمِ گریاں — کیسے کہتے ہیں نہ جانا دلِ شاد و روئے خنداں!

مرنے سے ہم ہمارے خاطر نچنت رکھو — اس کام کا بھی ہم کچھ اسلوب کر چکے ہیں
کیا جانیئے کہ کیا ہے لیے میر وجہ ضد کی — سو بار ہم تو اس کو محجوب کر چکے ہیں

کیا تجھ کو بھی جنوں تھا کہ جامے میں تیرے میر — سب کچھ بچا ہے ایک گریبان ہی نہیں

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں — اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں
عجز و نیاز اپنا اپنی طرف ہے سارا — اس مُشتِ خاک کو ہم مسجود جانتے ہیں
صورت پذیر ہم بن ہرگز نہیں وے معنے — اہلِ نظر ہمیں کو معبود جانتے ہیں
اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے — اِس ر[illegible] کو ولیکن معدود جانتے ہیں

جا ہے ہے آج ہوں میں ہفت آسماں کے اُوپر — دل کے [illegible] میں بھی کتنی شتابیاں ہیں
جی بکھرے دل ڈہے ہی سر بھی گرا پڑے ہی — خانہ خراب تجھ بن کیا کیا خرابیاں ہیں

اب کچھ ہمارے حال پہ تم کو نظر نہیں — یعنی تمہاری ہم سے وے آنکھیں نہیں رہیں
اس بزم میں چراغ بجھے تھے جو یار میر — اُن کے فروغِ باغ میں گُل ہیں کہیں کہیں

تو طرۂ جاناں سے جا ہے ہر اک مقصد　　برسوں سے پڑے ہم تو اے میر لٹکتے ہیں

پہنچے نہیں کہیں کہ نہیں واں سے اٹھ چلے　　القصہ ایک عمر سے ہم ہیں گے راہ میں
بیٹھے تھے میر یار کے دیدار کو سو ہم　　اپنا یہ حال کر کے اُٹھے اِک نگاہ میں

نہ تنگ کر اسے اے فکرِ روزگار کہ میں　　دل اُس سے دم کے لئے مستعار لایا ہوں
چلا نہ اُٹھ کے وہیں چُپکے چُپکے پھر تو میر　　ابھی تو اُس کی گلی سے پکار لایا ہوں

جفائیں دیکھ لیاں بے وفائیاں دیکھیں　　بھلا ہوا کہ تری سب بُرائیاں دیکھیں
ترے وصال کے ہم شوق میں ہو آوارہ　　عزیز دوست سبھوں کی جُدائیاں دیکھیں

آؤ یادِ بتاں پہ بھول نہ جاؤ　　یہ تغافل شعار ہوتے ہیں
ہفت اقلیم ہر گلی ہے کہیں　　دلّی سے بھی دیار ہوتے ہیں
اُس کے نزدیک کچھ نہیں عزت　　میر جی یوں ہی خوار ہوتے ہیں

گفتگو ناقصوں سے ہے ورنہ　　میر جی بھی کمال رکھتے ہیں

بارہا وعدوں کی راتیں آئیاں　　طالعوں نے صبح کر دکھلائیاں
عشق میں ایذائیں سب سے پائیاں　　رہ گئے آنسو تو آنکھیں آئیاں
ایک بھی چشمک نہ اُس مہ کی سی کی　　آنکھیں تاروں نے بہت جھمکائیاں
پاس مجھ کو بھی نہیں ہے میر اب　　دُور پہنچی ہیں مری رُسوائیاں

دیکھیں تو تیری کب تک یہ کج ادائیاں ہیں　　اب ہم نے بھی کسو سے آنکھیں لڑائیاں ہیں
ٹک سُن کہ سو برس کی ناموس خامشی کھو　　دو چار دل کی باتیں اب مُنہ پر آئیاں ہیں

خوش باشی و تنزیہ و تقدس تھی مجھے میر ۔۔ اسباب بڑے یوں کہ کئی روز سے یاں ہوں

وفا پیشگی قیس تک تھی بھی کچھ کچھ ۔۔ اب اس طور کے لوگ کم دیکھتے ہیں
کہاں تک بھلا روؤگے میر صاحب ۔۔ اب آنکھوں کے گرد اک ورم دیکھتے ہیں

بہت ہی اپنے تئیں ہم تو خوار پاتے ہیں ۔۔ وہ کوئی اور ہیں جو اعتبار پاتے ہیں

اے عدم ہونے والو تم تو چلو ۔۔ ہم بھی اب کوئی دم میں آتے ہیں

آتا ہے دل میں حال بد اپنا بھلا کہوں ۔۔ پھر آپ ہی آپ سوچ کے کہتا ہوں کیا کہوں

کھودیں ہیں نیند میری مصیبت بیانیاں ۔۔ تم بھی تو ایک رات سنو یہ کہانیاں
یہ بے قراریاں نہ کبھو اُن نے دیکھیاں ۔۔ جاں کاہیاں ہماری بہت سہل جانیاں
مارا مجھے بھی سان کے غیروں میں اُن نے میر ۔۔ کیا خاک میں ملائیں مری جاں فشانیاں

کیفیتیں اُٹھی ہیں یہ کب خانقاہ میں ۔۔ بدنام کر رکھا ہے خرابات کے تئیں
ہم جانتے ہیں یا کہ دل آشنا زدہ ۔۔ کہیئے سو کس سے عشق کے حالات کے تئیں
سید ہو یا چمار ہو اس جا وفا ہے شرط ۔۔ کب عاشقی میں پوچھتے ہیں ذات کے تئیں
آخر کے یہ سلوک ہم اب تیرے دیکھ کر ۔۔ کرتے ہیں یاد پہلی ملاقات کے تئیں
آنکھوں نے میر صاحب و قبلہ ورم کیا ۔۔ حضرت بکا کیا نہ کرو رات کے تئیں

دیا عاشق نے جی تو عیب کیا ہے ۔۔ یہی میر اک ہنر ہوتا ہے ہم میں

چاہتے ہیں یہ بتاں ہم پہ کہ بے داد کریں ۔۔ کس کے ہو ں کس سے کہیں کس کنے فریاد کریں
کعبہ ہوتا ہے دوانوں کا مری گور سے دشت ۔۔ مجھ سے دو اور گڑیں یاں تو سب آباد کریں

ریختہ خوب ہی کہتا ہے جو انصاف کریں
چاہیئے اہلِ سخن میر کو استاد کریں

ملنے لگے ہو دیر دیر دیکھیے کیا ہے کیا نہیں
تم تو کرو ہو صاحبی بندے میں کچھ رہا نہیں

شکوہ کروں ہوں بخت کا اتنے غضب نہ ہو بتاں
مجھ کو خدا نخواستہ تم سے تو کچھ گلا نہیں

ایک فقط ہے سادگی تس پہ بلائے جاں ہے تو
عشوہ کرشمہ کچھ نہیں آن نہیں ادا نہیں

نازِ بتاں اٹھا چکا دیر کو میر ترک کر
کعبے میں جا کے رہ میاں تیرے مگر خدا نہیں

خوب رُو سب کی جان ہوتے ہیں
آرزوئے جہان ہوتے ہیں

کبھو آتے ہیں آپ میں تجھ بن
گھر میں ہم میہمان ہوتے ہیں

جنوں میرے کی باتیں دشت اور گلشن میں جب چلیاں
نہ چوبِ گُل نے دم مارا نہ چھڑیاں بید کی ہلیاں

دوانہ ہو گیا تو میر آخر ریختہ کہہ کہہ
نہ کہتا تھا میں اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں

دامن پہ تیرے گرد کا کیونکر اثر نہیں
ہم دل جلوں کی خاک جہاں میں کدھر نہیں

اتنا رقیبِ خانہ برانداز سے سلوک
جب آ نکلتے ہیں تو سُنے ہیں کہ گھر نہیں

داماں و جیب و دیدہ و مژگان و آستین
اب کون سا رہا ہے کہ ان میں سے تر نہیں

آتا ہی میرے کوچے میں ہوتا جو میر یاں
کیا جانیے کدھر کو گیا کچھ خبر نہیں

تجھے بھی یار اپنا یوں تو ہم ہر بار کہتے ہیں
و لے کم ہیں بہت وے لوگ جن کو یار کہتے ہیں

سمجھ کر ذکر کر آسودگی کا مجھ سے اے ناصح
وہ میں ہی ہوں کہ جس کو عافیت بیزار کہتے ہیں

عجب ہوتے ہیں شاعر بھی میں اس فرقے کا عاشق ہوں
کہ بے دھڑکے بھری مجلس میں یہ اسرار کہتے ہیں

مزے ان کے اٹھا لیکن نہ یہ سمجھیں تو بہتر ہے
کہ خوباں بھی بہت اپنے تئیں عیار کہتے ہیں

کیا کہوں میر فراموش کیا اُن نے تجھے
میں تو تقریب بھی کی پر تو اُسے یاد نہیں

عالم میں لوگ ملنے کی گوں اب نہیں رہے — ہر چند ایسا ویسا تو عالم بہت ہے یاں
ویسا چمن سے سادہ نکلتا نہیں کوئی — رنگینی ایک اور خم و چم بہت ہے یاں
میرے ہلاک کرنے کا غم ہے عبث تمہیں — تم شاد زندگانی کرو غم بہت ہے یاں
شاید کہ کام صبح تک اپنا کھنچے نہ میرؔ — احوال آج شام سے درہم بہت ہے یاں

بات میں غیروں کو چپ کر دوں ولیکن کیا کروں — وہ سخن نشنو تنک میرا کہا کرتا نہیں

منصور کی حقیقت تم نے سنی ہی ہوگی — حق جو کہے ہے اس کو یاں دار کھینچتے ہیں
شکوہ کروں تو کس سے کیا شیخ کیا برہمن — ناز اس بلائے جاں کے سب یار کھینچتے ہیں

سمجھا تنک نہ اپنے تو سود و زیاں کو میں — مانا کیا خدا کی طرح ان بتاں کو میں
عاشق ہے یا مریض ہے پوچھو تو میرؔ سے — پاتا ہوں زرد روز بروز اس جواں کو میں

کر نالہ کشی کب تئیں اوقات گزاریں — فریاد کریں کس سے کہاں جا کے پکاریں
ہر دم کا بگڑنا تو کچھ اب چھوٹا ہے اُن سے — شاید کبھی ناکام کا بھی کام سنواریں
جس جا کہ خس و خار کے اب ڈھیر لگے ہیں — یاں ہم نے انہیں آنکھوں سے دیکھی ہیں بہاریں
منظور ہے کب سے سر شوریدہ کا دینا — چڑھ جائے نظر کوئی تو یہ بوجھ اُتاریں
ناچار ہو رخصت جو منگا بھیجی تو بولا — میں کیا کروں جو میرؔ جی جاتے ہیں - سدھاریں

یوں ہی حیران و خفا جوں غنچۂ تصویر ہوں — عمر گزری پر نہ جانا میں کہ کیوں دل گیر ہوں
اس قدر بے ننگ خبطوں کو نصیحت شیخ جی — باز آؤ ورنہ اپنے نام کا میں میرؔ ہوں

خلاف ان اور خوباں کے سدا یہ جی میں رہتا ہے — یہی تو میرؔ اک خوبی ہے معشوقِ خیالی میں

آہ اور اشک ہی سدا ہے یاں — روز برسات کی ہوا ہے یاں

بے خبر شرط میرؔ شنا ہے — تجھ سے آگے یہ کچھ ہوا ہی یاں
موت مجنوں کو بھی یہیں آئی — کوہکن کل ہی مر گیا ہے یاں

جہاں اب خار زاریں ہو گئی ہیں — یہیں آگے بہاریں ہو گئی ہیں
سُنا جاتا ہے شہرِ عشق کے گرد — مزاریں ہی مزاریں ہو گئی ہیں

خوش نہ آئی تمہاری چال ہمیں — یوں نہ کرنا تھا پائمال ہمیں
حال کیا پوچھ پوچھ جاتے ہو — کبھو پاتے بھی ہو بحال ہمیں
ترکِ سبزانِ شہر کریے اب — بس بہت کر چکے نہال ہمیں
وجہ کیا ہے کہ میرؔ منہ پہ ترے — نظر آتا ہے کچھ ملال ہمیں

تسلی تو ہو دلِ بے قرار خوباں سے — یہ کاش ملنے نہ ملنے کا کچھ قرار کریں
رہی سہی بھی گئی عمر تیرے پیچھے یار — یہ کہہ کہ آہ ترا کب تک انتظار کریں
ہوا ہوں خاکِ رہ اس واسطے کہ خوباں میرؔ — گزار گور پہ میری بھی ایک بار کریں

تنکا بھی اب رہا نہیں شرمندگی ہے جو — گر پڑ کے برق یا دے مرے آشیاں کے تئیں
ہم تو ہوئے تھے میرؔ سے اُس دن ہی نا اُمید — جس دن سُنا کہ اُن نے دیا دل بتاں کے تئیں

مُوئے سہتے سہتے جفا کاریاں — کوئی ہم سے سیکھے وفا داریاں
ہماری تو گزری اسی طور عمر — یہی نالہ کرنا یہی زاریاں
گیا جان سے اک جہاں لیک شوخ — نہ تجھ سے گئیں یہ دل آزاریاں
خط و کاکل و زلف و انداز و ناز — ہوئیں دامِ رہ صد گرفتاریاں
کیا دردوغم نے مجھے نا اُمید — کہ مجنوں کو یہ ہی تھیں بیماریاں
تری آشنائی سے ہی حد ہوئی — بہت کی تھیں دُنیا میں ہم یاریاں
نہ بھائی ہماری تو قدرت نہیں — کھنچیں میرؔ تجھ سے ہی یہ خواریاں

دن نہیں رات نہیں صبح نہیں شام نہیں
وقت ملنے کا مگر داخلِ ایام نہیں

بے قراری جو کوئی دیکھے ہو سو کہتا ہو
کچھ تو ہے میرؔ کہ اک دم تجھے آرام نہیں

کیا ظلم کیا تعدّی کیا جور کیا جفائیں
اس چرخ نے کیاں ہیں ہم سے بہت ادائیں

اک رنگ گل نے رہنیاں گو نہیں کیا ہے
اس گلشنِ جہاں میں ہیں مختلف ہوائیں

نازِ بتانِ سادہ ہے اللہ اللہ لے میرؔ
ہم خط سے مٹ گئے پر انکے نہیں ہیں کھائیں

آرزوئیں ہزار رکھتے ہیں
تو بھی ہم دل کو مار رکھتے ہیں

غیر ہی موردِ عنایت ہے
ہم بھی تو تم سے پیار رکھتے ہیں

نہ نگہ نے پیام نے وعدہ
نام کو ہم بھی یار رکھتے ہیں

چوٹٹے دل کے ہیں بتاں مشہور
بس یہی اعتبار رکھتے ہیں

پھر بھی کرتے ہیں میرؔ صاحب عشق
ہیں جواں اختیار رکھتے ہیں

رونا آنکھوں کا روئیے کب تک
پھوٹنے ہی کے باب ہیں دونوں

دیوان دوم

مدعی مجھ کو کھڑے صاف برا کہتے ہیں
چپکے تم سنتے ہو بیٹھے اسے کیا کہتے ہیں

دیکھے خوباں کے بجا دل نہیں رہتا ہرگز
لوگ جو کچھ انہیں کہتے ہیں بجا کہتے ہیں

عشق کے شہر کی کچھ رسم کے ہیں کشتے ہم
دردِ جاں کاہ جو ہو اس کو دوا کہتے ہیں

حسن تو ہے ہی کرو لطفِ زباں بھی پیدا
میرؔ کو دیکھو کہ سب لوگ بھلا کہتے ہیں

نہ نکلا دوسرا ویسا جہاں میں
وہی اک جنس ہے اس کاروان میں

اگر وہ بت نہ جانے تو نہ جانے
ہمیں سب جانتے ہیں ہندوستاں میں

نیا آنا فآنا اس کو دیکھا
جدا تھی شان اس کی ہر زماں میں

کوئی بجلی کا ٹکڑا اب تلک بھی
پڑا ہو گا ہمارے آشیاں میں

پھرے ہے چھانتا ہی خاک اے میر — ہوس کیا ہے مزاجِ آسماں میں

غریبانہ کوئی شب روز کریاں — ہمیشہ کون رہتا ہے سرا میں
ملے برسوں وہی بیگانہ ہے وہ — ہنر ہے یہ ہمارے آشنا میں
اگرچہ خشک ہیں جیسے پرِ کاہ — اڑے ہیں میر ہم لیکن ہوا میں

دیر و حرم سے تو تو ٹک گرم نا نہ نکلا — ہنگامہ ہو رہا ہے اب شیخ و برہمن میں
آ جاتے شہر میں تو جیسے کہ آندھی آئی — کیا وحشتیں اٹھائیں ہم نے دوانے پن میں

جانا ادھر سے میرے ہو دیسا ادھر کے تئیں — بیماریوں میں جیسے بدلتے ہیں گھر کے تئیں

کیا کہوں اوّل بخود تو دیر میں آتا ہوں میں — پھر جو یاد آتا ہے وہ چپکا سا رہ جاتا ہوں میں

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے — کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

دم بدم اس ڈھب سے رونا دیر کر آیا ہمیں — کیا لہو اپنا پیا تب یہ ہنر آیا ہمیں
کر چلا بے خود غمِ زلفِ درازِ دلبراں — دور کا اے میر درپیش اب سفر آیا ہمیں

ساتھ اس حسن کے دیتا تھا دکھائی وہ بدن — جیسے جھمکے ہے پڑا گوہرِ تر پانی میں

اب کی ہمت صرف کر جو اس سے جی اچٹے مرا — پھر دعا اے میر مت کریو اگر ایسا کروں

عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں — اس سے آنکھیں لگیں تو خواب کہاں
عشق کا گھر ہے میر سے آباد — ایسے پھر خانماں خراب کہاں

یارو مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں
اب دو تو جام خالی ہی دو میں نشے میں ہوں

ایک ایک قرط دور میں یوں ہی مجھے بھی دو
جام شراب پُر نہ کرو میں نشے میں ہوں

مستی سے درہمی ہے مری گفتگو کے بیچ
جو چاہو تم بھی مجھ کو کہو میں نشے میں ہوں

یا ہاتھوں ہاتھ لو مجھے مانند جام مے
یا تھوڑی دور ساتھ چلو میں نشے میں ہوں

معذور ہوں جو پاؤں مرا بے طرح پڑے
تم سرگراں تو مجھ سے نہ ہو میں نشے میں ہوں

بھاگی نماز جمعہ تو جاتی نہیں ہے کچھ
چلتا ہوں میں بھی ٹک تو رہو میں نشے میں ہوں

نازک مزاج آپ قیامت ہیں میرؔ جی
جوں شیشہ میرے مُنہ نہ لگو میں نشے میں ہوں

کرتے ہیں جو کہ جی میں ٹھانے ہیں
خوبرو کس کی بات مانے ہیں

میں تو خوباں کو جانتا ہی ہوں
پر مجھے یہ بھی خوب جانے ہیں

جا ہمیں اس گلی میں گر رہنا
ضعف و بے طاقتی بہانے ہیں

پوچھ اہلِ طرب سے شوق اپنا
وے ہی جانے جو خاک چھانے ہیں

اب تو افسردگی ہی ہے ہر آن
وے نہ ہم ہیں نہ وے زمانے ہیں

عشق کرتے ہیں اس پری رُو سے
میرؔ صاحب بھی کیا دوانے ہیں

بلا آفت ہے کچھ دل پر کہ ایسا رنگ ہے آن کا
کسو بے مہر کے تئیں میرؔ شاید پیار کرتے ہیں

اب کی جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

کہیے لطافت اس تنِ نازک کی میرؔ کیا
شاید یہ لطف ہو گا کسو جانِ پاک میں

آج ہمارے گھر آیا تو کیا ہے یاں جو نثار کریں
الّا کھینچ بغل میں تجھ کو دیر تلک ہم پیار کریں

خاک ہوئے برباد ہوئے پامال ہوئے سب محو ہوئے
اور شدائد عشق کی رہ کے کیسے ہم ہموار کریں

شیوہ اپنا بے پروائی نومیدی سے ٹھیرا ہے
کچھ بھی وہ مغرور ہو بے تو منت ہم سو بار کریں

ہم تو فقیر ہیں خاک برابر آ بیٹھے تو تلطف کیا
ننگ جہاں لگتا ہو انکو واں وے ایسے عار کریں

پیرِ گلشن کا تو حال ہمارا جانے ہے
اور کہے تو جس سے اے گل بے برگی اظہار کریں

کیا ان خوش ظاہر لوگوں سے ہم یہ توقع رکھتے تھے
غیر کو لے کر پاس یہ بیٹھیں ہم کو گلیوں میں خوار کریں
میر جی ہیں گے ایک جو اُن کے کیا ہم اُن سے درد کہیں
کچھ بھی جو سُن پاویں یہ تو مجلس میں بستار کریں

بیگانہ وضع برسوں اس شہر میں رہا ہوں
بھاگوں ہوں دور سب سے میں کس کا آشنا ہوں
گل پھول کوئی کب تک جھڑ جھڑ کے گرتے دیکھے
اس باغ میں بہت اب جوں غنچہ میں رکا ہوں
پیری سے جھلتے جھلتے پہنچا ہوں خاک تک میں
وہ سرکشی کہاں ہے اب تو بہت دبا ہوں
مجھ کو بلا ہے وحشت اے میر دور اس سے
جاگہ سے جب اٹھا ہوں آشوب سا اٹھا ہوں

ہے عاشقی کے بیچ ستم دیکھنا ہی لطف
مر جانا آنکھیں موند کے یہ کچھ ہنر نہیں
ہرچند ہم کو مستوں سے صحبت رہی ولیک
دامن ہمارا ابر کی مانند تر نہیں
جا کر شراب خانے میں رہتا نہیں تو پھر
یہ کیا کہ میر جمعہ ہی کی رات گھر نہیں

پاس ایک دن بھی اپنا اُن نے نہیں کیا ہے
ہم دور اُس سے بے دم دو دو پہر رہے ہیں
اس مے کدے میں جس جا ہشیار چاہیئے تھے
رحمت ہے ہم کو ہم بھی کیا بے خبر رہے ہیں
چل ہم نشیں بنے تو اک آدھ بیت سُنیئے
کہتے ہیں بعد مدت میر اپنے گھر رہے ہیں

رہتے ہیں یوں حواس پریشاں کہ جوں کہیں
دو تین آ کے لُوٹے مسافر اُتر رہیں
آوارگی کی سب ہیں یہ خانہ خرابیاں
لوگ آویں دیکھنے کو بہت ہم جو گھر رہیں
ہم نے بھی نذر کی ہے کہ پھریئے چمن کے گرد
یارب قفس کے چھوٹنے تک بال و پر رہیں

کچھ رو برو ہوئے پہ جو سُلجھے تو سُلجھے میر
جی کے اُلجھنے کا اُسے کیا ماجرا لکھوں

کتنے دنوں سے میر کا نالہ نہیں سُنا
شاید نہیں ہے اب وہ گرفتار درمیاں

اتفاق ایسا ہے کڑھتے ہی سدا رہتے ہیں
ایک عالم میں ہیں ہم ویسے پہ جُدا رہتے ہیں

ڈوبا لوہو میں پڑا تھا ہمگی پیکر میر　　یہ نہ جانا کہ لگی ظلم کی تلوار کہاں

جن جن نے دیکھا تھا اسے بیخود ہوا جیتا بھی پھر　　پر میر جیتے جی بیخود ہرگز نہ آیا ایک میں

صنم پرستی میں اے راہباں نہ کی تقصیر　　تم اہلِ صومعہ سے پوچھو کہ وے مسلماں ہیں
چمن میں جا کے بھرو تم گلوں سے جیبِ کنار　　ہم اپنے دل ہی کے ٹکڑوں سے گل بداماں ہیں
بنے تو عزتِ عشاق میں نہ کر تقصیر　　کہ ایسے لوگ پیارے عزیز جہاں ہیں

جور کیا کیا جفائیں کیا کیا ہیں　　عاشقی میں بلائیں کیا کیا ہیں
فکرِ تعمیرِ دل کسو کو نہیں　　ایسی دلیسی بنائیں کیا کیا ہیں
گر نسیم صبا ہے گاہ سموم　　اس چمن میں ہوائیں کیا کیا ہیں
منظرِ دیدہ قصرِ دل اے میر　　شہرِ تن میں بھی جائیں کیا کیا ہیں

محبت جہاں کی تہاں ہو چکی　　کچھ اس روگ کی بھی دوا ہی نہیں
نہیں دیر اگر میر کعبہ تو ہے　　ہمارے کوئی کیا خدا ہی نہیں

دل لے کے کیسے کیسے جھگڑے مچا دئے ہیں　　بد وضع یاں کے لڑکے کیا خوش معاملے ہیں
گھبرانے لگتیاں ہیں رک رک کے تن میں جانیں　　کرتے ہیں جو وفائیں اُن ہی کے حوصلے ہیں
جب کچھ بھی تھی جہت مجھ سے تب کس سے ملتے تھے تم　　اطراف کے یہ لچے تہ اب تم سے آملے ہیں
میں جی سنبھالتا ہوں وہ ہنس کے ٹالتا ہے　　یاں مشکلیں ہیں ایسی واں یہ مسالے ہیں
پانچوں حواس گم ہیں ہر اک کے اس سمیں میں　　کیا میر جی ہی تنہا ان روزوں دودلے ہیں

محبت نے کھویا کھپایا ہمیں　　بہت اس نے ڈھونڈا نہ پایا ہمیں
پھرا کرتے ہیں دھوپ میں جلتے ہم　　ہوا ہے کہے تو کہ سایا ہمیں
گئے تر رہیں گاہ خوں بستہ تھیں　　ان آنکھوں نے کیا کیا دکھایا ہمیں

جلے ڈالے ہے دل کوئی عشق میں
یہ کیا روگ یارب لگایا ہمیں

ہوئی اُس گلی میں تو مٹی عزیز
دیے خواریوں سے اُٹھایا ہمیں

جوانی دوانی سُنا کیا تھیں
حسینوں کا ملنا ہے بھلا ہمیں

نہ سمجھی گئی دشمنی عشق کی
بہت دوستوں نے جتایا ہمیں

جنھوں نے تماشا بنایا ہمیں
رہا دیکھ اپنا پرایا ہمیں

سدا ہم تو کھوئے گئے سے رہے
کبھو آپ میں تُم نے پایا ہمیں

شب آنکھوں سے دریا سا بہتا رہا
انہیں نے کنارے لگایا ہمیں

ہمارا نہیں تم کو کچھ پاس رنج
یہ کیا تم نے سمجھا ہے آیا ہمیں

جلیں پیش و پس جیسے شمع و پتنگ
جلا وہ بھی جن نے جلایا ہمیں

رہا تو تو اکثر الم ناک میرؔ
ترا طور کچھ خوش نہ آیا ہمیں

مرنے کے پیچھے تو راحت سچ ہے لیک
بیچ میں یہ واقعہ حائل ہے میاں

کی زیارت میرؔ کی ہم نے بھی کل
لا اُبالی سا ہے پر کامل ہے میاں

اُن نے تو آنکھیں مُوند لیاں ہیں اِدھر سے واں
اک آدھ دن میں دیکھئے یاں کیا ہے کیا نہیں

اُٹھتے ہو میرؔ دیر سے تو کعبہ چل رہو
مغموم کا ہے کو ہو، تمہارے خُدا نہیں

یہی مسدود ہے کچھ راہِ وفا ورنہ ہم
سب کہیں نامہ و پیغام چلے جاتے ہیں

دیکھیں پیش آوے ہے کیا عشق میں اب تو جوں سیل
ہم بھی اس راہ میں سر گاڑے چلے جاتے ہیں

پُر غباریٔ جہاں سے نہیں سدھ میرؔ ہمیں
گرد اتنی ہے کہ مٹی میں رُلے جاتے ہیں

کیا کہیں پایا نہیں جاتا ہے کچھ تم کیا ہو میاں
ہم گئے دُنیا سے تم ہو اور اب دُنیا ہو میاں

گفتگو اتنی پریشاں حال کی یہ درہمی
میرؔ کچھ دل تنگ ہی ایسا نہ ہو سودا ہو میاں

دیوانِ سوم

ہم بھی اس شہر میں ان لوگوں سے ہیں خانہ خراب — میرؔ گھر بار جنھوں کے رہِ سیلاب میں ہیں
کہوں ہوں میرؔ سے دل دے کہیں تا جی لگے تیرا — جو ہو نقصانِ جاں اس کا تو کیونکر پھر مناؤں میں

تھا وہ فتنہ ملنے کے گوں کب کسی درویش کے — کیا کہیں ہم میرؔ صاحب سے ہوئے مفتوں کہاں

دل کی دوا اشک سے نہ نکلی بھڑاس — اوسوں بجھتی نہیں ہے پیاس کہیں

ظلم و ستم کیا جور و جفا کیا جو کچھ کہیے اٹھاتا ہوں — خفت کھینچ کے جاتا ہوں رہتا نہیں دل پھر آتا ہوں
گھر سے اٹھ کر کونے میں بیٹھا بیت پڑھے دو باتیں کیں — کس کس طور سے اپنے دل کو اس بن میں بہلاتا ہوں
آنے کی میری فرصت کتنی دو دم دو پل ایک گھڑی — رنجش کیوں کاہے کو خشونت غصہ کیا میں جاتا ہوں
پہلے فریبِ لطف سے اس کے کچھ نہ ہوا معلوم مجھے — اب جو چاہ نے بدلیں طرحیں کڑھتا ہوں پچھتاتا ہوں

کبھو ملے ہے سو وہ یوں کہ پھر ملا نہ کریں — کرے ہے آپ ہی شکایت کہ ہم گلا نہ کریں
دل اب تو ہم سے بد یار اگر رہے جیتے — کبھو سے ہم بھی دلی پھر معاملا نہ کریں

یہ بنا رہتی سی آتی ہے نظریاں کچھ مجھے — اچھتی ہے تعمیر دل کی اس خراب آباد میں

صبحِ چمن کا جلوہ ہندی بتوں میں دیکھا — صندل بھری جبیں ہے ہونٹوں کی لالیاں ہیں
وہ دُزدِ دل نہیں تو کیوں دیکھتے ہی مجھ کو — پلکیں جھکالیاں ہیں آنکھیں چرالیاں ہیں

رفتگاں میں جہاں کے ہم بھی ہیں — ساتھ اس کارواں کے ہم بھی ہیں
نہیں مجنوں سے دل قوی لیکن — یار اُس ناتواں کے ہم بھی ہیں
وجہ بے گانگی نہیں معلوم — تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

اپنا شیوہ نہیں کجی یوں تو
یار جی ٹیڑھے بانکے ہم بھی ہیں
اُس سرے کی ہے پارسائی میر
معتقد اُس جواں کے ہم بھی ہیں

بہت نا آشنا تھے لوگ یاں کے
چلے ہم چار دن رہ کر جہاں میں

دل و دلّی دونوں اگر ہیں خراب
پہ کچھ لطف اس اُجڑے گھر میں بھی ہیں

زبانیں بدلتے ہیں ہر آن خوباں
یہ سب کچھ ہیں بگڑے زمانے کی باتیں
ہمیں دیر و کعبے سے کیا گفتگو ہے
چلی جاتی ہیں یہ سُنانے کی باتیں
بگڑ بھی چُکے یار سے ہم تو یارو
کرو کچھ اب اُس سے بنانے کی باتیں
بہت ہرزہ گوئی کی یاں میر صاحب
کرو واں کے کچھ مُنہ دکھانے کی باتیں

اب ایک سی بے ہوشی رہتی ہے ہم کو
کچھ دل بھی سنبھلتے ہیں پر دیر سنبھلتے ہیں
گُل پھول سے کبھی اپنے دل تو نہیں لگتے ٹک
جی لوگوں کے بے جاناں کس طور بہلتے ہیں
اے گرم سفر یاراں جو ہے سو سر رہ ہے
جو رہ سکو رہ جاؤ اب میر بھی چلتے ہیں

کچھ تمہیں ملنے سے بے زار ہو میرے ورنہ
دوستی ننگ نہیں عیب نہیں عار نہیں

ہشیار تھے سب دام میں آئے نہ ہم آواز
تھی رفتگی سی مجھ کو گرفتار ہوا میں

گو نہیں میں کسو شمار میں میاں
عاقبت ایک دن حساب ہے میاں
لُطف و مہر و وفا وہ کیا جانے
ناز ہے خشم ہے عتاب ہے میاں
چاہیے وہ کہے سو لکھ رکھیں
ہر سخن میر کا کتاب ہے میاں

گرفتہ دل ہوں سر ارتباط مجھ کو نہیں
کسو سے شہر میں کچھ اختلاط مجھ کو نہیں

جہاں ہو تیغ بکف کوئی سادہ جا لگنا　　　اب اپنی جان کا کچھ احتیاط مجھ کو نہیں
ہوا ہوں فرطِ اذیت سے میں تو سن اے میرؔ　　　تمیزِ رنج و خیالِ نشاط مجھ کو نہیں

جوشِ غم اٹھنے سے اک آندھی چلی آتی ہے میاں　　　خاک سی منہ پر مرے اس وقت اڑ جاتی ہے میاں
گات اس اوباش کی لیں کیونکہ بر میں میرؔ ہم　　　ایک جھرمٹ شال کا اک شال کی گاتی ہے میاں

ہم بھی تو فصلِ گل میں چل ٹک تو پاس بیٹھیں　　　سر جوڑ جوڑ کیسے کلیاں نکلتیاں ہیں
دیکھیں تو میرؔ کیا ہو بے طاقتی سے حالت　　　اب تو بدیر جانیں اپنی سنبھلتیاں ہیں

بہار آئی کھلے گل پھول شاید باغِ صحرا میں　　　جھلک سی مارتی ہے کچھ سیاہی داغِ صحرا میں

شہروں ملکوں میں جو یہ میرؔ کہاتا ہے میاں　　　دیدنی ہے پہ بہت کم نظر آتا ہے میاں
کیا بہری خواں ہے جو راتوں کو جگا دے ہے میرؔ　　　شام سے دل جگر و جان جلاتا ہے میاں

جائے ہے جی نجات کے غم میں　　　ایسی جنت گئی جہنم میں
پر کے تھی بے کلی قفس میں بہت　　　دیکھیے اب کے گل کے موسم میں
آپ میں ہم نہیں تو کیا ہے عجب　　　دور اس سے رہا ہے کیا ہم میں
بے خودی پر نہ میرؔ کی جاؤ　　　تم نے دیکھا ہے اور عالم میں

جس کا خوباں خیال لیتے ہیں　　　دل کلیجہ نکال لیتے ہیں
دیکھ اسے ہو ملک سے بھی لغزش　　　ہم تو دل کو سنبھال لیتے ہیں
ہیں گدا میرؔ بھی و لے دو جہاں　　　کر کے ایک ہی سوال لیتے ہیں

بوسہ لبوں کا لیتے ہی تو بگڑ گئے　　　بہتیری باتیں ہوتی ہیں اخلاص پیار میں
کس کس ادا سے ریختے میں نے کہے ولیک　　　سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں

روتے ہیں نالہ کش ہیں یا رات دن جلے ہیں — ہجراں میں اُس کی ہم کو بہتیرے مشغلے ہیں
مرنا ہے خاک ہونا ہو خاک اُڑتے پھرنا — اس راہ میں ابھی تو درپیش مرحلے ہیں
تھا جو مزاج اپنا سو تو کہاں رہا ہے — پر نسبت اگلی تو بھی ہم ان دنوں بھلے ہیں

رہا تھا دیکھ اُودھر میر چلتے — عجب اک نا اُمیدی تھی نظر میں

ضعیف و زار تنگی سے ہیں ہر چند — ولیکن میر اُڑتے ہیں ہوا پر

ہجر تا چند ہم اب وصل طلب کرتے ہیں — لگ گیا ڈھب تو اسی شوخ سے ڈھب کرتے ہیں
تم کبھو میر کو چاہو سو کہ چاہیں ہیں تمھیں — اور ہم لوگ تو سب اُن کا ادب کرتے ہیں

راہ روِش کو ہنوز سے ٹھکانا تو کچھ نہیں — کیا جانے میر آ کے گئے کل کدھر سے یاں

مصرع کوئی کوئی کبھو موزوں کروں ہوں میں — کس خوش سلیقگی سے جگر خوں کروں ہوں میں
بات اپنے ڈھب کی کوئی کرے وہ تو کچھ کہوں — بیٹھا خموش سامنے ہوں ہوں کروں ہوں میں
کب بے دماغی شہر سے دیتی ہے اُٹھنے میر — یوں تو خیالِ وادیٔ مجنوں کروں ہوں میں

تا چند وہ ستم کرے ہم در گزر کریں — اب جی میں ہے کہ شہر سے اُس کے سفر کریں
فرہاد و قیس کوہ کن و دشت گرد تھے — مُنہ نوچیں چھاتی کوٹیں یہی ہم ہنر کریں
لاویں کہاں سے خونِ دل اتنا کہ میر ہم — جس وقت بات کرنے لگیں چشم تر کریں

کچھ حال میر جی کے رُتے نہیں سمجھ میں — ہم بھی سلوک اُن سے اب کم کیا کریں ہیں

دیوانِ چہارم

ضعفِ دماغ سے کیا پوچھو ہو اب تو ہم میں حال نہیں
اتنا ہے کہ طپش سے دل کی سر پر وہ دھمال نہیں

گاہے گاہے اس میں ہم نے مُنہ اُس مہ کا دیکھا تھا
جیسا سال کہ پر کا گزرا ویسا بھی یہ سال نہیں

دل کے گئے پہ دل کہلائے آگے دیکھئے کیا کیا ہوں
محزوں ہوویں مفتوں ہوویں مجنوں ہوویں رُسوا ہوں
عشق کی رہ میں پاؤں رکھا سو رہنے لگے کچھ رفتہ سے
آگے چل کر دیکھیں ہم اب گُم ہوویں یا پیدا ہوں

مینہ جو برسے ہے شدّت سے دیکھ اندھیری کیا ہے یہ
یعنی تنگ جو ہم آتے ہیں دل کو کھول کے رولیں ہیں
مرگ کا وقفہ اس رستے میں کیا ہے میر سمجھتے ہو
ہارے ماندے راہ کے ہم لوگ کوئی دم سولیں ہیں

زباں سے ہماری ہے صیاد خوش　　ہمیں اب اُمید رہائی نہیں

دل کی لاگ بُری ہے ہوتی چنگے بھلے مر جاتے ہیں
آپ میں ہم سے بے خود و رفتہ پھر پھر بھی کیا آتے ہیں
رنگ نہ بدلے چہرے کا کیوں کر آنکھیں بیٹھی جائیں کیوں
کیسے کیسے غم کھاتے ہیں کیا کیا رنج اُٹھاتے ہیں
جی ہی جانے ہے میر جو اپنا دیر کی جانب کیا کریئے
یوں تو مزاج طرف کعبے کے بہتیرا ہم لاتے ہیں

دل کی کچھ تقصیر نہیں ہے آنکھیں اُس سے لگ پڑیاں
مار رکھا سو اُن نے مجھ کو کس ظالم سے جا لڑیاں
ہجر کی راتیں وہ بھاری تھیں ملنے کے دن کی یہ گھڑیاں　　میر بلائے جان رہے ہیں دونوں فراق و وصل آ کے

تلاش میر کی اب مے کدوں میں کاش کریں
کہ مسجدوں میں تو وہ خانماں خراب نہیں

طرفہ صناع ہیں اے میر یہ موزوں طبعاں
بات جاتی ہے بگڑ بھی تو بنا دیتے ہیں

جی مارا بے تابیٔ دل نے اب کچھ اچھا ڈھنگ نہیں
رنگ طپیدن کی شوخی سے منہ پہ میرے رنگ نہیں

ہم بھی عالم فقر میں ہیں پر ہم سے جو مانگے کوئی فقیر
ایک سوال میں دو عالم دیں اُن سے دل کو تنگ نہیں

ہاتھ پہ ہاتھ دھرے ہو گئے کیا میرے طور شتابی ہو
بیٹھا ہوں کھڑے پاؤں میں تو کچھ چلنے میں درنگ نہیں

وہ نہیں اب کہ فریبوں سے لگا لیتے ہیں
ہم جو دیکھیں ہیں تو وہ آنکھ چھپا لیتے ہیں

ہم فقیروں کو کچھ آزار تمہیں دیتے ہو
یوں تو اس فرقے سے سب لوگ دعا لیتے ہیں

چاک سینے کے ہمارے نہیں سینے اچھے
انہیں رخنوں سے دل و جان ہوا لیتے ہیں

میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اُسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

تھکے چارہ جوئی سے اب کیا کریں
کہو تم سو دل کا مداوا کریں

نہیں چاہتا جی کچھ اب سیر ہیں
ہوس دل کو ہو تو تمنا کریں

بُرے حال اُس کی گلی میں ہیں میر
جو اٹھ جائیں واں سے تو اچھا کریں

پنج روزہ عمر کریئے عاشقی یا زاہدی
کام کچھ چلتا نہیں اس تھوڑی سی مہلت سے یاں

کیا سر جنگ و جدل ہووے دماغ عشق کو
صلح کی ہے میر نے ہفتاد و دو ملت سے یاں

گوندھ کے گویا پتی گل کی وہ ترکیب بنائی ہے
رنگ بدن کا تب دیکھو جب چولی بھیگے پسینے میں

میر نے کیا کیا ضبط کیا ہے شوق میں اشک خونیں کو
کہیے جو تقصیر ہوئی ہو اپنا لوہو پینے میں

شور نہیں یاں سُنتا کوئی میرؔ قفس کے اسیروں کا　　گوش نہیں دیوارِ چمن کے گُل کے شاید کان نہیں

یوں ناکام رہیں گے کب تک جی میں ہے اک کام کریں
رُسوا ہوکر مارے جاویں اُس کو بھی بدنام کریں

جس کو خُدا دیتا ہے سب کچھ دے ہی سب کچھ دیتے ہیں
ٹوپی لنگوٹی پاس اپنے ہم اس پر کیا انعام کریں

دل آسودہ ہو تو رہے ٹک در پہ ہم سو بار گئے
وہ سو یہی کہہ بھیجے ہے باہر جاویں اب آرام کریں

میلِ گدائی طبع کو اپنے کچھ بھی نہیں ہے ورنہ میرؔ
دو عالم کو مانگ کے لاویں ہم جو تنک ابرام کریں

پھرا ہیں صورتِ احوال ہر یک کو دکھاتا یاں　　مروّت قحط ہے آنکھیں نہیں کوئی ملاتا یاں
خرابہ دلّی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا　　وہیں میں کاش مرجاتا سراسیمہ نہ آتا یاں
محبّت دشمنِ جاں ہو جو میں معلوم یہ کرتا　　تو کاہے کو کسو سے میرؔ اپنا دل لگاتا یاں

دیوانِ پنجم

تاروں کی جیسی دیکھی ہیں آنکھیں لڑانیاں　　اُس بے نشاں کی ایسی ہیں چندیں نشانیاں
پیری ہے اب تو کہیئے سو کیا کہیئے ہم نشیں　　کس رنج و غم میں گزری ہیں اپنی جوانیاں
سُنتا نہیں ہے شعر بھی وہ حرف ناشنو　　دل ہی میں خوں ہوا کیں مری نکتہ دانیاں
سر رفتہ سُن نہ میرؔ کا گر قصدِ خواب ہے　　نیندیں اُچٹتیاں ہیں سُنے یہ کہانیاں

کسو سے دل نہیں ملتا ہے یارب　　ہوا تھا کس گھڑی اُن سے جُدا میں
تعارف ہم صفیروں سے نہیں کچھ　　ہوا ہوں ایک مدّت میں رہا میں

ہندو بچوں سے کیا معیشت ہو　　یہ کبھو انگ دان دیتے ہیں
یہ عجب گم ہوئے ہیں جس کیلئے　　نہیں اس کا نشان دیتے ہیں
گُل خوباں میں میر مہر نہیں　　ہم کو غیروں میں سان دیتے ہیں

پلکیں پھری ہیں کھنچی بھویں ہیں ترچھی تیکھی نگاہیں ہیں
اُس اوباش کی سادگی دیکھو شوخی سے ہم چاہیں ہیں
پہنا و اخوش آتا ہے ان لڑکے چسپاں پوشوں کا
مونڈھے چُسے ہیں چولی پھنسی ہے ٹیڑھی ٹیڑھی کلاہیں ہیں
ضبطِ گریہ دل سے ہو تو کوزے میں دریا کرتا ہے
حوصلہ داری جن کی ہو ایسی عشق میں اُنکو سراہیں ہیں
دل ہے داغ جگر ہے ٹکڑے رہ جاتے ہیں چُپکے سے
چھاتی سراہئے اُن لوگوں کی جو چاہت کو نباہیں ہیں
یہ بھی سماں خوش ترکیبوں کا میر نہ اپنے دل سے گیا
سوتے سے اُٹھ کر آنکھیں ملی ہیں لے انگڑائی جماہیں ہیں

صبر کیا ہے برسوں ہم نے رات سے بے طاقت سے ہیں
اور گزارا کب تک ہوگا کچھ اب ہم رخصت سے ہیں
رسم لُطف نہیں ہے مطلق شہرِ خوش محبوباں میں
دیکھے کم جو کرتے کبھو پر عاشق ہم مدّت سے ہیں
عشق کے دین اور مذہب میں مرجانا واجب آیا ہی
کوہکن و مجنون موئے اب ہم بھی اُسی ملّت سے ہیں
فرصت اُن کو کم ہے اگرچہ پر ملتے ہیں قابو پر
برسوں میر سے بل دیکھا ہے کچھ وے کم فرصت سے ہیں

کہنے لگا کہ میر تمہیں بیچوں گا کہیں　　تم دیکھیو نہ کہیو غلام اس کے ہم نہیں

دل جلتے کچھ بن نہیں آتی حال بگڑتے جاتے ہیں
جیسے چراغِ آخری شب ہم لوگ نبڑتے جاتے ہیں

عشق نے ہم کو مار رکھا ہے جی میں اپنے تاب نہیں
دل کو خیالِ صبر نہیں آنکھوں کو میلِ خواب نہیں

رنگ شکستہ دل ہے شکستہ سر ہے شکستہ مستی میں
حال کسو کا اپنا سا اس مے خانے میں خراب نہیں

ٹھہریں میر کسو جا گہ ہم دل کو قرار جو ٹک آوے
ہو کے فقیر اس در پر بیٹھیں اُسکے بھی ہم باب نہیں

جوانی میں نہ رسوائی ہوئی تا میر غم کہتے
ہوئے اطفال تہ بازار گاہک جی کے پیری میں

ہم وے ہر چند کہ ہم خانہ ہیں دونوں لیکن
روشِ عاشق و معشوق جدا بیٹھے ہیں

باغ میں آتے ہیں پر اُس گلِ تر بن یک سو
غنچہ پیشانی و دل تنگ خفا بیٹھے ہیں

کیا کہوں آ نے کھڑے گھر سے تو اک شوخی سے
پاؤں کے نیچے مرے ہاتھ دبا بیٹھے ہیں

قافلہ قافلہ جاتے ہیں چلے کیا کیا لوگ
میر غفلت زدہ حیران سے کیا بیٹھے ہیں

منہ گئے اودھر زرد ہوئے جاتے ہیں ڈر سے سُبک ساراں
کیونکہ ہیں گے اس رستے میں ہم سے آہ گراں باراں

کی ہے عمارت دل کی جنھوں نے اُنکی بنا کچھ رکھی رہی
اور تو خانہ خراب ہی دیکھے اس بستی کے معماراں

عشق میں ہم سے تم سے کہیں تو کھپ جاویں غم کس کو ہے
مارے گئے ہیں اس میداں میں کیا دل والے جگرداراں

کیا کیا مردم خوش ظاہر ہیں عالمِ حسن میں نامِ خدا
عالمِ عشق خرابہ ہے واں کوئی گھر آباد نہیں

تدبیر کوئی بتا دے جو آپ کو سنبھالیں
جینے کی اپنے ہم بھی کوئی طرح نکالیں

مے کشی صبح و شام کرتا ہوں — فاقہ مستی مدام کرتا ہوں
کوئی ناکام یوں رہے کب تک — میں بھی اب ایک کام کرتا ہوں
یا تو لیتا ہوں دادِ دل یا اب — کام اپنا تمام کرتا ہوں

دیوانِ ششم

رہتے دکھلائی نہیں دیتے بلاکش اُس کے — جی کھپے جاتے ہیں دل اپنے دیئے جاتے ہیں
گرم ہیں اُس کی طرف جانے کو ہم لیکن میر — ہر قدم ضعفِ محبت سے ڈھلے جاتے ہیں

دیر سے میر اُٹھ کے کعبے گئے — کہیئے کیا نکلے جا کہیں کے کہیں

رابطہ باہم ہے کوئی دن کا یاں — پھر زمانے میں کہاں تم ہم کہاں
عشق میں کیوں کر بسر کریئے گا عمر — دل لگا ہے جس سے ہو نامہرباں

اُس سے گھبرا کے جو کچھ کہنے کو آ جاتا ہوں — دل کی پھر دل میں لئے چُپکے چلا جاتا ہوں
یک بیاباں ہے مری بے کسی و تنہائی — مثلِ آوازِ جرس سب سے جُدا جاتا ہوں

نہ سمجھو مجھے بے خبر اِس قدر — تہِ دل سے لوگوں کے آگاہ ہوں
مری کج روی سادگی سے ہے میر — بہت اس روئیے پہ گمراہ ہوں

بہار آئی مزاجوں کی سبھی تدبیر کرتے ہیں — جوانوں کو انہیں ایام میں زنجیر کرتے ہیں
برہمن زادگانِ ہند کیا پُرکار سادے ہیں — مُسلمانوں کی یارانے ہی میں تکفیر کرتے ہیں
تماشا دیکھنا منظور ہو تو مل فقیروں سے — کہ چُٹکی خاک کو لے ہاتھ میں اکسیر کرتے ہیں

اظہارِ کم فراغی ہر دم کی بے دماغی — ان روزوں میر صاحب کچھ میرزا ہوئے ہیں

بے کار مجھ کو مت کہہ میں کار آمدہ ہوں ۔ بیگانہ وضع تو ہوں پر آشنا زدہ ہوں

آئے ہیں میر کافر ہوکر خدا کے گھر میں پیشانی پر ہے قشقہ زنار ہے کمر میں

آنکھ لگی ہے جب سے اُس سے آنکھ لگی زنہار نہیں نیند آتی ہے دل جمعی میں سو تو دل کو قرار نہیں
وصل میں اُسکے روز و شب کیا خوب گزرتی تھی اپنی ہجراں کا کچھ اور ہی ساماں اب وہ لیل و نہار نہیں
لطف نسیم اُس کا ہی ہمدم کیوں نہ غنیمت جانیں ہم ربط خاص کسو سے اُس سے ہو یہ تو طور یار نہیں
عشق میں اُس بے چشم و رُو کے طرفہ رُویت پیدا کی کس دن اُودھر سے اب ہم پر گالی جھڑکی مار نہیں

دل کو جانا تھا گیا رہ گیا ہے افسانہ روز و شب ہم بھی کہانی سی کہا کرتے ہیں
واں سے یک حرف و حکایت بھی نہیں لایا کوئی یاں سے طومار کے طومار چلا کرتے ہیں
میر کیا جانے کسے کہتے ہیں واشد وے تو غنچہ خاطر ہی گلستاں میں رہا کرتے ہیں

ناآشنا کے اپنے جیسے ہم آشنا ہیں اس طور اس طرح کے ایسے کم آشنا ہیں
باہم جو یاریاں ہیں اور آشنائیاں ہیں سب ہیں نظر میں اپنی ہم عالم آشنا ہیں
ماتم کدہ ہے تکیہ کیا تازہ کچھ ہمارا یک جا فقیر کب سے ہم سب غم آشنا ہیں
یاری جہانیوں کی کیا میر معتبر ہے ناآشنا ہیں یکدم یہ اک دم آشنا ہیں

گو کہ بت خانے رہا ہوں میں بخدا با خدا رہا ہوں میں
سب گئے دل دماغ تاب و تواں میں رہا ہوں سو کیا رہا ہوں میں
برق تو میں نہ تھا کہ جل بجھتا ابر تر ہوں کہ چھا رہا ہوں میں
اُسکی بیگانہ وضعی ہے معلوم برسوں تک آشنا رہا ہوں میں
دُور کے لوگ جن نے مارے قریب اُسکے ہمسائے آ رہا ہوں میں
مجھ کو بدحال رہنے دیں اے کاش بے دوا کچھ بھلا رہا ہوں میں
کچھ رہا ہی نہیں ہے مجھ میں میر جب سے اُس سے جدا رہا ہوں میں

ردیفِ واؤ

دیوانِ اوّل

کیا سیر اس خرابے کا بہت اب چل کے سو رہیے　　کبھو دیوار کے سائے میں منھ پر لے کے داماں کو

بے ہوشی سی آتی ہے تجھے اُس کی گلی میں　　گر ہو سکے اے میر تو اُس راہ نہ جا تو

چاہوں تو بھر کے کَولی اُٹھا لوں ابھی تمہیں　　کیسے ہی بھاری ہو مرے آگے تو پھول ہو
دل لے کے لونڈے دلی کے کب کا پچا گئے　　اب اُن سے کھائی پی ہوئی شے کیا وصول ہو
ناکام اِس لئے ہو کہ چاہو ہو سب کچھ آج　　تم بھی تو میر صاحبِ قبلہ عجول ہو

کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو　　ہاں کہو اعتماد ہے ہم کو
شوق ہی شوق ہے نہیں معلوم　　اُس سے کیا دل نہاد ہے ہم کو
آہ کس ڈھب سے روئیے کم کم　　شوق حد سے زیاد ہے ہم کو
سادگی دیکھ عشق میں اُس کے　　خواہشِ جانِ شاد ہے ہم کو
بدگمانی ہے جس سے تس سے آہ　　قصدِ شور و فساد ہے ہم کو
دوستی ایک سے بھی تجھ کو نہیں　　اور سب سے عناد ہے ہم کو
نامرادانہ زیست کرتا تھا　　میر کا طور یاد ہے ہم کو

خدا کرے کہ نصیب اپنے ہو نہ آزادی　　کدھر کے ہو جے جو بے بال و پر رہائی ہو
مُغاں سے راہ تو ہو جائے رفتہ رفتہ شیخ　　ترا بھی قصد اگر ترکِ پارسائی ہو
کہیں تو ہیں کہ عبث میر نے دیا جی کو　　خدا ہی جانے کہ کیا جی میں اُس کے آئی ہو

ہم سایہ اس چمن کے کتنے شکستہ پر ہیں　　اتنے لئے کہ شاید اک باؤ گل فشاں ہو
میر اُس کو جان کر تو بے شبہ ملیورہ پر　　صحرا میں جو نمد مو بیٹھا کوئی جواں ہو

گرچہ کب دیکھتے ہو پر دیکھو | آرزو ہے کہ تم ادھر دیکھو
عشق کیا کیا ہمیں دکھاتا ہے | آہ تم بھی تو اک نظر دیکھو
رنگ رفتہ بھی دل کو کھینچے ہے | ایک شب اور یاں سحر دیکھو
پہنچے ہیں ہم قریب مرنے کے | یعنی جاتے ہیں دور اگر دیکھو
لطف مجھ میں بھی ہیں ہزاروں میر | دیدنی ہوں جو سوچ کر دیکھو

ایک رونا ہی نہیں آہ و غم و نالہ و درد | ہجر میں زندگی کرنے کے تئیں کیا کیا ہو

ویسا کہاں ہے ہم سے جیسا کہ آگے تھا تو | اوروں سے مل کے پیارے کچھ اور ہو گیا تو
آ ابر ایک دو دم آپس میں رکھیں صحبت | کڑھنے کو ہوں میں آندھی رونے کو ہے بلا تو
کہہ سانجھ کے موئے کو اے میر روئیں کب تک | جیسے چراغ مفلس اک دم میں جل بجھا تو

ہم سے تو تم کو ضد سی پڑی ہے خواہ نخواہ رلاتے ہو
آنکھ اٹھا کر جب دیکھے ہیں اوروں میں ہنستے جاتے ہو
صبح سے یاں پھر جان و دل پر روز قیامت رہتی ہے
رات کبھو آ رہتے ہو تو یہ دن ہم کو دکھلاتے ہو
راحت پہنچی ٹک تم سے تو رنج اٹھایا برسوں تک
سر سہلاتے ہو جو کبھو تو بھیجا بھی کھا جاتے ہو
ہو کے گدائے کوئے محبت زور صدا یہ نکالی ہے
اب تو میر جی راتوں کو تم ہر در پر چلاتے ہو

ایسے تو حال کے کہنے سے بھلی خاموشی | کہیے اس سے جو کوئی اپنا کہا رکھتا ہو

مت پوچھو کچھ اپنی باتیں کہیے تو تم کو ندامت ہو
قد قامت پر کچھ ہے تمہارا لیکن قہر قیامت ہو

ربطِ اخلاص اے دیدۂ و دل بھی دُنیا میں ایک سے ہوتا ہے
لگ پڑتے ہیں جس سے تس سے تم بھی کوئی ملامت ہو
چاہ کا دعویٰ سب کرتے ہیں مانیئے کیوں کر بے آثار
اشک کی سُرخی، زردی مُنہ کی عشق کی کچھ تو علامت ہو
ہو جو ارادہ یاں رہنے کا رہ سکیئے تو رہیئے آپ
ہم تو چلے جاتے ہیں ہر دم کس کو قصدِ اقامت ہو
شور و شغب کو راتوں کے ہمسائے تمہارے کیا روویں
ایسے فتنے کتنے اُٹھیں گے میر جی تم جو سلامت ہو

شیخ جی آؤ مصلیٰ گروِ جام کرو　　جنسِ تقویٰ کے تئیں صرفِ مے جام کرو
فرشِ مستاں کرو سجادۂ بے تہ کے تئیں　　مے کی تعظیم کرو شیشے کا اکرام کرو
دامنِ پاک کو آلودہ رکھو بادے سے　　آپ کو مغبچوں کے قابلِ دشنام کرو
نیک نامی و تفاوت کو دُعا جلد کہو　　دین و دل پیش کشِ سادۂ خود کام کرو
ننگ و ناموس سے اب گزرو جوانوں کی طرح　　پرفشانی کرو اور ساقی سے ابرام کرو
خوب اگر جرعۂ مے نوش نہیں کر سکتے　　خاطرِ جمع مے آشام سے یہ کام کرو
اُٹھ کھڑے ہو جو جُھکے گردنِ مینائے شراب　　خدمتِ بادہ گساراں بہ سرانجام کرو
مُطرب آ کر جو کرے چنگ نوازی تو تم　　پیرہن مستوں کی تقلید سے انعام کرو
خُنکی اِتنی بھی تو لازم نہیں اِس موسم میں　　پاسِ جوشِ گُل و دل گرمیٔ ایّام کرو
سایۂ گُل میں لبِ جُو پہ گلابی رکھو　　ہاتھ میں جام کو لو آپ کو بدنام کرو
آہ تا چند رہو خانقہ و مسجد میں　　ایک تو صبح گلستاں میں بھی شام کرو
رات تو ساری گئی سُنتے پریشاں گوئی　　میر جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

کون کہتا ہے نہ غیروں پہ تم امداد کرو　　ہم فراموش ہوؤں کو بھی کبھو یاد کرو
ایسے ہم پیشہ کہاں ہوتے ہیں اے غم زدگاں　　مرگِ مجنوں پہ کُڑھو ماتمِ فرہاد کرو
اے اسیرانِ تہِ دام نہ تڑپو اتنا　　تا نہ بدنام کہیں جنگلِ صیاد کرو

اوّلِ عشق ہی میں میرؔ جی تم رونے لگے
خاک ابھی مُنہ کو ملو نالہ و فریاد کرو

نزدیک اپنے ہم نے تو سب کر رکھا ہے سہل
پھر میرؔ اس میں مُردن دشوار کیوں نہ ہو

مقصود درِ دل ہے نہ اسلام ہے نہ کفر
پھر ہر گلے میں سبحہ و زنّار کیوں نہ ہو
تلوار کے تلے بھی ہیں آنکھیں تری اُدھر
تُو اس ستم کا میرؔ سزاوار کیوں نہ ہو

ہووے ہزار وحشت اُسے تو بھی یار ہے
اغیار تیرے ساتھ جو ہوں میرؔ کیوں نہ ہو

جو بے دماغی یہی ہے تو بن چکی اپنی
دماغ چاہیئے ہر اک سے ساز کرنے کو
زیادہ حد سے تھی تابوت میرؔ پر کثرت
ہوا نہ وقت مساعد نماز کرنے کو

کیا کیا عزیز دوست ملے میرؔ خاک میں
کچھ اس گلی میں ہم ہی نہیں خوار ایک دو

حالِ دل میرؔ کا اے اہلِ وفا مت پوچھو
اِس ستم کُشتہ پہ جو گزری جفا مت پوچھو
صبح سے اور بھی پاتا ہوں اُسے شام کو تُند
کام کرتی ہے جو کچھ میری دُعا مت پوچھو
ہوش و صبر و خرد و دین و حواس و دل و تاب
اُس کے ایک آنے میں کیا کیا نہ گیا مت پوچھو
اشتعال اک کی محبّت نے کہ در بست پھونکا
شہرِ دل کیا کہوں کس طور جلا مت پوچھو
وقتِ قتل آرزوئے دل جو لگے پوچھنے لوگ
میں اشارت کی اُدھر اُن نے کہا مت پوچھو
خواہ مارا اُنہیں نے میرؔ کو خواہ آپ موا
جانے دو یارو جو ہونا تھا ہوا مت پوچھو

دل خراشی و جگر چاکی و سینہ کاوی
اپنے ناحق میں ہیں سب اور ہُنر مت پوچھو
جُوں تُوں کر حالِ دل اک بار تو میں عرض کیا
میرؔ صاحب جی بس اب بارِ دگر مت پوچھو

اُس کی طرزِ نگاہ مت پوچھو
جی ہی جانے ہے آہ مت پوچھو

کہیں پہنچو گے بے رہی میں بھی / گم یہاں یوں یہ راہ مت پوچھو
میرِ عاشق کو کچھ کہے ہی بنے / خواہ وہ پوچھو خواہ مت پوچھو

محرماں بے دمی کا میری سبب مت پوچھو / ایک دم چھوڑ دو یوں ہی مجھے اب مت پوچھو
گریۂ شمع کا اے ہم نفساں میں تھا حریف / گزری ہے رات کی صحبت بھی عجب مت پوچھو
میر صاحب نئی یہ طرز ہوا اُس کی تو کہوں / موجب آزردگی کا وجہِ غضب مت پوچھو

کہنے سے میر اور بھی ہوتا ہے مضطرب / سمجھاؤں کب تک اِس دلِ خانہ خراب کو

لُطف کیا آزردہ ہو کر آپ سے ملنے کے بیچ / ٹک تری جانب سے جب تک عُذر خواہی بھی نہ ہو
چاہتا ہے جی کہ ہم تو ایک جا تنہا ملیں / نازِ بے جا بھی نہ ہووے کم نگاہی بھی نہ ہو!

افسانہ غم کا لب تک آیا ہے مدتوں میں / سو جائیو نہ پیارے اس داستاں تلک تو

دیوانِ دوم

اتنا کہا نہ ہم سے تم نے کبھو کہ آؤ / کاہے کو یوں کھڑے ہو وحشی سے بیٹھ جاؤ
اب آتے ہو تو آؤ ہر لحظہ جی گھٹے ہے / پھر لُطف کیا جو آ کر آدھا بھی تم نہ پاؤ
تھی سحر یا نگہ تھی ہم آپ کو تھے بھولے / اس جادوگر کو یارو پھر بھی تنک دکھاؤ
مارے گئے سو گزرے جی پھر چراتے ہیں کیا / آئندہ میر صاحب دل مت کہیں لگاؤ

کیا اُس کے گئے ہے ذکرِ دل کا / ویران پڑا ہے یہ مکاں تو
کیا کیا نہ عزیز خوار ہوں گے / ہونے دو اُسے ابھی جواں تو
مت تُربتِ میر کو مٹاؤ / رہنے دو غریب کا نشاں تو

میرؔ تو تو عاشقی میں کھپ گیا　　　مت کسی کو چند روز اب چاہ تو

بد نما ہو جب ایسے خوش اسلوب ہو　　　کیا کہیں جو کچھ کہ ہو تم خوب ہو
بے نقابی اس کی ہے ہم پر ستم　　　لائیے منہ پر تو وہ محجوب ہو
ایسا شہرِ حسن ہی ہے تازہ رسم　　　دوستی باہم جہاں معیوب ہو
مطلبِ عمدہ ہے دل سے تو رکھو　　　گاہ باشد تم کو بھی مطلوب ہو
جو کہو ہو سو مخالف عقل کے　　　میر صاحب تم مگر مجذوب ہو

تک نہ چل اے نسیمِ باغ کہ میں　　　رہ گیا ہوں چراغ سا گُل ہو
ایسے ڈھواں یوں جگر سے اُٹھتا ہو　　　جیسے پُرپیچ کوئی کاکُل ہو
دل جلا لالہ ساں دیا تو کیا　　　داغ بھی ہو تو کوئی بالکل ہو
مجھ دوانے کی مت ہلا زنجیر　　　نہیں ایسا نہ ہو کہ پھر غُل ہو
منکشف ہو رہا ہے حالِ میر　　　کاشکے یار کو تامل ہو

نہ میرے باعثِ شور و فغاں ہو　　　ابھی کیا جانیے یاں کیا سماں ہو
جگر تو چھن گیا تیروں کے مارے　　　تمہاری کس طرح خاطر نشاں ہو
تم اے نازک تناں وہ ہو کہ سب کے　　　تمنائے دل و آرامِ جاں ہو
ہوئے ہم پیر سو ساکت ہیں اب میر　　　تمہاری بات کیا ہے تم جواں ہو

برسوں میں کبھو ایدھر تم ناز سے آتے ہو　　　کچھ برسوں تئیں پیارے جی سے نہیں جاتے ہو
آتے ہو کبھو یاں تو ہم لطف نہیں پاتے　　　سو آفتیں لاتے ہو سو فتنے اُٹھاتے ہو
رہتے ہو تم آنکھوں میں پھرتے ہو تمہیں دل میں　　　مدت سے اگرچہ یاں آتے ہو نہ جاتے ہو
خوش کرنے سے ٹک ایسے ناخوش ہی رکھا کریے　　　ہنستے ہو گھڑی بھر تو پہروں ہی رُلاتے ہو
کچھ عزتِ کفر آخر اے دیر کے باشندو　　　مجھ سہل سے کو کیوں تم زنار بندھاتے ہو
آوارہ اسے پھرتے پھر برسوں گزرتے ہیں　　　تم جس کسو کو اپنے ٹک پاس بلاتے ہو

دل کھول کے مل چلیئے جو میر سے ملنا ہے　　آنکھیں بھی دکھاتے ہو پھر منہ بھی چھپاتے ہو

ہر صبح شام تو ہئے ایذائے میر ہو　　ایسا نہ ہو کہ کام ہی اُس کا اخیر ہو
ہو کوئی بادشاہ کوئی یاں وزیر ہو　　اپنی بلا سے بیٹھ رہے جب فقیر ہو
ہوتے ہیں میکدے کے جواں شیخ جی برے　　پھر درگزر یہ کرتے نہیں گو کہ پیر ہو
حد سے زیادہ جور و ستم خوش نما نہیں　　ایسا سلوک کر کہ تدارک پذیر ہو
ایسا ہی اُس کے گھر کو بھی آباد دیکھیو　　جس خانماں خراب کا یہ دل مشیر ہو
یک وقت خاص حق میں مرے کچھ دعا کرو　　تم بھی تو میر صاحب و قبلہ فقیر ہو

ٹک گفتگو سے ملا کر گو پھر کبھو کبھو ہو　　سو تب تلک کہ مجھ کو ہجراں سے تیرے خو ہو
کیا کیا جوان ہم نے دنیا سے جاتے دیکھے　　اے عشق بے محابا دنیا ہو اور تو ہو
ایسے کہو گے کچھ تو ہم چپکے ہو رہیں گے　　ہر بات پر کہاں تک آپس میں گفتگو ہو
کہتے ہو کا پتا ہوں جوں بید عاشقی سے　　تم بھی تو میر صاحب کتنے خلاف گو ہو

جی میں تو ہے کہ دیکھئے آوارہ میر کو　　لیکن خدا ہی جانے وہ گھر میں ہو یا نہ ہو

خدا کرے کہ بتوں سے نہ آشنائی ہو　　کہ پھر موئے ہی بنے ہے اگر جدائی ہو
ہزار موسم گل تو گئے اسیری میں　　دکھائی دے ہے موئے ہی پہ اب رہائی ہو

سب سرگزشت سن چکے اب چپکے ہو رہو　　آخر ہوئی کہانی مری تم بھی سو رہو
اتنا سیاہ خانۂ عاشق سے تنگ کیا　　کتنے دنوں میں آئے ہو واں رات تو رہو

لائق نہیں تمہیں کہ ہمیں ناسزا کہو　　پر ہے یہی ہمارے کیئے کی سزا کہو
چپکے رہے بھی چین نہیں تب اپنے دیں　　لب بستہ بیٹھے رہتے جو ہو مدعا کہو
پیغام بر تو یار تمہیں میں کروں ولے　　کیا جانوں جا کے حق میں مرے اُس سے کیا کہو

اب نیک و بد پہ عشق میں مجھ کو نظر نہیں — اس میں مجھے بُرا کہو کوئی بھلا کہو
صحبت ہماری اُس کی جو ہر گفتنی نہیں — کیا کہیے گر کہے کوئی یہ ماجرا کہو
یارو خصوصیت تو رہا ہی نہ اُس کے ساتھ — میرا کہو جو حال تو اُس سے جُدا کہو
آشفتہ مُو ہوں میں بھی پریشاں خراب حال — دیکھو مجھے تو خبطی دوانہ بتڑا کہو
کب شرح شوق ہو سکے ہے تو بھی میر جی — خط تم نے جو لکھا اُسے کیا کیا لکھا کہو

صحبت آخر ہے ہماری نہ کرو دیر افسوس — متصل ہو سکے تو ہم سے ملاقات کرو
تم تو تصویر ہوئے دیکھ کے کچھ آئینہ — اِتنی چُپ بھی نہیں ہے خوب کوئی بات کرو
بس بہت وقت کیا شعر کے فن میں ضائع — میر اب پیر ہوئے ترک خیالات کرو

جوں غنچہ میر اتنے نہ بیٹھے رہا کرو — گُل پھول دیکھنے کو بھی ٹک اُٹھ چلا کرو
یہ اضطراب دیکھ کہ اپنے دشمنوں سے بھی — کہتا ہوں اُس کے ملنے کی کچھ تم دُعا کرو
دشمن ہیں اپنے جی کے تمہارے لئے ہوئے — تم بھی حقوق دوستی کے کچھ ادا کرو
اپنا بھلے تو آپ ہی ستم سب اُٹھائیے — تم کون چاہتا ہے کسو پر جفا کرو
ہر چند ساتھ جان کے ہے عشق میر لیک — اس دردِ لا علاج کی کچھ تو دوا کرو

نزدیک ہے کہ جاویں ہم آپ سے اب آؤ — ملتے ہیں دوستوں سے جاتے ہوئے سفر کو

حیرت ہے کہ ہے مدعی معرفت اک خلق — کچھ ہم نے تو پایا نہیں اب تک تری ڈھب کو
ہو گا کسو دیوار کے سائے میں پڑا میر — کیا ربط محبت سے اس آرام طلب کو

گیا کوچے سے تیرے اُٹھ کے میر آشفتہ سر شاید — پڑا دیکھا تھا میں نے رہ میں اُسکے سنگِ بالیں کو

اندیشے کی جا گہ ہے بہت میر جی مرنا — درپیش عجب راہ ہے ہم نوسفروں کو

یوں کب ہوا ہے پیارے پاس اپنے تم بلا لو
دو باتیں گر کھوں میں دل کو ٹک اک لگا لو

اب جو نصیب میں ہو سو دیکھ لونگا میں بھی
تم دستِ لطف اپنا سر سے مرے اُٹھا لو

یارانِ رفتہ ایسے کیا دُور تر گئے ہیں
ٹک کرکے تیز گامی اُس قافلے کو جا لو

یوں رفتہ اور بیخود کب تک رہا کروگے
تم اب بھی میر صاحب اپنے تئیں سنبھالو

دیوانِ سوم

قتل کئے پر غصہ کیا ہے لاش مری اُٹھوانے دو
جان سے ہم و جلتے رہے ہیں تم بھی آؤ جانے دو

کرتے ہو تم نیچی نظریں یہ بھی کوئی مروت ہے
برسوں سے پھرتے ہیں جدا ہم آنکھ سے آنکھ ملانے دو

اب کی بہت ہے شور بہاراں ہم کو مت زنجیر کرو
دل کی ہوس کچھ ہم بھی نکالیں دھومیں ہمکو مچانے دو

عرصہ کتنا سارے جہاں کا وحشت پر جو آ جاویں
پاؤں تو ہم پھیلا دیں گے پر فرصت ہم کو پانے دو

کیا جاتا ہے اسمیں ہمارا چپکے ہم تو بیٹھے ہیں
دل جو سمجھنا تھا سو سمجھا ناصح کو سمجھانے دو

ضعف بہت ہے میر تمہیں کچھ اُسکی گلی میں مت جاؤ
صبر کرو کچھ اور بھی صاحب طاقت جی میں آنے دو

بات بنانا مشکل سا ہے شعر سبھی یاں کہتے ہیں
فکر بلند سے یاروں کو ایک ایسی غزل کہہ لانے دو

کس کو دماغ رہا ہے یاں اب ضد میں اُسکی اُٹھانے کا
چار پہر جب منت کریئے تب وہ باتیں ملنے دو

رونے سے تو پھوٹیں آنکھیں دل کو غموں نے خراب کیا
دیکھنے قابل اسکے ہوئے ہیں اب تو یہ دیر لانے دو

دشت و کوہ میں میر پھرو تم لیکن ایک ادب کے ساتھ
کوہکن و مجنوں بھی تھے اس ناحیے میں دیوانے دو

دریا سی آنکھیں بہتی ہی رہتی تھیں سو کہاں
ہوتی ہے کوئی کوئی پلک اب تو تر کبھو

غم کو تمہارے دل کے نہایت نہیں ہے میر
اس قصے کو کروگے بھی تم مختصر کبھو!

آپ تو ایسے بنے اب کہ جلے جی سب کا
ہم کو کہتے ہیں کہ تم جی کے تئیں مار رہو

لاگ اگر دل کو نہیں لطف نہیں جینے کا
اُلجھے سُلجھے کسو کاکل کے گرفتار رہو

سب میر کو دیتے ہیں جگہ آنکھوں پہ اپنی — اس خاکِ رہِ عشق کا اعزاز تو دیکھو

کیا بلا خیز جا ہے کوچۂ عشق — تم بھی یاں میر ہوں اک گھر لو

پہلے دیوانے ہوئے پھر میر آخر مر گئے — ہم نہ کہتے تھے کہ صاحب عاشقی تم مت کرو

یارب دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو — ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو
ہم کو دیوانگی شہروں ہی میں خوش آتی ہے — دشت میں قیس رہو کوہ میں فرہاد رہو
میر مل مل کے بہت خوش ہوئے تم سے پیارے — اس خرابے میں مری جان تم آباد رہو

ہوتے ہیں خاکِ رہ بھی لیکن نہ میر ایسے — رستے میں آدھے دھڑ تک مٹی میں تم گڑے ہو

زخموں پہ اپنے نون چھڑکتے رہا کرو — دل کو مزے سے کبھی تو تنک آشنا کرو
کیا آنکھ بند کرکے مراقب ہوتے ہو تم — جاتے ہیں کیسے کیسے سمیں چشم وا کرو
ہرچند اس متاع کی اب قدر کچھ نہیں — پر جس کسو کے ساتھ رہو تم وفا کرو
تدبیر کو مزاجِ محبت میں دخل کیا — جاں کاہ اس مرض کی نہ کوئی دوا کرو
بیٹھے ہو میر ہو کے درِ کعبہ پر فقیر — اس روسیہ کے باب میں بھی کچھ دوا کرو

اگرچہ شانِ کفر ارفع ہے دیکھے اے راہباں — ایک دو ہم سوں کو بھی زنار بندھوایا کرو
شوق سے دیدار کے بھی آنکھوں میں کھنچ آیا جی — اس سمیں میں دیکھنے ہم کو بہت آیا کرو
کب میسر اس کے منہ کا دیکھنا آتا ہے میر — پھول گل سے اپنے دل کو تم بھی بہلایا کرو

کہتا ہے کون میر کہ بے اختیار رو — ایسا تو رو کہ رونے پہ تیرے ہنسی نہ ہو
سنتے نہیں کہے جو نہ کہیے تو دم رکے — کچھ پوچھیے نہ قصہ ہمارا ہے گو مگو
جب دیکھتے ہیں پاؤں ہی دابو ہو آ کے میر — کیوں ہوتے ہو ذلیل تم اتنا تو مت دبو

آنکھوں کا جھڑ برسنے سے تھمیا کم نہیں　　پل مارتے ہی پیشِ نظر ہاتھی کا ڈباؤ

میری طرف کی یارو اُس سے بات کوئی کہتے ہو کہو　　مانے نہ مانے وہ جانے پھر تم بھی منت مت کریو
کہیے سو کیا اب چپکے دیکھو تو میں اُس میں مر جاؤں　　تم کو قسم ہے حرف و سخن کی مجھ سے مروت مت کریو
ہوش نہیں اپنا تو ہمیں کچھ میر آئے ہیں پرسش کو　　جانے سے آگے اُنکو ہمارے پیارے رخصت مت کریو

دیوانِ چہارم

بعد از نماز تھے کل مے خانے کے در اوپر　　کیا جانے میر اُٹھ کر واں سے گئے کہاں کو

خرابِ عشق تو سرگشتہ ہوا ہی ہوں تم بھی　　پھرا پھرا کے مجھے گلیوں میں خراب کرو
جہاں میں دیر نہیں لگتی آنکھیں مندتے میر　　تمہیں تو چاہیئے ہر کام میں شتاب کرو

دل میر دل بروں سے چاہا کرے ہے کیا کیا　　نہ ہے انتہا نہیں ہے عاشق کی آرزو کو

لگو ہو زار یاراں رونے چلتے بات چاہت کی　　کہیں ان روزوں تم بھی میر صاحب یار عاشق ہو

تو وہ نہیں کسو کا تہِ دل سے یار ہو　　یا تجھ کو دل شکستوں سے اخلاص پیار ہو
کیا فکر میں ہو اپنی طرح داری ہی کی تم　　ہم دردمند لوگوں کے بیمار دار ہو
مصروفِ احتیاط رہا کریے رات دن　　دینے میں دل کے اپنے جو کچھ اختیار ہو
اے آہوانِ کعبہ نہ اینڈو حرم کے گرد　　کھاؤ کسو کی تیغ کسو کے شکار ہو

ہوتا ہے میر رشتۂ سخن آدمی کے اور　　افسوس اے ستم زدہ انساں ہوا نہ تو

مختلط ترسا بچوں سے شیرہ خانے میں رہا　　کن نے دیکھا ہے جاروں ہی میر کا فرکیش کو

ناز کی کوئی یہ بھی ٹھسک ہو جی کا بیکو کر ٹھاتے ہو
آتے ہو تمکین سے ایسے جیسے کہیں کو جاتے ہو

مست نہیں پر بال ہیں بکھرے پیچ گلے میں پگڑی کے
ساختہ ایسے بگڑے رہے ہو تم جیسے مدماتے ہو

موج نہیں یہ فقیر ہے اپنا جیب دریدہ دیوانا
ٹھوکر لگتے دامن کو کس ناز سے تم یاں آتے ہو

رفتہ عشق کسو کا یارو راہ چلے ہو کس کے کہے
کون رہا ہے آپ میں یاں تم کس کے تئیں سمجھاتے ہو

صبر بلا پر کرتے صاحب بے تابی کا حاصل کیا
کوئی منقلب قلبوں کا ہے میر عبث گھبراتے ہو

یاد آئے وہ کیا تڑپے ہے کیا بے تابی کرتا ہے
کوئی تسلی پھر ہوتا ہے جب تک دل کو تھام نہ لو

میر کہاں تک بے خوابی وہ میں ہوں ٹک جو سُلاتا ہو
بس جو تمہارا کچھ بھی چلے تو ایک گھڑی آرام نہ لو

چلتے جو اُس کو دیکھا جی اپنے کھنچ گئے ہیں
ہم اور میر یاں ہیں بے اختیار دونوں

جو نہ ہووے نماز کیجئے نیاز
آدمی چاہیئے کرے کچھ تو

طالع و جذبۂ زاری زرد زور
عشق میں چاہیئے ارے کچھ تو

جینا کیا ہے جہانِ فانی کا
مرتے جاتے ہیں کچھ مرے کچھ تو

سہمے سہمے نظر پڑے ہیں میر
اُس کے اطوار سے ڈرے کچھ تو

رفتنِ رنگینِ گُل رویاں سے کیا ٹھہراؤ ہو
ساتھ اُن کے چل تماشا کر لے جس کو چاؤ ہو

جی کی لاگ بلا ہے کوئی دل جینے سے اُٹھا بیٹھو
ہو کے فقیر گلی میں کسو کی رنج اُٹھاؤ جا بیٹھو

کام کی صورت اپنی پیارے کیا بگڑی ہو کیا کہیے
آؤ کبھو مدت میں یاں تو اچھے مُنہ کو بنا بیٹھو

ٹیڑھی چال سے اُنکی خالف چُپکے کھڑے کیا پھرتے ہو
سیدھی سیدھی دو چار اُس کو جرأت کر کے سُنا بیٹھو

صبر کہاں جو تم کو کہیئے لگ کے گلے سے سو جاؤ
بولو نہ بولو بیٹھو نہ بیٹھو کھڑے کھڑے ٹک ہو جاؤ

دیوان پنجم

عاشق ہو تو اپنے تئیں دیوانہ سب میں بناتے رہو
چکر مارو جیسے بگولا خاک اُڑاتے آتے رہو

دوستی جس کو لوگ کہیں ہیں جان اُسکو خصومت ہو
ہو جاوے جو تم کو کسی سے تا مقدور چھپاتے رہو

دل لگنے کی چوٹ بُری ہے اس صدمے سے زنہار حذر
بارے سعی و کوشش کوشش سے جی کو اپنے بچاتے رہو

شاعر ہو مت چُپکے رہو اب چپ میں جانیں جاتی ہیں
بات کرو ابیات پڑھو کچھ بیتیں ہم کو بتاتے رہو

ایسے قبلے سے آیا تم بھی شیخو پاس کرو
تحقیق ٹک لٹ پٹی باندھو ساختہ ہی مدّ ماتے رہو

کیا جانے وہ مائل ہووے کب ملنے کا تم سے میر
قبلہ و کعبہ اُس کی جانب اکثر آتے جاتے رہو

کڑھوں ہوں گا من مانتا میر صاحب   غم یار میں کیا فراغت ہے مجھ کو

کیا کچھ ہم سے ضد ہے تم کو بات ہماری اُڑا دو ہو
لگ پڑتے ہیں ہم تم سے تو تم اوروں کو لگا دو ہو
بند نہیں جو کرتے ہو تم سینے کے سوراخوں کو
جی کے رُکن میں ان رخنوں سے شاید دل کو ہوا دو ہو

اس راہ سے کرتا ہو دل کسب ہوا گا ہے   میرے پھٹے سینے کو زنہار نہ تم سیجو

ہر جگہ دل کش ہے اُسکے برگ گل سے جسم میں   ایک جا تو جی لگا ؤ دل کے تئیں بے جا کرد

موسم گل آیا ہے یارو کچھ میری تدبیر کرد   یعنی سایۂ سروگل میں اب مجھ کو زنجیر کرد
عاشق ہو تو ترسا بچگاں پرتا کیفیت حاصل ہو   اور کشودِ کار جو چاہو پیر مغاں کو پیر کرد
شعر کئے موزوں تو ایسے جن سے خوش ہیں صاحب دل   روویں کڑھیں جو یاد کریں اب ایسا تم کچھ میر کرد

رستے راہ میں دیکھ لیا ہو بستی میں سے نکلے تم میر   کیا جانیں ہم روز و شب تم کیدھر رستے بستے ہو
پیری میں بھی جوان رکھا ہو دُختر تاک کی صحبت نے   یعنی پی پی مئے انگوری میر ہوئی کٹ مستے ہو

منکر ہو نہ ہے کوئی سیادت کا میر کی   ذات مقدس اُن کی یہی ذات ہو تو ہو

مژہ وا کرد تمہیں غش ہی کیا کبھو حال پر بھی نظر کرد   یہی حال ہمیشہ رہا کیا تو مآل پر بھی نظر کرد

دیوان ششم

مجھے عشق اُس پاس یوں لے گیا   کوئی جیسے لاوے گنہ گار کو

محبت میں دشوار دینی ہے جان   نجانے تھے سنا سہل آزار کو
کوئی دن کرے زندگی عشق میں   جو دم لینے دیں دل کے بیمار کو
مرے مُنہ پہ رکھا ہی رنگ اب تلک   ہزار آفریں چشم خوں بار کو

عنقا سا شہرہ ہوں بہ حقیقت میں کچھ نہیں   تم دُور ہی سے نام کو میرے سُنا کرو
بیماریٔ جگر کی شفا سے تو دل ہے جمع   اب دوستی سے مصلحتاً کچھ دوا کرو
دل جانے کا فسانہ زبانوں پہ رہ گیا   اب بیٹھے دُور سے یہ کہانی کہا کرو
اب دیکھوں اُسکو میں تو مرا جی نہ چل پڑے   تم ہو فقیر میرؔ کبھو یہ دُعا کرو

مرتا مرو جیتا جیو آؤ کوئی جاؤ کوئی   ہے کام ہم لوگوں سے کیا اس دل بہ خود کام کو

اگلے سب چاہتے تھے ہم سے وفاداروں کو   کچھ تمہیں پیار نہیں کرتے جفا ماروں کو
زندگی کرتے ہیں مرنے کے لئے اہلِ جہاں   واقعہ میرؔ یہ ہے درپیش عجب یاروں کو

وہ سُخن گو فریبی چشم یار   ہم سے گویا تھی آشنا نہ کبھو

جھوٹ اُس کا نشاں نہ دو یارو   ہم خرابوں کو مت خراب کرو
میرجی رازِ عشق ہوگا فاش   چشم ہر لحظہ مت پُر آب کرو

رہتے ہیں میرؔ بے خود و وارفتہ ان دنوں   پوچھو کنایۃً کسو سے دل لگا نہ ہو

متفرقات

فاتحہ کو نہ آیا بعد از مرگ   میرؔ کے یار کی طرح دیکھو

ردیفِ ہائے ہوّز

دیوانِ اوّل

ہم ہیں مجروح ماجرا ہے یہ　　وہ نمک چھڑکے ہے مزا ہے یہ
آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم　　اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ
بس ہوا ناز ہو چکا اغماض　　ہر گھڑی ہم سے کیا ادا ہے یہ
ہے رے بیگانگی کبھو اُن نے　　نہ کہا یہ کہ آشنا ہے یہ
میر کو کیوں نہ مُغتنم جانیں　　اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ

جی چاہے مِل کسو سے یا سب سے تُو جُدا رہ　　پر ہو سکے تو پیارے ٹک دل کا آشنا رہ
کل بے تکلفی میں لطفِ اُس بدن کا دیکھا　　نکلا نہ کر قبا سے اے گل بس اب ڈھپا رہ
ہر مشتِ خاک یاں کی چاہے ہے اِک تامّل　　بن سوچے راہ مت چل ہر گام پر کھڑا رہ
جب ہوش میں تو آیا اُودھر ہی جاتے پایا　　اس سے تو میر چندے اُس کوچے ہی میں جا رہ

اب حال اپنا اُسکے ہے دل خواہ　　کیا پوچھتے ہو الحمد للہ
پیرِ مُغاں سے بے اعتقادی　　استغفر اللہ استغفر اللہ
کہتے ہیں اُس کے تو مُنہ لگے گا　　ہو یوں ہی یارب جوں ہے یہ افواہ
مُجرم ہوئے ہم دل دے کے ورنہ　　کِس کو کسو سے ہوتی نہیں چاہ
گزُرے ہے دیکھیں کیوں کر ہماری　　اُس بے وفا سے نے رسم نے راہ

ناحق اُلجھ پڑا ہے یہ مجھ سے طریقِ عشق　　جاتا تھا میر میں تو چلا اپنی راہ راہ

کہتے ہیں اُڑ بھی گئے جل کے پرِ پروانہ　　کچھ سُنی سوختگاں تم خبرِ پروانہ
بزمِ دُنیا کی تو دل سوزی سُنی ہوگی میر　　کس طرح شام ہوئی یاں سحرِ پروانہ

ہم سے کچھ آگے زمانے میں ہوا کیا کیا کچھ　　تو بھی ہم غافلوں نے آ کے کیا کیا کیا کچھ
ایک محروم چلے میرؔ ہمیں عالم سے　　ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ

ذکرِ گل کیا ہے صبا اب کہ خزاں میں ہم نے　　دل کو ناچار لگایا ہے خس و خار کے ساتھ
کس کو ہر دم ہے لہو رونے کا ہجراں میں دماغ　　دل کو اک ربط سا ہے دیدۂ خوں بار کے ساتھ

دیوانِ دوم

ہر آن ہم کو تجھ بن ایک اک برس ہوئی ہے　　کیا آگیا زمانہ اے یار رفتہ رفتہ
کیا کہیے کیونکہ جانیں بے پرواہیاں ہیں　　اس معنی کا بھی ہوگا اظہار رفتہ رفتہ
یہ ہی سلوک اس کے اکثر سہنے گئے تو　　بیٹھیں گے اپنے گھر ہم ناچار رفتہ رفتہ
پامال ہوں کہ اس میں ہوں خاک سے برابر　　اب ہو گیا ہے سب کچھ ہموار رفتہ رفتہ
گر بتکدے میں جانا ایسا ہے میرؔ جی کا　　تو یہ سبحہ ہوگا زنار رفتہ رفتہ

ہمارے کے دردِ دل کو کوئی نہیں پہنچتا　　ہر ایک بے حقیقت یاں ہے خدا رسیدہ
سائے سے اپنے وحشت ہم کو رہی ہمیشہ　　جوں آفتاب ہم بھی کیسے رہے جریدہ!

مسجد میں چل کے بیٹھے جمعہ کے دن بنے تو　　ہوتے ہیں میرؔ صاحب واں دن ڈھلے ہمیشہ

لطف کیا ہر کسو کی چاہ کے ساتھ　　چاہ وہ ہے جو ہو نباہ کے ساتھ
میرؔ سے تم برے ہی رہتے ہو　　کیا شرارت ہے خیر خواہ کے ساتھ

باغباں بے رحم گل بے دید موسم بے وفا　　آشیاں اس باغ میں بلبل نے باندھا کیا سمجھ
میرؔ کی عیاریاں معلوم لڑکوں کو نہیں　　کرتے ہیں کیا کیا ادائیں اس کو سادا سا سمجھ

کھینچتا ہے دلوں کو صحرا کچھ		ہے مزاجوں میں اپنے سودا کچھ
شہر میں حشر کیوں نہ برپا ہو		شور ہے میرے سر میں کیسا کچھ
کچھ نہ دیکھا تھا ہم نے پرتو بھی		آنکھ میں آئی یہ نہ دُنیا کچھ
اب تو بگڑے سے ہی جاتے ہیں خوباں		رنگِ صحبت نہیں ہے اچھا کچھ
وصل اُس کا خُدا نصیب کرے		میرؔ دل چاہتا ہے کیا کیا کچھ

یہ جو مُہلت جسے کہیں ہیں عُمر		دیکھو تو انتظار سا ہے کچھ
مُنہ نہ ہم جبریوں کا کھُلواؤ		کہنے کو اختیار سا ہے کچھ
منتظر اُس کی گردِ راہ کے تھے		آنکھوں میں سو غبار سا ہے کچھ
کیا ہے دیکھو ہو جو ادھر ہر دم		اور چتون میں پیار سا ہے کچھ

ہم نے تو ناخنوں سے مُنہ سارا نوچ ڈالا
اب کوہ کن دکھاوے رکھتا ہے گر ہُنر کچھ

گہ شیفتہ ہیں مُو کے گہ باؤلے ہیں رُو کے
احوال میرؔ جی کا ہے شام کچھ سحر کچھ

دیوانِ سوم

کہتے تو ہیں کہ ہم کو اُسکی طلب نہیں کچھ		پر جی اُسی کو اپنا ڈھونڈے ہے ڈھب نہیں کچھ
یہ حال بے سبب تو ہوتا نہیں ہے لیکن		رونے کا لمحہ لمحہ ظاہر سبب نہیں کچھ
کر عشق میرؔ اُس کا مارے کہیں نہ جاویں		جلدی مزاج میں ہے اُس سے عجب نہیں کچھ

میرؔ کعبے سے قصدِ دیر کیا		جاؤ پیارے بھلا خُدا ہمراہ

جانے دے مت اسقدر اب زلف و خط و خال دیکھ — حال کچھ بھی تجھ میں ہے اے میر اپنا حال دیکھ
چشم و دل کا اس سے لگ جانا تو تھا جس تس طرح — جی بھی ان باتوں میں اُلجھا اور یہ جنجال دیکھ

سودائے عاشقی میں تو جی کا زیان ہے — پھرتے ہیں میر ڈھونڈتے ہی سُود ہر جگہ

نہ باتیں کرو سرگرانی کے ساتھ — مری زیست ہے مہربانی کے ساتھ
نہ اُٹھ کر در یار سے جا سکے — یہ کم لطف ہے ناتوانی کے ساتھ
جلا جی بہت قصۂ میر سُن — بلا سوز تھا اُس کہانی کے ساتھ

کیا کریں نیچی نظر کرنے سے غصہ کھائے وہ — اور مجلس میں جو رہیئے دیکھ تو شرمائے وہ
لُطف سے لب ریز ہے اُس کا م جاں کا سب بدن — مختلط ہو جائے ہم سے جو کبھو تو ہائے وہ
میر کو واشد نہیں ہے مقصد اُس کا اور ہے — عشق سے لڑکوں کے دل کو کب تلک بہلائے وہ

دیوان چہارم

مُنہ کر بھی میری جانب سوتا نہیں کبھو وہ — کیا جانوں اُسکے جی میں ہے اس طرف سے کیا کچھ
کب تک یہ بدشرابی پیری تو میر آئی — جانے کے ہو تہیّا اب کر چلو بھلا کچھ

کیا کیا دیدہ درائی سی ہم کرتے رہے ہیں اس عالم میں — تم سے آگے خو ہو صاحب نہیں ہوا ہے کیا کیا کچھ

دیوان پنجم

اپنے ستم ناچار معیشت کرنی پڑی ہر خار کے ساتھ — جان عزیز گئی ہوتی کاش اب کی سال بہار کے ساتھ
وہ لحظہ نہیں جاتا جی سے آنکھ لڑائی تھی جب اس سے — چاہ نکلتی تھی باتوں سے چتون بھی تھی پیار کے ساتھ
میر سے ہیں بیمار محبّت ہم سے قطع اُمید کرو — جانیں ہی جاتی دیکھیں ہیں ہم نے آخر اس آزار کے ساتھ

کیا جانوں میں چمن کو ولیکن قفس پہ میر   آتا ہے برگِ گل کبھو کوئی صبا کے ساتھ

دیوانِ ششم

ہر چند جذبِ عشق سے تشریف یاں بھی لائے وہ   پر خود گم ایسا میں نہیں جو سہل مجھ کو پائے وہ
مارا ہوا چاہت کا جو آوارہ گھر سے اپنے ہو   حیراں پریشاں پھر کے پھر کیا جانے کیدھر جائے وہ

اب دل خزاں میں رہتا ہے جی کی رکن کے ساتھ   جانا ہی تھا ہمیں بھی بہارِ چمن کے ساتھ
ہم باغ سے خزاں میں گئے پر ہزار حیف   جانا بنا نہ اپنا گل و یاسمن کے ساتھ
کیا جانیں لوگ عشق کا راز و نیاز میر   اک بات اُس سے ہو گئی دو دو بچن کے ساتھ

مرتے ہیں ہم تو اُس صنمِ خود نما کے ساتھ   جیتے ہیں وے ہی لوگ جو تھے کچھ خدا کے ساتھ
تھا جذب آگے عشق سے جو ہر نفس میں میر   اب وہ کشش نہیں ہے سحر کی دعا کے ساتھ

دل لیا جس غمیں کا تو نے شوخ   دے گیا جی ہی اک سرور سے وہ
خوش ہیں دیوانگی میر سے سب   کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ

ملنا نہ ملنا ٹھہرے تو دل بھی اپنا ٹھہرے   اقرار ہے ہمیشہ انکار ہے ہمیشہ

دل ہے میری بغل میں صد پارہ   اور ہر پارہ اُس کا آوارہ
کام اُس سے بگڑ کر نہ لیا   ہیچ کارہ بھی ہو وہ ناکارہ
کیا بنے اس سے میر مشکل ہیں   وہ جفا پیشہ و ستم کارہ

ردیف یائے تحتانی

دیوانِ اوّل

ہمت اپنی ہی تھی یہ میرؔ کہ جوں مرغِ خیال   اک پرافشانی میں گزرے سرِ عالم سے بھی

آج پھر تھا بے حمیت میرؔ واں   کل لڑائی سی لڑائی ہو چکی

دل کس قدر شکستہ ہوا تھا کہ رات میرؔ   آئی جو بات لب پہ سو فریاد ہو گئی

اُس کے ایفائے عہد تک نہ جیئے   عمر نے ہم سے بے وفائی کی
وصل کے دن کی آرزو ہی رہی   شب نہ آخر ہوئی جُدائی کی
اسی تقریب اُس گلی میں رہے   منتیں ہیں شکستہ پائی کی
زور و زر کچھ نہ تھا تو بارے میرؔ   کس بھروسے پہ آشنائی کی

آتشِ رنگِ گُل سے کیا کہیئے   برق تھی آشیان پر آئی

بات شکوے کی ہم نے گاہ نہ کی   بلکہ دی جان اور آہ نہ کی
کعبے سو بار وہ گیا تو کیا   جس نے یاں ایک دل میں راہ نہ کی
جس سے تھی چشم ہم کو کیا کیا میرؔ   اس طرف اُن نے اک نگاہ نہ کی

کل میرؔ نے کیا کیا کی مے کیلئے بے تابی   آخر کو گرو رکھا سجّادۂ محرابی
دن رات مری چھاتی جلتی ہے محبت میں   کیا اور نہ تھی جاگہ یہ آگ جو یاں دابی
کل میرؔ جو یاں آیا طور اُسکا بہت بھایا   وہ خشک لبی تس پر جامہ گلے میں آبی

ہمیں آمدِ میرؔ کل بھا گئی   طرح اُس میں مجنوں کی سب پا گئی

کہاں کا غبار آہ دل میں یہ تھا — مری خاک بدلی سی سب چھا گئی
کیا پاس بلبل خزاں نے نہ کچھ — گل و برگ بے درد پھیلا گئی
ہوئی سامنے یوں تو ایک ایک کے — ہمیں سے وہ کچھ آنکھ شرما گئی
کوئی رہنے والی ہے جان عزیز — گئی گر نہ امروز فردا گئی
کئے دست و پا گم جو میر آگیا — وفا پیشہ مجلس اُٹھے پا گئی

ہر شب تری گلی میں عالم کی جان جاوے — آگے ہوا ہے اب تک ایسا ستم کہیں بھی
زیرِ فلک جہاں تک آسودہ میر ہوتے — ایسا نظر نہ آیا اک قطعۂ زمیں بھی

عجب کچھ ہے گر میر آوے میسر — گلابی شراب اور غزل اپنے ڈھب کی

کس پاس جاکے بیٹھوں خرابی میں ہائے ہائے — مجنوں کو موت کیسی شتابی میں آگئی
سودا جو اُس کے سر سے گیا زلفِ یار کا — تو تو بڑی ہی میر کے سر سے بلا گئی

کیا جلی جاتی ہے خوبی ہی میں اپنی اے شمع — کہہ پتنگے کی بھی کچھ شام و سحر کرنے کی
اب کی برسات ہی کے ذمے تھا عالم کا وبال — میں تو کھائی تھی قسم چشم کے تر کرنے کی
ان دنوں نکلے ہے آغشتہ بخوں راتوں کو — دُھن ہے نالے کو کسو دل میں اثر کرنے کی
عشق میں تیرے گزرتی نہیں بن سر پٹکے — صورت اک یہ رہی ہے شب بسر کرنے کی

ترے کوچے کے شوقِ طوف میں جیسے بگولا تھا — بیاباں میں غبارِ میر کی ہم نے زیارت کی

بے طاقتی سے آگے کچھ پوچھتا بھی تھا سو — رونے نے ہر گھڑی کے وہ بات ہی ڈبوئی
بُلبل کی بے کلی نے شب بے دماغ رکھا — سونے دیا نہ ہم کو ظالم نہ آپ سوئی

ملائی خوب مرے خوں میں خاکِ بسمل گاہ — یہ تھوڑی منتیں ہیں مجھ پہ سخت جانی کی

لاعلاجی سے جو رہتی ہے مجھے آوارگی — کیجئے کیا میر صاحب بندگی بیچارگی
کیسی کیسی صحبتیں آنکھوں کے آگے سے گئیں — دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا یک بارگی

دو دن سے کچھ بنی تھی سو پھر شب بگڑ گئی — صحبت ہماری یار سے بے ڈھب بگڑ گئی
باہم سلوک تھا تو اٹھاتے تھے نرم گرم — کاہے کو میر کوئی دبے جب بگڑ گئی

کچھ موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی — شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی
دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے — جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی
اس کی تو دل آزاری بے ہیچ ہی تھی یارو — کچھ تم کو ہماری بھی تقصیر نظر آئی

ہو گئی شہر شہر رسوائی — اے مری موت تو بھلی آئی
میر جب سے گیا ہے دل تب سے — میں تو کچھ ہو گیا ہوں سودائی

نشمردہ مرے منہ سے یاں حرف نہیں نکلا — جو بات کہ میں نے کی سو میر حسابی کی

ہاں خدا مغفرت کرے اس کو — صبر مرحوم تھا عجب کوئی
بعد میرے ہی ہو گیا سنسان — سونے پایا تھا ورنہ کب کوئی
اور مجنوں بھی ہم سنے تھے دلے — میر سا ہو سکے ہے کب کوئی

آگے ہمارے عہد سے وحشت کو جا نہ تھی — دیوانگی کسو کی بھی زنجیر پا نہ تھی
بیگانہ سا لگے ہے چمن اب خزاں میں ہائے — ایسی گئی بہار مگر آشنا نہ تھی
پژمردہ اس قدر ہیں کہ ہے شبہ ہم کو میر — تن میں ہمارے جان کبھو تھی بھی یا نہ تھی

ابر مت گور غریباں پہ برس غافل آہ — ان دل آزردوں کے بھی جی میں لہر آ دے گی
میر میں جیتوں میں آؤنگا اسی دن جس دن — دل نہ تڑپے گا مرا چشم نہ بھر آ دے گی

کیا کروں شرح خستہ جانی کی   میں نے مر مر کے زندگانی کی
حال بد گفتنی نہیں میرا   تم نے پوچھا تو مہربانی کی
جس سے کھوئی تھی نیند میر نے کل   ابتدا پھر وہی کہانی کی

کیونکہ کہیئے کہ اثر گریۂ مجنوں کو نہ تھا   گرد نم ناک ہے اب تک بھی بیابانوں کی
خانقہ کا تو نہ کر قصد ٹک اے خانہ خراب   یہی اک رہ گئی ہے بستی مسلمانوں کی
سیل اشکوں سے بہے مرضہ آہوں سے اڑے   مجھ سے کیا کیا نہ خرابی ہوئی ویرانوں کی
سرگزشتیں نہ مری سن کہ اچٹتی ہے نیند   خاصیت یہ ہے مری جان ان افسانوں کی
مے کدے سے تو ابھی آیا ہے مسجد میں میر   ہو نہ لغزش کہیں مجلس ہے یہ بیگانوں کی

دل اس کے گیسوسے یوں لگ چلا تو   یہ اک اپنے جی کی بلا کیا نکالی
پھرے در بدر میر چلاّنے پھرنے   گدا تو ہوئے پر صدا کیا نکالی

رہی نہ گفتہ مرے دل میں داستاں میری   نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری
برنگ صوت جرس تجھ سے دور ہوں تنہا   خبر نہیں ہے تجھے آہ کارواں میری
ترے نہ آج کے آنے میں صبح کے مجھ پاس   ہزار جائے گئی طبع بدگماں میری
ترے فراق میں جیسے خیال مفلس کا   گئی ہے فکر پریشاں کہاں کہاں میری

اب کے بھی سیر باغ کی جی میں ہوس رہی   اپنی جگہ بہار میں کنج قفس رہی
میں پاشکستہ جا نہ سکا قافلے تلک   آتی اگرچہ دیر صدائے جرس رہی
لطف قبائے تنگ پہ گل کا بجا ہے ناز   دیکھی نہیں ہے اُن نے تری چولی چس رہی
خالی شگفتگی سے جراحت نہیں کوئی   ہر زخم یاں ہے جیسے کلی ہو بکس رہی
جوں صبح اس چمن میں نہ ہم کھل کے ہنس سکے   فرصت رہی جو میر بھی سو اک نفس رہی

آج کل بے قرار ہیں ہم بھی   بیٹھ جا چلنے ہار ہیں ہم بھی

آن میں کچھ ہیں آن میں کچھ ہیں — تحفۂ روزگار ہیں ہم بھی
منع گریہ نہ کر تو اے ناصح — اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی
گرزِ خود رفتہ ہیں تیرؔ نزدیک — اپنے تو یادگار ہیں ہم بھی
میرؔ نام اک جواں سُنا ہوگا — اُسی عاشق کے یار ہیں ہم بھی

دیکھیں تو سہی کب تئیں نبھتی ہے یہ صحبت — ہم جی سے ترے دوست ہیں تو دشمن جانی
اک شخص مجھی سا تھا کہ وہ تجھ پہ تھا عاشق — وہ اُس کی وفا پیشگی وہ اُس کی جوانی
یہ کہہ کے جو رویا تو لگا کہنے نہ کہہ میرؔ — سُنتا نہیں میں ظلم رسیدوں کی کہانی

کل بارے ہم سے اُس سے مُلاقات ہو گئی — دو دو بچن کے ہونے میں اک بات ہو گئی
کتنے خلاف وعدہ ہوا ہوگا وہ کہ یاں — نومیدی و اُمید مساوات ہو گئی
اپنے تو ہونٹ بھی نہ ہلے اُسکے روبرو — رنجش کی وجہ میرؔ وہ کیا بات ہو گئی

قفس میں میرؔ نہیں جوشِ داغ سینے پر — ہوس نکالی ہے ہم نے بھی گُل کے موسم کی

رکھنا نہ تھا قدم یاں جوں بادِ بے تامّل — سیر اس جہاں کی رہرو پر تُو نے سرسری کی
یہ دَور تو موافق ہوتا نہیں مگر اب — رکھیئے بنائے تازہ اس چرخِ چنبری کی
خوباں تمہاری خوبی تا چند نقل کریئے — ہم ریختہ خاطروں کی کیا خوب دلبری کی

دیوانِ دوم

ہم سے دیکھا کہ محبت نے ادا کیا کیا کی — ایک دل قطرۂ خوں تس پہ جفا کیا کیا کی

کچھ کرو فکر مجھ دِوانے کی — دھوم ہے پھر بہار آنے کی
وہ جو پھرتا ہے مجھسے دُور ہی دُور — ہے یہ تقریب جی کے جلنے کی

تیز یوں ہی نہ تھی شب آتشِ شوق — تھی خبر گرم اُس کے آنے کی
جو ہے سو پائمالِ غم ہے میر — چال بے ڈول ہے زمانے کی

میر دریا ہے سُنے شعر زبانی اُس کی — اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اُس کی
خاطرِ بادیہ سے دیر میں جاوے گی کہیں — خاک مانند بگولے کے اُڑانی اُس کی
ایک ہے عہد میں اپنے وہ پراگندہ مزاج — اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اُس کی
مُنہ تو بوچھار کا دیکھا ہے برستے تم نے — اسی انداز سے تھی اشک فشانی اُس کی
بات کی طرز کو دیکھو تو کوئی جادو تھا — پر ملی خاک میں کیا سحر بیانی اُس کی
کر کے تعویذ رکھیں اُس کو بہت بھاتی ہے — وہ نظر پاؤں پہ وہ بات دِوانی اُس کی
اُس کا وہ عجز تمہارا یہ غرورِ خوبی — منتیں اُس نے بہت کیں پہ نہ مانی اُس کی
کچھ لکھا ہے تجھے ہر برگ پہ اے رشکِ بہار — رقعہ واریں ہیں یہ اوراقِ خزانی اُس کی
سرگزشت اپنی کس اندوہ سے شب کہتا تھا — سو گئے تم نہ سُنی آہ کہانی اُس کی
مرثیے دل کے کئی کہہ کے دیئے لوگوں کو — شہرِ دلّی میں ہے سب پاس نشانی اُس کی
آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہی — دردمندی میں گئی ساری جوانی اُس کی
اب گئے اُس کے جز افسوس نہیں کچھ حاصل — حیف صد حیف کہ کچھ قدر نہ جانی اُس کی

کی سیر ہم نے سینۂ یک سر فگار کی — اس تختے نے ہے اب کی قیامت بہار کی
دریائے حسنِ یار تلاطم کرے کہیں — خواہش ہے اپنے جی میں بھی بوس و کنار کی
مقدور تک تو ضبط کروں ہوں پہ کیا کروں — مُنہ سے نکل ہی جاتی ہے اک بات پیار کی
کیا جانوں چشمِ تر سے اُدھر دل پہ کیا ہوا — کس کو خبر ہے میر سمندر کے پار کی

یہ جور و جور کش تھے کہاں آگے عشق میں — تجھ سے جفا و میر سے رسمِ وفا چلی

خانہ آباد کعبے میں تھا میر — کیا خدائی خراب ہے وہ بھی

یار بن تلخ زندگانی تھی   دوستی مدعی جانی تھی
سر سے اُس کے ہوا گئی نہ کبھو   عمر برباد یوں ہی جانی تھی
لطف پر اُس کے ہم نشیں مت جا   کبھو ہم پر بھی مہربانی تھی
ہاتھ آتا جو تو تو کیا ہوتا   برسوں تک ہم نے خاک چھانی تھی
میر قصے سے سب گئیں نیندیں   کچھ عجب طور کی کہانی تھی
عاشقی جی ہی لے گئی آخر   یہ بلا کوئی ناگہانی تھی
پھر سخن نشنوی ہی دیسی ہی   رات اک وہ بات مانی تھی
فقر پر بھی تھا میر کا ک رنگ   کفنی پہنی سو زعفرانی تھی

دیوانگی سے اپنی ہے اب ساری بات خبط   افراطِ اشتیاق سے وہ مت نہیں رہی
پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ   افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

عشق میں ذلت ہوئی خفت ہوئی تہمت ہوئی   آخر آخر جان دی یاروں نے یہ نوبت ہوئی
مر گیا آوارہ ہو کر میں تو جیسے گرد باد   پر جسے یہ واقعہ پہنچا اُسے وحشت ہوئی
کم کسو کو میر کی میت کی ہاتھ آئی نماز   نعش پر اُس بے سر و پا کی بلا کثرت ہوئی

باؤلے سے جب تلک بکتے تھے سب کرتے تھے پیار   عقل کی باتیں کیاں کیا ہم سے نادانی ہوئی
شیخ مت یادِ بتاں کو رات کا سا ذکر جان   یہ صنم کوئی ہماری کیا خدا خوانی ہوئی

بُتوں سے آنکھ کیوں میں نے لڑائی   طرف ہے مجھ سے اب ساری خُدائی
بگڑتی ہی گئی صورت ہماری   گئے پر دل کے پھر کچھ بن نہ آئی
کہا تھا میں نہ دیکھو غیر کی اور   سو تم نے آنکھ مجھ سے ہے چھُپائی
جفا اُس کی نہ پہنچی انتہا کو   دریغا عُمر نے کی بے وفائی
گلے اُس مہ نے لگ کر ایک دو رات   مہینوں تک مری چھاتی جلائی

گو اُس رُخِ مہتابی سے واں چاند نی چھٹکی — یاں رنگ شکستہ سے بھی چھٹتی ہے ہوائی
میں دیر پہنچ کے نہ کیا قصدِ حرم پھر — اپنی سی جرس نے کی بہت ہرزہ درائی

تجھ بن بیٹھے گھٹا جاتا ہے جی — کاہشیں کیا کیا اُٹھا جاتا ہے جی
یوں تو [illegible] ہم — پر وہ آتا ہے تو آ جاتا ہے جی
عشق آدم میں نہیں کچھ چھوڑتا — ہوتے ہوتے [illegible] ہے جی
آتے ہیں [illegible] کی — حیف ہے [illegible] جاتا ہے جی
رکھتے تھے کیا کیا بنائیں پیشتر — [illegible] اب آپ ہی ڈھا جاتا ہے جی
آسماں شاید [illegible] — [illegible] سے کیا کیا رُکا جاتا ہے جی

مزاجوں میں یاس آگئی ہے ہمارے — نہ مرنے کا غم ہے نہ جینے کی شادی
وفا لوگ آگے ہیں کرتے تھے آگے — یہ رسم کہن آہ تم نے اُٹھا دی

دیوان سوم

تدبیرِ غمِ دل کی بستی میں نہ ٹھیرائی — جنگل میں نکل آئے کچھ واں بھی نہ بن آئی
آزار بہت کھینچے اب میرؔ تو کا ہے — کھینچی نہ گئی ہم سے ہر ایک کی مرزائی

خلوتِ یار ہے عالم عالم ایک نہیں ہے ہم کو بار — در پر جا کر بیٹھ آتے ہیں خوب ہماری عزت کی
دکھن پورب پچھم سے لوگ آکر مجھکو دیکھیں ہیں — حیف کہ پروا تم کو نہیں ہے مطلق میری صحبت کی
دوستی یاری اُلفت باہم عہد میں اُسکے رسم نہیں — یہ جانے ہیں مہر و وفا اک بات ہو گویا مدت کی
آبِ حسرت آنکھوں میں اُس کی نومیدانہ پھرتا تھا — میرؔ نے شاید خواہش دل کی آج کوئی پھر رخصت کی

کہی میں اُن لبوں کی جاں فزائی — یہ بات اک بے خودی میں منہ پہ آئی
تعارف کیا رہا اہلِ چمن سے — ہوئی اک عمر میں اپنی رہائی

کہاں کا بے ستوں فرہاد کیسا　　یہ تھی سب عشق کی زور آزمائی
موافق ٹک ہو تو تو پھر جہاں میں　　مثل ہو میری تیری آشنائی
ہوئے ہیں درد دل سے میر کے تنگ　　پھر اس جوگی نے یاں دھونی لگائی

خوشش طرح مکاں دل کو ڈھانے میں شتابی کی　　اس عشق و محبت نے کیا خانہ خرابی کی

دخیل ذات نہیں عشق میں کہ میر کو دیکھ　　ذلیل کیسے ہیں اُن کی ہے گو کہ ذات بڑی

عجب چوپڑ بچھی ہے ہر زماں اُڑتا ہے رنگ اپنا　　سمجھ میں چال کچھ آتی نہیں اپنے زمانے کی

بات کیا آدمی کی بن آئی　　آسماں سے زمین نپوائی
چرخ زن اس کے واسطے ہے مدام　　ہو گیا دن تمام رات آئی
ماہ و خورشید و ابر و باد سبھی　　اُس کی خاطر ہوئے ہیں سودائی
اُس کو ترجیح سب کے اوپر ہے　　لطف حق نے کی عزت افزائی
حیرت آتی ہے اس کی باتیں دیکھ　　خودسری خودستائی خودرائی

دیوان چہارم

باندھا احرام آخر تہ کر دل کی اور توجہ کی　　در پہ حرم کے اس لئے تھے ہم کوئی ملے گا محرم بھی
دیکھ ہوا کو طائر گلشن کس حسرت سے کہتے تھے　　گُل ہی چلے جاتے نہیں یاں سے چلنے کو بیٹھے ہیں ہم بھی

کھپ ہی جاتا ہے آدمی اے میر　　آفت جاں ہے عشق کا غم بھی

اکثر کی بے دماغی ہر دم کی سرگرانی　　اب کب گئی اُٹھائی ہے زور ناتوانی
مرزائی فقر میں بھی دل سے گئی نہ میرے　　چہرے کے رنگ اپنی چادر کی زعفرانی

یوں میر تو غم اپنا برسوں کہا کریں گے　　　اب رات کم ہے سو و بس ہو چکی کہانی

سنو سرگزشت اب ہماری زبانی　　　سنی گرچہ جاتی نہیں یہ کہانی
گرامی گہر میر سا تھا ہمارا　　　و لے عشق میں قدر ہم نے نہ جانی

میر کا حال نہ پوچھو کچھ تم کہنہ رباط سپہری میں　　　رقص کناں بازار تک آئے عالم میں رسوائی ہوئی

آج ہمیں بے تابی سے ہی صبر کی دل سے رخصت تھی
چاروں اور نگہ کرنے میں عالم عالم حسرت تھی
کس محنت سے محبت کی تھی کس خواری سے یاری کی
رنج ہی ساری عمر اٹھایا کلفت تھی یا الفت تھی
بدنامی کیا عشق کی کہیے رسوائی سی رسوائی ہے
صحرا صحرا وحشت بھی تھی دنیا دنیا تہمت تھی
عہد ہمارا تیرا ہے یہ جس میں گم ہے مہر و وفا
اگلے زمانے میں تو یہی لوگوں کی رسم و عادت تھی
جو اٹھتا ہے یاں سے بگولا ہم سا ہے آوارہ کوئی
اس وادی میں میر مگر سرگشتہ کسو کی تربت تھی

دیوان پنجم

رات کو تھا کعبے میں میں بھی شیخ حرم سے لڑائی ہوئی
سخت کدورت بیچ میں آئی صبح تلک نہ صفائی ہوئی
حوصلہ داری کیا ہے اتنی قدرت کچھ ہے خدا ہی کی
عالم عالم جہاں جہاں جو غم کی ہم میں سمائی ہوئی
یہ یہ بلائیں سر پر ہیں تو آج موئے کل دوسرے دن
یاری ہوئی بیماری ہوئی درد کشی ہوئی تنہائی ہوئی

اتنے لوگوں میں چشم کسو کی قہر قیامت آفت ہے
تم نے دیکھی نہیں ہے صاحب آنکھ کوئی شرمائی ہوئی
ہم قیدی بھی موسمِ گُل کی کب سے توقع رکھتے تھے
دیر بہار آئی اب کی پہ اسیروں کی نہ رہائی ہوئی
کہنا جو کچھ جس سے ہوگا سامنے میر کہا ہوگا
بات نہ دل میں پھر گئی ہوگی مُنہ پر میرے آئی ہوئی

مستی حُسن پرستی رندی یہی عمل ہے مدت سے
پیر کبیر ہوئے تو کیا ہے چھوٹے ہے معمول کوئی
حرف و حکایت شکر و شکایت تھی تو اک وضع دو طیرہ پر
میر کو جا کر دیکھا ہم نے ہے مردِ معقول کوئی

ملو ان دنوں ہم سے اک رات جانی
کہاں ہم کہاں تم کہاں پھر جوانی
شکایت کروں ہوں تو سونے لگے ہو
مری سر گزشت اب ہوئی ہے کہانی
ملاقات ہوتی ہے تو کشمکش سے
یہی ہم سے ہے جب تب اینچا تانی

عشق کیا سو جان چلی ہے اُلفت تھی یا کُلفت تھی
ٹوٹے گئے ہیں سب اعضا یہ محبت تھی یا محنت تھی
اب تو نڈھال پڑے رہتے ہیں ضعف ہی اکثر رہتا ہے
آئے گئے اُس کے کوچے میں جب تک جی میں طاقت تھی
آنسو ہو کر خونِ جگر کا بے تابانہ آیا تھا
شاید رات شکیبائی کی جلد بہت کچھ رخصت تھی

دل کی لاگ بُری ہوتی ہے رہ نہ سکے ٹک جائے بھی
آئے بیٹھے اُٹھ بھی گئے بیتاب ہوئے پھر آئے بھی
آنکھ نہ ٹک میلی ہوئی اپنی مطلق دل بے جا نہ ہوا
دل کی مصیبت کیسی کیسی کیا کیا رنج اُٹھائے بھی

تاجر ترک فقیر ہوئے اب شاعر عالم کامل ہیں
پیش گیا کچھ میر نہ اپنے سوانگ بہت لائے بھی

روٹھے جو تھے سو ہم سے روٹھے ہوئے وداعی
کیا رو دیئے ہمیں تو منت بھی کی نہ آئی

کیا رات دن کٹے ہیں ہجراں کی بیخودی میں
شدت ایسی میر اُس بن دو دو پہر نہ آئی

[illegible]
[illegible]

جنون کے انداز سے ظالم مرا ہر وقت پیدا ہے
[illegible] آنکھ لہو کی چھپائی ہوئی

دیوان ششم

یار نے ہم سے بے ادائی کی
وصل کی رات میں لڑائی کی

بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ
اب توقع نہیں رہائی کی

جور اُس سنگدل کے سب کھینچے
عمر نے سخت بے وفائی کی

میر کی بندگی میں جا بارے
سیر سی ہو گئی خدائی کی

مدت سے تو دلوں کی ملاقات بھی گئی
ظاہر کا پاس تھا سو مدارات بھی گئی

کچھ کہتے آکے ہم تو سنا کرتے وہ خموش
اب ہر سخن پہ بحث ہے وہ بات بھی گئی

عمامہ جا نماز گئے لے کے مغ بچے
واعظ کی اب لباسی کرامات بھی گئی

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

طبیعت نے عجب کل یہ ادا کی
کہ ساری رات وحشت ہی رہا کی

مجھی کو ملنے کا ڈھب کچھ نہ آیا
نہیں تقصیر اُس نا آشنا کی

انھیں نے پردے میں کی شوخ چشمی — بہت ہم نے تو آنکھوں کی حیا کی
جواں ہونے کی اُس کے آرزو تھی — سو اب بارے ہمیں سے یہ جفا کی
ملا اب تو نہ وہ مِلنا تھا اُس کا — نہ ہم سے دیر آنکھ اُس کی ملا کی

مدّت سے پاتے جفا رہے ہیں مدّت گلخن تابی کی
برسوں ہوئے ہیں گھر سے نکلے عشق نے خانہ خرابی کی
عشق میں میر کسو سے اِتنا اب تمسخر ہم پہ نہ تھا
حرفِ بد جو منہ سے نکلا اُن نے اب بے تابی کی

وے سبھی موئی دو گرفتاری — دزدِ غمزوں کی دلبری عیاری
اب کی دل اُن سے سبھی گیا تو کیا — چور جاتے رہے کہ اندھیاری
شور و فریاد و زاری شب ہے — شہریوں کو ہے مجھ سے بیزاری
چلے جاتے ہیں رات دن آنسو — دیدۂ تر کی نہر ہے جاری
مر رہیں اس میں یار ہیں جیتے — شیوہ اپنا تو ہے وفاداری
میر جینے سے کیوں ہو غافل تم — سب کے ہاں ہو رہی ہے تیاری

دلگیر کیونکہ ہوگی اس سفلہ خو کی صحبت — دیوانگی یہ اِتنی وہ اِتنا لاابالی
اِتنی سڈول دیہی دیکھی نہ ہم سُنی ہے — ترکیب اُس کی گویا سانچے میں کی ہو ڈھالی
وصل و فراق دونوں بحالی ہی میں گزرے — اب تک مزاج کی میں پاتا نہیں بحالی

ردیفِ یائے مجہول

دیوانِ اوّل

دیکھ تو دل کہ جاں سے اُٹھتا ہے — یہ دُھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے
خانۂ دل سے زینہار نہ جا — کوئی ایسے مکاں سے اُٹھتا ہے

شدّہ لے گھر کی بھی شعلۂ آواز — دُود کچھ آشیاں سے اُٹھتا ہے
یوں اُٹھے آہ اُس گلی سے ہم — جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے
عشق اک میرؔ بھاری پتھر ہے — کب یہ تجھ ناتواں سے اُٹھتا ہے

کروں کیا حسرتِ گُل کو وگرنہ — دلِ پُر داغ بھی اپنا چمن ہے
جو دے آرام ٹک آوارگی میرؔ — تو شامِ غربت اک صبحِ وطن ہے

گُل گشت کی ہوس تھی سو تو بگیر آئے — آئے جو ہم چمن میں ہو کر اسیر آئے
دلّی میں اب کی آکر اُن یاروں کو نہ دیکھا — کچھ دے گئے شتابی کچھ ہم ہی دیر آئے

گر ٹھیئے نہ رد یئے تو اوقات کیونکہ گزرے — رہتا ہے مشغلہ سا بارِ غم والم سے

گئے جی سے چھوٹے بتوں کی جفا سے — یہی بات ہم چاہتے تھے خدا سے
نہ شکوہ شکایت نہ حرف وحکایت — کہو میرؔ جی آج کیوں ہو خفا سے

اندوہِ وصل وہجر نے عالم کھپا دیا — ان دو ہی منزلوں میں بہت یار تھک گئے

عشق اُن کو ہے جو یار کو اپنے دمِ رفتن — کرتے نہیں غیرت سے خدا کے بھی حوالے

برنگ بوئے گُل اس باغ کے ہم آشنا ہوتے — کہ ہمراہِ صبا ٹک سیر کرتے پھر ہوا ہوتے
الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش — ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے
کہیں جو کچھ ملامت گر بجا ہے میرؔ کیا جانے — اُنھیں معلوم تب ہوتا کہ ویسے سے جدا ہوتے

یہ وہ کارواں گاہ دل کش ہے میرؔ — کہ پھریاں سے حسرت ہی ہمراہ ہے

عشق میں نے خوف و خطر چاہیئے　　جان کے دینے کو جگر چاہیئے
خوف قیامت کا یہی ہے کہ میر　　ہم کو جیا بار دگر چاہیئے

نازکی اُس کے لب کی کیا کہیئے　　پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
بار بار اُس کے در پہ جاتا ہوں　　حالت اب اضطراب کی سی ہے
میر اُن نیم باز آنکھوں میں　　ساری مستی شراب کی سی ہے

اب جو اک حسرتِ جوانی ہے　　عمرِ رفتہ کی یہ نشانی ہے
باں ہوئے میر ہم برابر خاک　　واں وہی ناز و سرگرانی ہے

کہاں تک دُور بیٹھے بیٹھے کہیئے　　کبھو تو پاس ہم کو بھی بُلالے
ستایا میر غم کش کو کنھوں نے　　کہ پھر اب عرش تک جاتے ہیں نالے

بے طاقتیٔ دل نے سائل بھی کیا ہم کو　　پر میر فقیروں کی یاں کون صدا مانے

دل کے معمور رہے کی مت کر فکر فرصت چاہیئے　　ایسے ویرانے کے اب بسنے کو مدّت چاہیئے
عشق میں وصل و جُدائی سے نہیں کچھ گفتگو　　قُرب و بُعد اس جا برابر ہے محبّت چاہیئے
تنگ مت ہو ابتدائے عاشقی میں اس قدر　　خیریت ہے میر صاحب دل سلامت چاہیئے

بے یار شہر دل کا ویران ہو رہا ہے　　دکھلائی دے جہاں تک میدان ہو رہا ہے

صنّاع طُرفہ ہیں ہم عالم میں ریختے کے　　جو میر جی لگے گا تو سب ہُنر کریں گے

شب کوتہ اور قصّہ اُن کا دراز ورنہ　　احوال میر صاحب ہم تجھ کو سب سُناتے

بہت دُور کوئی رہا ہے مگر — کہ فریاد میں ہے جرس شور سے

تھا بلا ہنگامہ آرا میرؔ بھی — اب تلک گلیوں میں اُس کا شور ہے

زُلف کسی کی ہو کہ ہو خال و خط — دل کو گرفتار رہا چاہیئے

اِس اسیری کے نہ کوئی اے صبا پالے پڑے — اک نظر گل دیکھنے کے بھی ہمیں لالے پڑے

رنج کھینچے تھے داغ کھائے تھے — دل نے صدمے بڑے اُٹھائے تھے
پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ — کتنے آنسو پلک تک آئے تھے
وہی سمجھا نہ ورنہ ہم نے تو — زخم چھاتی کے سب دکھائے تھے
کچھ نہ سمجھے کہ تجھ سے یاروں نے — کس توقع پہ دل لگائے تھے
فرصتِ زندگی سے مت پوچھو — سانس بھی ہم نہ لینے پائے تھے
میرؔ صاحب رُلا گئے سب کو — کل وے تشریف یاں بھی لائے تھے

خوب ہے اے ابر اک شب آؤ باہم روئیے — پر نہ اتنا بھی کہ ڈوبے شہر کم کم روئیے
عشق میں تقریبِ گریہ کو نہیں درکار میرؔ — ایک مدت صبر ہی کا رکھیئے ماتم روئیے

ابر و بہار و باد سبھوں میں ہے اتفاق — ساقی جو تو بھی مل چلے تو واہ واہ ہے

اپنے جی ہی نے نہ چاہا کہ پئیں آبِ حیات — یوں تو ہم میرؔ اسی چشمے پہ بے جان ہوئے

کہتے ہیں ترے کوچے سے میرؔ آنے کہے ہے — جب جانیئے وہ خانہ خراب اپنے گھر آوے

جب نام ترا لیجیئے تب چشم بھر آوے — اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

صناع ہیں سب خوار ازاں جملہ ہوں میں بھی — ہے عیب بڑا اُس میں جسے کچھ ہنر آوے

کیا تھا جا سجا رنگیں لہو تجھ ہجر میں رو کر — گریباں میر کا دیکھا مگر گُلچیں کا داماں ہے

اپنا شعار پوچھو تو مہرباں وفا ہے — پر اُس کے جی میں ہم سے کیا جانیئے کہ کیا ہے

حرم کو جائیے یا دیر میں بسر کریئے — تری تلاش میں اک دل کدھر کدھر کریئے
کٹے ہے دیکھیئے یوں عمر کب تلک اپنی — کہ سُنیئے نام ترا اور چشم تر کریئے

مشہور چمن میں تری گُل پیرہنی ہے — قرباں ترے ہر عضو پہ نازک بدنی ہے

میر صاحب سے خُدا جانے ہوئی کیا تقصیر — جس سے اس ظلم نمایاں کے سزاوار ہوئے

بھلے کو اپنے سب دوڑے ہیں یہ اپنا بُرا چاہا ہے — چلن اس دل کا تم دیکھو تو دُنیا سے نرالا ہے

ہوا مذکور نام اُس کا کہ آنسو بہہ چلے مُنہ پر — ہمارے کام سارے دیدۂ تر ہی ڈبوتا ہے

ہم تو اس کے ظلم سے ہمدم چلے — رہ سکے ہے تُو تو رہ یاں ہم چلے
دیکھیئے بختِ زبوں کیا کیا دکھائے — تم تو خوباں ہم سے ہو برہم چلے

کس دن دامن کھینچ کے اُن نے یار سے اپنا کام لیا
مدت گزری دیکھتے ہم کو میر بھی اک ناکارا ہے

داماںِ دشت سوکھا ابروں کی بے تہی سے — جنگل میں رونے کو اب ہم بھی چلا کریں گے
احوالِ میر کیونکر آخر ہو ایک شب میں — اک عمر ہم یہ قصہ تم سے کہا کریں گے

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے — اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے
آ گئے یہ بے ادائیاں کب تھیں — ان دنوں تم بہت شریر ہوئے

جب کہ پہلو سے یار اٹھتا ہے — درد بے اختیار اٹھتا ہے
اب تلک بھی مزار مجنوں سے — ناتواں اک غبار اٹھتا ہے
ہے بگولا غبار کس کا میر — کہ جو ہو بے قرار اٹھتا ہے

نے اب ہے جگر کاوی نے سینہ خراشی ہے — کچھ جی میں یہ آئے ہے بے کار رہا کیجیے
دل جاؤ تو اب جاؤ ہو خوں تو جگر ہووے — اک جان ہے کس کس کے غم خوار رہا کیجیے
ہے زیست کوئی یہ بھی جو میر کرے ہے تو — ہر آن میں مرنے کو تیار رہا کیجیے

طاقت نہیں ہے جی میں نے اب جگر رہا ہے — پھر دل ستم رسیدہ اک ظلم کر رہا ہے
مارا ہے کس کو ظالم اس بے سلیقگی سے — دامن تمام تیرا لوہو میں بھر رہا ہے
چل ہم نشیں کہ دیکھیں آوارہ میر کو ٹک — خانہ خراب وہ بھی آج اپنے گھر رہا ہے

کیا خراب تغافل نے اس کے ورنہ میر — ہر ایک بات پہ دشنام و سنگ تھا آگے

کیسے ہیں وے کہ جیتے ہیں صد سال ہم تو میر — اس چار دن کی زیست میں بے زار ہو گئے

کب تک گلیوں میں سودائی سے پھرتے رہیے — دل کو اس زلف مسلسل سے لگا بیٹھیں گے

کیا خرابی ہے مے کدے کی سہل — محتسب اک جہان جاتا ہے
اس سخن ناشنو سے کیا کہیے — غیر کی بات مان جاتا ہے
گو وہ ہرجائی آئے اپنی اور — سو طرف ہی گمان جاتا ہے
میر کو عمر طبعی کو پہنچا — عشق میں جوں جوان جاتا ہے

جب رو لے بیٹھتا ہوں تب کیا کسر رہے ہے — رو مل دو دو دن تک جوں ابر تر رہے ہے
آگہ تو رہیئے اُسکی طرز ورہ وروش سے — آنے میں اُس کے لیکن کس کو خبر رہے ہے
میر اب بہار آئی صحرا میں چل جنوں کر — کوئی بھی فصلِ گُل میں نادان گھر رہے ہے

سودا ہو تپ ہو میر کو تو کریئے کچھ علاج — اس تیرے دیکھنے کے دوانے کو عشق ہے

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ — اُن سے بھی تو پوچھتے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

کرے کیا کہ دل بھی تو مجبور ہے — زمیں سخت ہے آسماں دُور ہے
تمنائے دل کے لئے جان دی — سلیقہ ہمارا تو مشہور ہے
نہ ہو کس طرح فکر انجام کار — بھروسہ ہے جس پر سو مغرور ہے
کہیں جو تسلی ہوا ہو یہ دل — وہی بے قراری بدستور ہے
بہت سعی کریئے تو مر رہیئے میر — بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

اب میر جی تو اچھے زندیق ہی بن بیٹھے — پیشانی پہ دے قشقہ زُنار پہن بیٹھے
بس ہو تو اِدھر اُدھر یوں پھرنے دیں تجھ کو — ناچار ترے ہم یہ دیکھیں ہیں چلن بیٹھے

گماں کب تھا یہ پروانے پہ اتنا شمع روئیگی — کہ مجلس میں سے جس کے اشک کے بھر بھر لگن نکلے
حرم میں میر جتنا بُت پرستی پر ہے تُو مائل — خُدا ہی ہو تو اِتنا بُت کدے میں برہمن نکلے

کام میں قتل کے مرے تن دے — اب تلک مجھ میں جان ہے پیارے
میر عمداً بھی کوئی مرتا ہے — جان ہے تو جہان ہے پیارے

ٹک تمہارے ہونٹ کے ہلنے سے یاں ہوتا ہے کام — اِتنی اُتنی بات جو ہووے تو مانا کیجئے

مہ وشاں پوچھیں نہ ٹک ہجراں میں گر مر جائیے　　　اب کہو اس شہرِ ناپرساں میں کیدھر جائیے
شوق تھا جو یار کے کوچے ہمیں لایا تھا میر　　　پاؤں میں طاقت کہاں اتنی کہ اب گھر جائیے

ہم نے جانا تھا سخن ہوں گے زباں پر کتنے　　　پر قلم ہاتھ جو آئی لکھے دفتر کتنے
آہ نکلی ہے یہ کس کی ہوسِ سیرِ بہار　　　آتے ہیں باغ میں آوارہ ہوئے پر کتنے

اے شبِ ہجر راست کہہ تجھ کو　　　بات کچھ صبح کی بھی آتی ہے

جم گیا خوں کفِ قاتل پہ ترا میر زبس　　　اُن نے رو رو دیا کل ہاتھ کو دھوتے دھوتے

بارے نسیمِ ضعف سے کل ہم اسیر بھی　　　سناّ ہٹے ہیں جی کے گلستاں تلک گئے
کچھ آبلے دیئے تھے رہ آوردِ عشق نے　　　سو رفتہ رفتہ خارِ مغیلاں تلک گئے

جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے　　　اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے
گھبرا نہ میر عشق میں اس سہل زیست پر　　　جب بس چلا نہ کچھ تو مرے یار مر گئے

اسیری نے چمن سے میرے دل گرمی کو دھو ڈالا　　　وگرنہ برق جا کر آشیاں میرا جلا آوے

اُداسیاں تھیں مری خانقہ میں قابلِ سیر　　　صنم کدے میں تو ٹک آ کے دل لگا بھی ہے
یہ کہیے کیونکہ کہ خوباں سے کچھ نہیں مطلب　　　لگے جو پھرتے ہیں ہم کچھ تو مدعا بھی ہے
ترا ہے وہم کہ میں اپنے پیرہن میں ہوں　　　نگاہ غور سے کر مجھ میں کچھ رہا بھی ہے
گزار شہرِ وفا میں سمجھ کے کر مجنوں　　　کہ اس دیار میں میرِ شکستہ پا بھی ہے

نکلا نہ مناجاتیوں سے کام کچھ اپنا　　　اب کوئی خراباتی جواں پیر کریں گے
بازیچہ نہیں میر کے احوال کا لکھنا　　　اس قصہ کو ہم کرتے ہی تحریر کریں گے

عاشق کہیں جو ہو گے تو جانو گے قدر میر		اب تو کسی کے چاہنے کا تم کو چاؤ ہے

مری خلق محو کلام سب مجھے چھوڑتے ہیں خموش کب
مرا حرف رشکِ کتاب ہے مری بات لکھنے کا باب ہے
کبھو لطف سے نہ سخن کیا کبھو بات کہہ نہ لگا لیا
یہی لحظہ لحظہ خطاب ہے وہی لمحہ لمحہ عتاب ہے
مرا شور سن کے جو لوگوں نے کیا پوچھا تو کہے ہے کیا
جسے میر کہتے ہیں صاحبو یہ وہی تو خانہ خراب ہے

میر کی بات پہ ہر وقت یہ جھنجھلایا نہ کر		سڑی ہے خبطی ہے وہ شیفتہ ہے مجنوں ہے

پیرِ مغاں سعادت تیری جو ایسا آوے		یہ میرے کشوں میں اک طرز کا جواں ہے

آوارہ میر شاید واں خاک ہو گیا ہے		اک گرد اٹھ چلے ہے گاہ اُسکی رہ گزر سے

وعدہ وعید پیارے کچھ تو قرار ہووے		دل کی معاملت ہے کیا کوئی خوار ہووے

ہوئی ہیں فکریں پریشان میر یاروں کی		حواس خمسہ کرے جمع سو نظامی ہے

درپئے خونِ میر ہی نہ رہو		ہو بھی جاتا ہے جُرم آدم سے

تُربتِ میر پہ ہیں اہلِ سخن		ہر طرف حرف ہے حکایت ہے
تو بھی تقریب فاتحہ سے چل		بخُدا واجب الزیارت ہے

دہی کو نہ کچھ پوچھو اک بھرت کا ہے گڑوا		ترکیب سے کیا کہیے سانچے میں کہ ڈھالی ہے

کیا غم میں ویسے خاک فتادہ سے ہو سکے		دامن پکڑ کے یار کا جو ٹک نہ رو سکے

ناصح نہ رودیں کیونکہ محبت کے جی کو ہم		اے خانماں خراب ہمارے تو گھر گئے
یہ راہ و رسم دل شدگاں گفتنی نہیں		جانے دے میر صاحب و قبلہ جدھر گئے
روزِ وداع اُسکی گلی تک تھے ہم بھی ساتھ		جب دردمند ہم کو وے معلوم کر گئے
کر یک نگاہ یاس کی ٹپ دے سے رو دیا		پھر ہم اِدھر کو آئے میاں وے اُدھر گئے

پوچھا تھا راہ جاتے کہیں اُن نے میر کو		آتا ہے اُسکی بات کا اب تک عجب مجھے

رف ہونا مراشکل ہے میر اس شعر کے فن سے		یوہیں سودا کبھی ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

کب تلک جی رُکے خفا ہووے		آہ کریئے کہ ٹک ہوا ہووے
جی ٹھہر جائے یا ہوا ہووے		دیکھیئے ہوتے ہوتے کیا ہووے
کاہشِ دل کی کیجئے تدبیر		جان میں کچھ بھی جو رہا ہووے
چپ کا باعث ہے بے تمنائی		کہیئے کچھ بھی تو مدعا ہووے
بے کلی مارے ڈالتی ہے نسیم		دیکھیئے اب کے سال کیا ہووے
نہ سُنا رات ہم نے اک نالہ		غالباً میر مر رہا ہووے

کچھ تو کہہ وصل کی پھر رات چلی جاتی ہے		دن گزر جائیں ہیں پر بات چلی جاتی ہے
رہ گئے گاہ تبسم پہ گہے بات ہی پر		بارے اے ہم نشیں اوقات چلی جاتی ہے
یاں تو آتی نہیں شطرنجِ زمانہ کی چال		اور وہاں بازی ہوئی مات چلی جاتی ہے
روز آنے پہ نہیں نسبتِ عشقی موقوف		عمر بھر ایک ملاقات چلی جاتی ہے
خرقہ مندیل و ردا مست لئے جاتے ہیں		شیخ کی ساری کرامات چلی جاتی ہے
ایک ہم ہی سے تفاوت ہے سلوکوں میں میر		یوں تو اوروں کی مدارات چلی جاتی ہے

پہنچا تو ہوگا سمعِ مبارک میں حالِ میر — اس پر بھی جی میں آوے تو دل کو لگائیے ۱۵۱

نہیں دسواس جی گنوانے کے — ہائے رے ذوق دل لگانے کے
میرے تغییرِ حال پر مت جا — اتفاقات ہیں زمانے کے
دمِ آخر ہی کیا نہ آنا تھا — اور بھی وقت تھے بہانے کے
اس کدورت کو ہم سمجھتے ہیں — ڈھب ہیں یہ خاک میں ملانے کے
مرنے پر بیٹھے ہیں سُنو صاحب — بندے ہیں اپنے جی جلانے کے

کم فرصتیِ گل جو کہیں کوئی نہ مانے — ایسے گئے ایامِ بہاراں کہ نہ جانے
ہمراہ جوانی گئے ہنگامے اُٹھانے — اب ہم بھی نہیں دیتے رہنے دیے ہیں زمانے
ان ہی چمنوں میں کہ جنھوں میں نہ پایا چھاؤں — کن کن روشوں میں ہمکو پھرایا ہے ہوا نے

بے خوابی تری آنکھوں پہ دیکھوں ہوں مگر رات — افسانہ مرے حال کا مذکور ہوا ہے

کس کے کہنے کو ہے تاثیر کہ اک میر ہی سے — رمز و ایما و اشارات و کنایت کیجے

ہر گھڑی رنجش ایسی باتوں میں — کوئی اخلاص و پیار رہتا ہے
تجھ بن آئے ہیں تنگ جینے سے — مرنے کا انتظار رہتا ہے
کیوں نہ ہووے عزیز دلہا میر — کس کے کوچے میں خوار رہتا ہے

صبر بھی کر رہئے بلا پر میر صاحب جی کبھو — جب نہ تب رونا ہی کڑھنا یہ بھی کوئی ڈھنگ ہے

جس سے اسے لگاؤں رُوکھا ہی ہو ملے ہے — سینے میں جل کر از بس دل خاک ہو گیا ہے
زیرِ فلک بھلا تو رووے ہے آپ کو میر — کس کس طرح کا عالم یاں خاک ہو گیا ہے

آج تیری گلی سے ظالم میر — لوہو میں شور بور آیا ہے

فقیرانہ آئے صدا کر چلے — میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم — سو اس عہد کو اب وفا کر چلے
وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لئے — ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے
کوئی ناامیدانہ کرتے نگاہ — سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے
بہت آرزو تھی گلی کی تری — سو یاں سے لہو میں نہا کر چلے
دکھائی دیئے یوں کہ بے خود کیا — ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے
پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے — نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے
نہ دیکھا غم دوستاں شکر ہے — ہمیں داغ اپنا دکھا کر چلے
گئی عمر در بند فکر غزل — سو اس فن کو ایسا بڑا کر چلے
کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میر — جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

بس بے وقاری ہو چکی گلیوں میں خواری ہو چکی — اب پاس کر ٹک میر کا دو چار دن مہمان ہے

پوچھ مت آہ عاشقوں کی معاش — روز ان کا بھی شام ہوتا ہے

اب چھیڑ یہ رکھی ہے کہ عاشق ہے تو کہیں — القصہ خوش گزرتی ہے اُس بدگمان سے
داغوں سے ہے چمن جگر میر دہر میں — اُن نے بھی گل چنے بہت اُس گلستان میں

چاک پر چاک ہوا جوں جوں سلایا ہم نے — اس گریباں ہی سے اب ہاتھ اٹھایا ہم نے
جی میں تھا عرش پہ جا باندھیئے تکیہ لیکن — بسترا خاک ہی میں اب تو بچھایا ہم نے
یاں فقط ریختہ ہی کہنے نہ آئے تھے ہم — چار دن یہ بھی تماشا سا دکھایا ہم نے

کافر ہوئے بتوں کی محبت میں میر جی — مسجد میں آج آئے تھے قشقہ دیئے ہوئے

کرو توکل کہ عاشقی میں نہ یوں کروگے تو کیا کروگے
الم جو یہ ہے تو دردمندو کہاں تلک تم دوا کروگے

جگر میں طاقت کہاں ہے اتنی کہ دردِ ہجراں سے مرتے رہیئے
ہزاروں وعدے وصال کے تھے کوئی بھی جیتے وفا کروگے

اخیرِ اُلفت یہی نہیں ہے کہ جل کے آخر ہوئے پتنگے
ہوا جو یاں کی یہ ہے تو یارو غبار ہوکر اُڑا کروگے

عدم میں ہم کو یہ غم رہیگا کہ اوروں پر اب ستم رہیگا
تمہیں تو لت ہے ستانے ہی کی کسو پر آخر جفا کروگے

اگرچہ اب تو خفا ہو لیکن موئے گئے پر کبھو ہمارے
جو یاد ہم کو کروگے پیارے تو ہاتھ اپنے ملا کروگے

غمِ محبت سے میر صاحب بہ تنگ ہوں میں فقیر ہو تم
جو وقت ہوگا کبھو مساعد تو میرے حق میں دعا کروگے

اس شہرِ دل کو تو بھی جو دیکھے تو اب کہے
کیا جانیے کہ بستی یہ کب کی خراب ہے

کیا کیا بیٹھے بگڑ بگڑ تم پر ہم تم سے بنائے گئے
چپکے باتیں اُٹھائے گئے سر گاڑے وہیں آئے گئے

کب کب تم نے سچ نہیں مانیں جھوٹی باتیں غیروں کی
تم ہم کو یوں ہیں جلانے گئے وے تم کو وہیں لگائے گئے

صبح وہ آفت اُٹھ بیٹھا تھا تم نے نہ دیکھا صد افسوس
کیا کیا فتنے سر جوڑے پلکوں کے سائے سائے گئے

مرنے سے کیا میر جی صاحب ہم کو ہوش تھے کیا کریئے
جی سے ہاتھ اُٹھائے گئے پر اُس سے دل نہ اُٹھائے گئے

ادھر سے ابر اُٹھ کر جو گیا ہے
ہماری خاک پر بھی رو گیا ہے

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے

کبھو آ وُ زلف کے کوچے ہیں درپیش
مزاج اپنا اُدھر اب تو گیا ہے

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

عمر بھر ہم رہے شرابی سے
دلِ پُرخوں کی اک گلابی سے

جی ڈہا جائے ہے سحر سے آہ
رات گزرے گی کس خرابی سے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اُس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

کام تھے عشق میں بہت پر میر
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

ہوگا ستم و جور سے تیرے ہی کنایہ
دو شخص جہاں شکوۂ ایام کریں گے

گر دل ہے یہی مضطرب احوال تو اے میر ہم زیر زمیں بھی بہت آرام کریں گے

دیوان دوم

صبح ہے کوئی آہ کر لیجے آسماں کو سیاہ کر لیجے
چشمِ گل باغ میں مندی جا کر جو بنے اک نگاہ کر لیجے

نو گرفتہ ہوں اس باغ کا رحم اے صیاد موسمِ گل ہے جب تک مجھے مہلت دیجے
اپنے ہی دل کا گنہ ہے جو جلاتا ہے مجھے کس کو اے مرثیے میاں اور کسے تہمت دیجے
مر گیا میر نہ آیا ترے جی میں اے شوخ اپنے محنت زدہ کو بھی کبھی راحت دیجے

اک شور ہو رہا ہے خوں ریزی میں ہمارے حیرت ہے ہم تو چپ ہیں کچھ تم بھی بولو پیارے
بیٹھیں ہیں رونے کو تو دریا ہی رو اٹھیں ہیں جوش و خروش یہ تھے تب ہم لگے کنارے
ہم نے تو عاشقی میں کھویا ہے جان کو بھی صدقے ہیں میر جی کے دیے ڈھونڈتے ہیں وارے

میر ایک دم نہ اس بن تو تو جیا پیارے کیا کہہ کے تجھ کو روویں یہ کیا کیا پیارے

سیر کی ہم نے ہر کہیں پیارے پھر جو دیکھا تو کچھ نہیں پیارے
خشک سال وفا میں اک مدت پلکیں لوہو میں تر رہیں پیارے
یک نظر دیکھنے کی حسرت میں آنکھیں تو پانی ہو بہیں پیارے
تجھ گلی میں رہے ہے میر مگر دیکھیں ہیں جب نہ تب نہیں پیارے

مت سہل سمجھو ایسے ہیں ہم کیا دھرے دھرے ظاہر تو پاس بیٹھے ہیں پر ہیں بہت پرے
خالی کروں ہوں راتوں کو رو رو کے دل کے تئیں انصاف کر کہ یوں کوئی دن کب تلک بھرے
جل تھل فقط نہیں مرے رونے سے بھر گئے جنگل پڑے تھے سوکھے سو وہ بھی ہوئے ہرے

جی کو بچا رکھیں گے تو جائیں گے عشق میں
ہر چند میر صاحب قبلہ ہیں منگرے

بُو کئے کھلائے جاتے ہو نزاکت ہائے رے
ہاتھ لگتے میلے ہوتے ہو لطافت ہائے رے

نظر مت بے پری پر کر کہ آں سوئے جہاں پھر ہوں
ہوئے پرواز کے قابل یہ ٹوٹے پَر جہاں میرے

مبادا کارواں جاتا رہے تو صبح سوتا ہے
بہت ڈرتا ہوں میں اے میر تیری دیر خوابی سے

کعبے میں جاں بلب تھے ہم دوریٔ بتاں سے
آئے ہیں پھر کے یارو اب کی خدا کے ہاں سے
تصویر کے سے طائر خاموش رہتے ہیں ہم
جی کچھ اُچٹ گیا ہے اب نالہ و فغاں سے
خاموشی ہی میں ہم نے دیکھی ہے مصلحت اب
ہر اک سے حال دل کا مدّت کہا زباں سے
اِتنی بھی بدمزاجی ہر لحظہ میر تم کو
اُلجھاؤ ہے زمیں سے جھگڑا ہے آسماں سے

ہمسائے مجھے رات کو رو دیا ہی کرے ہیں
سوتے نہیں بیچارے مری نالہ کشی سے
تم نے تو اِدھر دیکھنے کی کھائی ہے سوگند
اب ہم بھی لڑا بیٹھتے ہیں آنکھ کسی سے
بے رحم وہ تجھ پاس لگا بیٹھنے جب دیر
ہم میر سے دل اپنا اُٹھائے بیٹھے تبھی سے

وہ کہاں دھوم جو دیکھی گئی چشمِ تر سے
ابر کیا کیا اُٹھے ہنگامے سے کیا کیا برسے
ساتھ سونا جو گیا اُس کا بہت دل تڑپا
برسوں پھر میر یہ پہلو نہ لگے بستر سے

لگے ہی ایک دو رہتے ہیں مہلت بات کی کیسی
ہوا ہے دشمنوں کو کچھ قیامت اتحاد اُس سے
اِدھر تو یہ کرے ہے میر اُدھر لگتا ہے شے پینے
کہاں تک اب تو اپنا اُٹھ گیا ہے اعتماد اُس سے

بھر آنکھیں کسو کی پونچھتے جو آستیں رکھتے
ہوئی شرمندگی کیا کیا ہمیں اِس دستِ خالی سے
گئے ہم آپ سے دہن کا جو ہے گہے فکر اس کمر کی ہر
کہے سو کیا کوئی ہیں میر صاحب کچھ خیالی سے

افراطِ اشتیاق میں سمجھے نہ اپنا حال　　　دیکھے ہیں سوچ کرکے تو اب ہم بھی ہو چکے
کہتا ہے میر سانجھ ہی سے آج دردِ دل　　　ایسی کہانی گرچہ بندھی ہے تو سو چکے

سر کو اُس آستاں پہ رکھے رہیں تو بہتر　　　اُٹھیے جو اُس کے در سے تو ہو جیے کدھر کے
خمیازہ کش یہ جب ہے اے میر شوق سے تو　　　سینے کے زخم کئے کہ کیونکر رہیں گے ٹانکے

رہنے کی اپنے جا تو نے دیر ہے نہ کعبہ　　　اُٹھیے جو اُس کے در سے تو ہو جیے کدھر کے
خاک ایسی عاشقی میں ٹھکرائے بھی گئے کل　　　پاؤں لگے سے اُس کے پر میر جی نہ سر کے

کتنے روز دل سے زہر نے کے ہیں کھانے کے　　　دل جو یہ ہے تو ہم آرام نہیں پانے کے

اس باغِ بے ثبات میں کیا دل صبا لگے　　　کیا کیا نہال دیکھتے یاں پاؤں آ لگے
سب چاہتے ہیں دیر رہے میرِ دل زدہ　　　یارب کسو تو دوست کی اُس کو دعا لگے

غیر کو دیکھے ہے گرمی سے نہ کچھ لاگ لگے　　　اس نے دیکھا رہے ہے کہ مجھے آگ لگے
ہم نشیں کہہ مت بتوں کی میر کو تسبیح ہے　　　کام کیا اس ذکر سے اُن کو خدا کا نام لے

لائے تھے جا کر ابھی تو اُس گلی میں سے پکار　　　چپکے چپکے میر جی تم اُٹھ کے پھر کیدھر چلے

یا پہلے وے نگاہیں جن سے کہ چاہ نکلے　　　یا اب کی وے ادائیں جو دل سے آہ نکلے
غیروں سے تو کہے ہے اچھی بری سب اپنی　　　اے یار کب کسے تیرے بہ خیر خواہ نکلے

جلنے کو جلتے ہیں سب کے اندرونے لیک میر　　　جب کسو کی اس طرح سے ہاں چھاتی جلے

دل ادھر کے ہے جاتے کچھ بت خانے سے کعبے کو　　　اس راہ میں پیش آوے کیا ہم کو خدا جانے

یوں شہر میں بہتیرے آزار دہندے ہیں
تب جانیے جب کوئی اس ڈھب سے ستا جاتے

نہ بھائیں تجھے میری باتیں وگرنہ
رکھی دھوم شہروں میں اس گفتگو نے
کڑھایا کسو کو کھپایا کسو کو
بُرائی ہی کی سب سے اُس خوبرو نے
تری چال ٹیڑھی تری بات روکھی
تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے

جی میں بگڑ رہا ہے تب میر چپ ہے بیٹھا
چھیڑا ابھی تو کیا کیا باتیں بنا کے لاوے

شورش کدۂ عالم اپنے ہی کی جاگہ تھی
دل کیا کرے جو ایسے ہنگامے میں پھنس جاوے
چولی جہاں سے مسکی پھر آنکھیں وہیں جھپکیں
جب پیرہن گل بھی اس خوبی سے چُس جاوے
ہے میر عجب کوئی درویش برشتہ دل
بات اُسکی سُنو تم تو چھاتی بھی جھلس جاوے

کوئی بھی میر سے دل ریش سے یوں دور پھرتا ہے
ٹک اس درویش سے مل چل کہ تجھکو کچھ دعا دیوے

رنگ گل و بوئے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں
کیا قافلہ جاتا ہے جو تو بھی چلا چاہے
ہم میر ترا مرنا کیا چاہتے تھے لیکن
رہتا ہے ہوئے بن کب جو کچھ کہ ہوا چاہے

دوری میں اُسکی گور کنارے ہم آ رہے
جی رات دن جنھوں کے کھپیں ان میں کیا رہے
اب جس کے حسن خلق پہ بھولے پھریں ہیں لوگ
اس بے وفا سے ہم بھی بہت آشنا رہے
آتے کبھو جو واں سے تو یاں رہتے تھے اداس
آخر کو میر اُس کی گلی ہی میں جا رہے

ہم نے بھی نذر کی ہے پھر بیٹھے چمن کے گرد
آنے تئیں بہار کے گر بال و پر رہے

دیکھیں تو مصر حسن میں کیا خواریاں کھنچیں
اب تک تو ہم عزیز رہے ہیں جہاں رہے
اُس قافلے سے گرد ہماری نہ ٹک اُٹھی
حیرت ہے میر اپنے تئیں ہم کہاں رہے

ایک سمے تم ہم فقرا سے اکثر صحبت رکھتے تھے
اور نہ تھی توفیق تمہیں تو بوسے کی ہمت رکھتے تھے

اب تو ہم ہو چکتے ہیں ٹک تیرے ابرو خم ہوتے
کیا کیا رنج اُٹھاتے تھے جب جی میں طاقت رکھتے تھے

جاہ کے سارے دیوانے پر آپ سے اکثر بیگانے
عاشق اُس کے سیر کئے ہم سب سے جُدی مت رکھتے تھے

کوہکن و مجنوں و وامق کس کس کے لیں نام غرض
جی ہی سے جاتے آگے سُنے وے لوگ جو اُلفت رکھتے تھے

چتون کے کچھ ڈھب تھے ایسے چٹاکے تھے کب یہ ڈول
ہائے وے دن جن روزوں تم کچھ بھی مروت رکھتے تھے

کل کہتے ہیں اس بستی میں میر جی مشتاقانہ موئے
تجھ سے کیا ہی جان کے دشمن وے بھی محبت رکھتے تھے

مجنوں و کوہکن کو آزار ایسے ہی تھے
یہ جان سے گئے سب بیمار ایسے ہی تھے

دیوار سے پٹک سر میں جو موا تو بولا
کچھ اس ستم زدہ کے آثار ایسے ہی تھے

اک حرف کا بھی اُن کو فرصت نے کر دکھانا
کیا کہیئے میر جی کے بستار ایسے ہی تھے

وادیٔ قیس سے کچھ آئے نہ میر صاحب
مرشد کے ڈھیر پردے شاید کہ جا کے بیٹھے

کیا رنگ ہیں شوخی سے اُٹھے تن نازک کے
پیراہن اگر پہنے تو اُس پہ بھی تہ بیٹھے

مرنے موئے پہ چاہت ظاہر نہ کی اگلوں نے
بے حوصلے تھے ہم جو اس راز کو کہہ بیٹھے

گل گئے بوٹے گئے گلشن ہوئے برہم گئے
کیسے کیسے ہائے اپنے دیکھتے موسم گئے

گر ہوا اس باغ کی ہے یہ تو اے بُلبل نہ بھول
کوئی دن میں دیکھیو واں سے گئے یاں ہم گئے

کیا معاش اس غم کدے میں ہم نے اس دن کی ہم
اُٹھ کے جس کے ہاں گئے دل کا لئے ماتم گئے

ہم نہ کہتے تھے رہیگا ہم میں کیا یاں سے گئے
سو ہی بات آئی اُٹھے اُس پاس سے جاں سے گئے

خانہ سازِ دیں جو ہے واعظ سو ہے خانہ خراب
اینٹ کی خاطر جسے مسجد کو ڈھایا چاہیئے

کیاریوں ہی میں پڑے رہنے گا سائے کی روش
اسپنہ ہوتے اب کی موسم گل کا آیا چاہیئے

یہ ستم تازہ کہ اپنی ناکسی پر کر نظر
جن سے بگڑا چاہیئے اُن سے بنایا چاہیئے

جی نہیں رہتا ہے ٹک ناچار ہم کو اس کی اور — گرتے پڑتے ضعف میں بھی روز جایا چاہیئے
وہ بھی تو ٹک دست و تیغ اپنے کی جانے قدر میر — زخم سارے ایک دن اُس کو دکھایا چاہیئے

انکھڑیوں کو اس کی خاطر خواہ کیونکر دیکھیئے — سو طرف جب دیکھ لیجے تب ٹک ایدھر دیکھیئے

گرداب وار یار ترے صدقے جایئے — دریا کا پھیر پایئے تیرا نہ پایئے
تاثیر ہے دُعا کو فقیروں کی میر جی — ٹک آپ بھی ہمارے لئے ہاتھ اُٹھایئے

ان دنوں رنگ اور کچھ ہے اس دلِ پُرخون کا — حق میں میرے آپ ہی کچھ سوچ کر فرمایئے
دل کے ویراں کرنے میں بے داد کی ہے تُو نے ہائے — خوش عمارت ایسے گھر کو اس طرح سے ڈھایئے

کچھ نہیں تو شعر ہی کی فکر کر — آئے ہیں جو یاں تو کچھ کر جایئے
خانماں آباد جو ہے سو خراب — کس کے اُٹھ کر شہر میں گھر جایئے
بیمِ مُردن اس قدر یہ کیا ہے میر — عشق کریئے اور پھر ڈر جایئے

کیا جانو میر صاحب و قبلہ کے ڈھب کے تم — خوبی مسلّم ان کی ولے بدبلا ہیں یے

کھُل گئی بات تھی سو اک یہ — تُو وہی مُنہ چھُپائے جاتا ہے
وہ تو بگڑے ہے میر سے ہر دم — اپنی سی یہ بنائے جاتا ہے

خرابی دل کی کیا انبوہِ درد و غم سے پُوچھو ہو — وہی حالت ہے جیسے شہر لشکر لوٹ جاتا ہے
نہیں کچھ عقل میں آتا کہ دیوانہ سا میر ادھر — کبھو آتا جو ہے کیدھر کو مارے رد ٹ جاتا ہے

جب نسیمِ سحر اُدھر جا ہے — ایک سناٹا گزر جا ہے
کیا اُس آئینہ رُو سے کہیئے ہائے — وہ زباں کر کے پھر مُکر جا ہے

جب سے سمجھا کہ ہم چلاؤ ہیں — حال پرسی ٹک آ کے کر جا ہے
جی نہیں میر میں نہ بولو تند — بات کہتے ابھی وہ مر جا ہے

زورِ طبیعت اُن کا سُنیں اشتیاق تھا — آیا نظر جو میر تو کچھ ناتواں سا ہے

ہزار بار گھڑی بھر میں میر مرتے ہیں — اُنہوں نے زندگی کا ڈھب نیا نکالا ہے

چھاتی جلا کرے ہے سوزِ دروں بلا ہے — اک آگ سی رہے ہے کیا جانیے کہ کیا ہے
پھرتے ہو میر صاحب سب سے جُدے جُدے تم — شاید کہیں تمہارا دل ان دنوں لگا ہے

ہمارا تو ہے اصل مدّعا تو — خُدا جانے ترا کیا مدّعا ہے
نہیں ملتا سخن اپنا کسو سے — ہماری گفتگو کا ڈھب جُدا ہے
سر اُدھر گُل اِدھر سرو اُدھر — اُسی کی باغ میں اب تو ہوا ہے
جگر افسوس کی ہو بعد چندے — ابھی تو دل ہمارا بھی بجا ہے

دست و پا گم کئے ہیں تُو نے میر — تیری بے طاقتی سے پیدا ہے

پلکوں سے رفو اُن نے کیا چاکِ دلِ میر — کس زخم کو کس نازکی کے ساتھ سیا ہے

کس غم میں مجھ کو یارب یہ مُبتلا کیا ہے — دل ساری رات جیسے کوئی ملا کیا ہے
ہے مُنہ پہ میر کے کیا گردِ ملال تازہ — یہ خاک میں ہمیشہ یوں ہی رُلا کیا ہے

گہ آپ میں نہیں ہو گہ منتظر کہیں ہو — کچھ میر جی تمہارا ان روزوں حال کیا ہے

ہر طرف بحث تجھ سے ہے اے عشق — شُکر تیرا تری شکایت ہے

دہر کا ہو گلہ کہ شکوۂ چرخ　　اُس ستم گر ہی سے کنایت ہے
عاشق اب بڑھ گئے ہیں چھانٹو　　اس میں سرکار کی کفایت ہے

کس سے جدا ہوئے ہیں کہ ایسے ہیں دردمند　　منہ میر جی کا آج نہایت ہی زرد ہے
جانے ہیں قتل کرتے ترا اختیار ہے　　پر جائیں جو کہیں ہیں سو رہ پُر غبار ہے
کب تک ستم کبھو تو دلاسا کیا کیجے　　آخر مزاج میر ایسا ہی قصہ دار ہے

جنوں کا ہمیشہ مرے مذکور ہے　　جوانی دِوانی ہے مشہور ہے
نہ اب ناتوانی وہ ناز و روش　　نہیں وہ کہ جینا ہی منظور ہے
گیا شاید اس شمع رو کا خیال　　کہ اب میر کے منہ پہ کچھ نور ہے

بنا نہیں اگر وہ سپہر ستم کہہ سکے کہ　　پھر میر جمعہ کی شب دو دوپہر کہاں ہے

کیا سہل گذرتی ہے جنوں سے　　تحفہ ہم لوگوں کا چلن ہے
اُٹھتے اُٹھتے بدن کا کچھ نہ پوچھو　　کیا جانیے جان ہے کہ تن ہے
گر دیر ہے میں کہیں حرم ہیں　　اپنا تو یہی دوانہ پن ہے
کر میر کے حال پر ترحم　　وہ شہر غریب بے وطن ہے

ہم مست بھی ہو دیکھا آخر مزا نہیں ہے　　ہشیاری کے برابر کوئی نشا نہیں ہے
زیر فلک رکا ہے اب جی بہت ہمارا　　اس بے فضا قفس میں مطلق ہوا نہیں ہے
میں رو دیا تم ہنسو ہو کیا جانو میر صاحب　　دل آپ کا کسو سے شاید لگا نہیں ہے

کیا تن نازک ہے جاں کو بھی حسد جس تن پہ ہے　　کیا بدن کا رنگ ہے تہ جس کی پیراہن پہ ہے

گلی میں اپنی قدغن کر رکھو آنے نہ پاؤں میں　　کہیں کیا اور بھی دل کے لگانے کی منادی ہے

کچھ منظور کیا ہے زلف و خال و خط خوباں سے — خدا نے دیکھنے کی لت سی آنکھوں کو لگادی ہے
ہوتا ہے دل کی محویت سے یکساں یاں غم و فرحت — نہ ماتم مرنے کا ہے میر نے جینے کی شادی ہے

کیا حال بیاں کیجئے عجب طرح پڑی ہے — وہ طبع تو نازک ہے کہانی یہ بڑی ہے

واشد ہوئی نہ بلبل اپنی بہار میں بھی — کیا جانیے کہ جی میں یہ کیسی گل جھڑی ہے
کیا میر ہم نہ بکا دیں ہر کم بغل کے آگے — نام خدا انہوں کی عزت بہت بڑی ہے

یہ کیا کہ منہ نوچے سینہ چاک کرے — کر عرض جو کچھ تجھ میں اے میر ہنر بھی ہے

لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر — شوق نے بات کیا بڑھائی ہے
دیدنی ہے شکستگی دل کی — کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے
بے ستوں کیا ہے کوہ کن کیسا — عشق کی زور آزمائی ہے
جس مرض میں کہ جان جاتی ہے — دلبروں ہی کی وہ جدائی ہے
مرگ مجنوں سے عقل گم ہے میر — کیا دوانے نے موت پائی ہے

اس شوخ سے ہمیں بھی اب یاری ہو گئی ہے
شرم انکھڑیوں میں جس کی عیاری ہو گئی ہے
ہم کو تو دردِ دل ہے تم زرد کیوں ہو ایسے
کیا میر جی تمہیں کچھ بیماری ہو گئی ہے

چھپائی ہوں آنکھیں ہی ان نے تو کہیے — وہ ہر بات کا ہم سے پردا کرے ہے
ہلاک آپ کو میر مت کر دوانے — کوئی ذی شعور آہ ایسا کرے ہے

دانستہ اپنے جی پہ کیوں تو جفا کرے ہے — اتنا بھی میرے پیارے کوئی کڑھا کرے ہے

ہم طورِ عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن — سینے میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے
کیا چال یہ نکالی ہو کر جوان تم نے — اب جب چلو ہو دل کو ٹھوکر لگا کرے ہے
دشمن ہو یار جیسا درپے ہے خوں کے میرے — ہے دوستی جہاں واں یوں ہی ہوا کرے ہے
کیا جانے کیا تمنا رکھتے ہیں یار سے ہم — اندوہ ایک جی کو اکثر رہا کرے ہے
گل ہی کو اور ہم بھی آنکھیں لگا رکھیں گے — اک آدھ دن جو موسم اب کی وفا کرے ہے
گہ سرگزشت اُن نے فرہاد کی نکالی — مجنوں کا گاہ قصہ بیٹھا کہا کرے ہے
اک آفتِ زماں ہے یہ میر عشق پیشہ — پردے میں سارے مطلب اپنے ادا کرے ہے

ناز و خشم و بے دماغی اس طرف سب ہیں نئے — کچھ کسو بھی طور کی رنجش بھلا ادھر سے ہے
یاد بیٹھے ہوتیں پڑا پاتے ہیں جب تب تجھ کو میر — کیا جفا اے خانماں برباد کچھ تو گھر سے ہے

ہم ہیں فتنہ ساز شیخ صاحب — شہر پُر شور اس غلام سے ہے
بوسہ دے کر میں گیا کل ہی — کچھ کہو کام اپنے کام سے ہے
شعر میرے ہیں سب خواص پسند — پر مجھے گفتگو عوام سے ہے
سر جھکاؤں تو اور بگڑتے ہو — کیا تمہیں چڑھ مرے سلام سے ہے
سہل ہے میر کا سمجھنا کیا — ہر سخن اُس کا اک مقام سے ہے

میں جو ہر سو نگراں ہوں دیکھنے ہو کر مضطر — آنسو ہر میری نگہ ساتھ لگا نکلے ہے
بتکدہ ہے سامنے اس کے لیے سجدہ ہی دلے — جی سمجھتا ہے جو اس بت کا ادا نکلے ہے
اجڑے ہوا نہیں عشق میں مارے جانا — رہ رہ کے تو سر کوئی کچھ پیاں ہی باتیں نکلے ہے
کیا فریب ہے رفتار یہ سینے کی جدا — اور کنتا رہے کچھ پیار جدا نکلے ہے
ویسا بے حیا نہیں دل میر کا جو رہ نہ سکے — چلن پھرتا کبھو اُس پاس کو جا نکلے ہے

ہیں دل گداز جن کے کچھ چیز مال وے ہیں — ہوتے ہیں ملتفت تو پھر خاک زر بنے ہے
سارے دکھوں کی ان سے ہو جائے گی تلافی — صحبت ہماری اُس کی ٹک بھی اگر بنے ہے

برسوں لگی رہی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں — تب کوئی ہم سا صاحب صاحب نظر بنے ہے
یاران دیر و کعبہ دونوں بلا رہے ہیں — اب دیکھیں میر اپنا جانا کدھر بنے ہے

دیوان سوم

شور کیا جو اُنکی گلی میں رات کو میں سب جان گئے — آہ و فغاں کے طور سے میر لوگ مجھے پہچان گئے
کہیے سو کیا اُنہوں سے کہ کیا چھیڑ تجاہل کی ہے نئی — نکلے تھے اس رستے سے جان کے بھی انجان گئے

تم کہتے ہو بوسہ طلب تھے شاید شوخی کرتے ہو — میر تو چپ تصویر سے تھے بات انہوں نے عجب کی ہے

ایک نہ آیا دید میں اپنے دلکش دلچسپ اُسکے رنگ
ان آنکھوں سے اس گلشن میں یوں تو ہزار کو دیکھا ہے
جمع کرو دل میر سے تم بھی بے تابی تھی دل کو بہت
اچھے کچھ آثار نہ تھے میں اس بیمار کو دیکھا ہے

جب دیکھتے ہیں میر تمہیں بے دماغ ہو — اپنے کو ناز عشق میں صاحب دخیل ہے

برسوں گزرے ہیں ملے کب تئیں یوں پیار رہے — دور سے دیکھ لیا اُس کو تو جی مار رہے
وہ میر ذرا نہ کہ جو قلق ہو اُسے سو معلوم — پیار دل کہنے کو اس شوخ سے ہم یار رہے

اب تک تو نہیں اچھی اب دیکھیے پیری ہے — سب لوگوں بیچ ہیں لیکن یاں محض فقیری ہے

سوز دروں نے آخر جی ہی کھپا دیا ہے — ٹھنڈا دل اب ہے ایسا جیسے بجھا دیا ہے
عالم شکار ہے وہ اس بن میں میر اُس کو — ڈھب جانے مارنے کا کن نے بتا دیا ہے

ہم چمن میں گئے تھے وا نہ ہوئے — نکہتِ گُل سے آشنا نہ ہوئے
سر کسو سے فرو نہیں آتا — حیف بندے ہوئے خُدا نہ ہوئے
کیسا کیسا قفس سے سر مارا — موسمِ گُل میں ہم رہا نہ ہوئے
میں نہ گردن کٹائی جب تک میر — عشق کے مجھ سے حق ادا نہ ہوئے

ناظر ابھی اتنی پریشاں آنکھیں بھریں ہیں اُس بن حیراں
تم نے کہا دل جا ہے تو بیٹھو دل کیا جانے کیدھر ہے
تاب و تواں کا حال وہی ہے آج تلک ہم جیتے ہیں
تم پوچھو تو اور کہیں کیا نسبت کل کی بہتر ہے
جب سے ملا اُس آئینہ رُو سے خوش کی اُن نے بدخوئی
پانی کی سی دسے ہے پھونک سبھوں کو میر فقیر قلندر ہے

ہیں خوبیاں ہی خوبیاں وحشی طبیعت میر میں — پر اُنس کم ہم سے ہے وہ بیل اب کی بے سود پڑی ہے

اس عرصے سے گیا ہو کہیں کوئی تو کہیں — چل پھر کے لوگ یاں کے یہیں سارے رہ گئے
تسبیحیں ٹوٹیں خرقے مصلّے پھٹے جلے — کیا جانے خانقاہ میں کیا میر کہہ گئے

میر کیوں رہتے ہیں اکثر ان سے — کر نہیں بنتی کسو سے جو بنے
ہے توکّل جی سے ہم درویش میں — کہہ ہی سکتے ہیں جو کچھ دل میں ٹھنے

ہم پہ رہتے ہو کیا کمر کستے — اچھے ہوتے نہیں جگر خستے
سیر قابل ہو تنگ پوش اب کے — کُہنیاں پھنستی چولیاں چستے
رنگ لیتی ہے سب ہوا اُس کا — اس سے باغ و بہار ہیں رستے

میر صنّاع ہے ملو اُس سے — دیکھو باتیں تو کیا بناتا ہے

طاعت کا محو تب ہے جب ڈھب نہیں بتوں سے		چھوڑے نماز واجب گر میر وقت پاوے

بہار آئی نکالو مت مجھے اب کے گلستاں سے		مرا دامن بنے تو باندھ تو گل کے گریباں سے
نہ ٹک راحت ہوئی دل کو نہ جی کی لاگ کچھ باقی		رہے دس دن جو اپنی عمر کے یاں ہم سو جہاں سے
ادھر زنجیر کا غل ہے ادھر ہنگامہ لڑکوں کا		جنوں اس دشت میں ہم نے کیا ہے کیسے ساماں سے
خدا جانے کہ دل کس خانہ آباداں کو دے بیٹھے		کھڑے تھے میر صاحب گھر کے دروازے پہ حیراں سے

برسوں تک جی کو مار مارا ہے		رات دن ہم امیدوار رہے
ہو ہم گل تنک رہے گا کون		کھنچنے ہی دل کو خار خار رہے
وصل یا ہجر کچھ ٹھہر جائے		دل کو اپنے اگر قرار رہے
کم ہے کیا لذت ہم آغوشی		یہ مزہ ہے میر در کنار رہے

یوں پاس راہ کی تو شناسا نہیں ہے کوئی		جاتے ہیں ہم جرس سے اس قافلے میں بکتے

کہیں کیا جو ہے میر بے ہوش سا		خدا جانے یہ کیا ہے درویش ہے

پوچھنا اُس ناتواں کا خوب تھا		پھر نہ پوچھا اُن نے وہ بھی زور ہے

گرچہ جی کب چاہتا ہے آپ کا آنے کو یاں		پر کبھو تو آئیے خاطر ہماری کیجیے
آشنا ہو اس سے ہم مر گئے آسودہ میر		جیتے رہیے تو کسو سے اپنی یاری کیجیے

پیدا ہے اس طرح کی جز میر کس سے ہوئے		یا ورنہ ہو تو دیکھو یہ ہو نہ ہو وہی ہے

ہم سا شکستہ خاطر اس بستی میں نہ ہو گا		برسے ہے عشق اپنے دیوار اور در سے
چاہت بُری بلا ہے کل میر نالہ کش بھی		ہمراہ نے سواراں دوڑے پھرے نفر سے

سے موئے سر سے ناخنِ پا تک بھری ہے آگ — جلتے ہیں دردمند پہ جلتے کڈھب ہیں یے
غربت پہ مہرباں ہوئے میری سو یہ کہا — ان کو غریب کوئی نہ سمجھے غضب ہیں یے
سیّد ہیں میر صاحب درویش و دردمند — سر رکھیے اُن کے پاؤں پہ جائے ادب ہیں یے

اب جنوں میں میر سوئے دشت جائے — کار وحشت کے تئیں یک شو کرے

جی ہی دینے کا نہیں کڑھنا فقط — اس کے در سے جانے کی حسرت بھی ہے
دُور سے باتیں کرے ہے یوں ہی یار — میر صاحب تم نہیں صحبت بھی ہے

چھپے ہم اگر تم کو اکراہ ہے — فقیروں کی اللہ اللہ ہے
جہاں لگ چلے گل سے ہم داغ ہیں — اگرچہ صبا بھی ہوا خواہ ہے
غم عشق ہے ناگہانی بلا — جہاں دل لگا کڑھنا جانکاہ ہے
کسی کو تہی بت پرستی ہیں کچھ — خدا اس عقیدے سے آگاہ ہے
کہا میر کے جی کی سنکر وہ شوخ — لگا کہنے سب کو یہی راہ ہے

غزل ہی کی ردیف و قافیہ کا رفتہ رہتا ہے — نکلنا میر اب مشکل ہے میراان زمینوں سے

بے تابی جو دل ہر گھڑی اظہار کرے ہے — اب دیکھوں مجھے کس کا گرفتار کرے ہے
کچھ میں بھی عجب جنس ہوں بازار جہاں میں — سو ناز مجھے لیتے خریدار کرے ہے
آ گئے تو جو کچھ ہم نے کہا مان لیا اب — اک ایک سخن پر بھی وہ تکرار کرے ہے
کیونکہ نہ ہو تم میر کے آزار کے در پے — یہ جرم ہے اُس کا کہ تمہیں پیار کرے ہے

اس کا غضب سے نامہ نہ لکھنا تو سہل ہے — لوگوں کے پوچھنے کا کوئی کیا جواب دے

ے

نہ جرأت ہے نہ جذبہ ہے نہ یاری بخت بد سے ہے
یہی بے طاقتی خوں گشتہ دل کو میرے کد سے ہے

سخن کرنے میں نستعلیق گوئی ہی نہیں کرتا
پڑھے ہیں شعر کوئی ہم سو وہ بھی شد و مد سے ہے

دن فصل گل کے اب کی بھی جاتے ہیں باؤ سے
دل داغ ہو رہا ہے چمن کے سبھاؤ سے

وارفتگان عشق بھی کیا سرخ لوگ ہیں
دل کے سنگتے ہیں دیتے ہیں جی کیسے چاؤ سے

کہنے تو کچھ بات کوئی دل کی میر سے
پڑتی ہے بہت دیر وہ ناخنوں کے گھاؤ سے

کیا حال برا ہے کہ جو دیکھے سو مر جائے
ہچکی کوئی رہ جائے کوئی جی سے گزر جائے

کیا ذکر مرا میں تو کہیں اس سے ملو تم
ان خانہ خرابوں کی کہو جن کے وہ گھر جائے

تیور کے جرم الفت پر نہیں نہ چہرہ ملامت ہے
شکل اس کی خدا جانے نہیں کہتے قیامت ہے

کھٹکا ہوتا نہیں وہ رہزن دل پاس عاشق کے
موافق ہم سے اک دزدی کی صاحب سلامت ہے

پیے دارو بدمستی پھرتے تھے کل تک میر کوچوں میں
انہیں کہہ مسجد جامع کی دیکھی آج امامت ہے

نہیں ہے چاہ بھلی اتنی بھی دعا کر میر
کہ اب جو دیکھوں اسے میں بہت نہ پیار آئے

دن رات گاہ دیکھے کہ جب دیکھو ہیں سفر میں
ہم کس گھڑی وداعی یارب ہوئے وطن سے

دل سوختہ ہوں مجھ کو تکلیف حرف مت کر
اک آگ کی لپٹ سی نکلے ہے ہر سخن سے

کعبے کے در پہ تھے ہم یا دیر میں در آئے
آوارگی تو دیکھو کیدھر سے کیدھر آئے

دیوانگی ہے میری اب کی کوئی تماشا
رہتے ہیں گھیرے مجھ کو کیا اپنے کیا پرائے

آ ہم نشیں بنے تو آج ان کنے بھی چلیے
کہتے ہیں میر صاحب مدت میں کل گھر آئے

قصر و مکان و منزل ایکوں کو سب جگہ ہے ایکوں کو جا نہیں ہے دُنیا عجب جگہ ہے

مت پڑا رہ دیکھ کے ٹکڑوں پہ میر اُٹھ کے کعبے چل خدا رزاق ہے

بُت کدے سے تو چلے کعبے ڈرے دس قدم ہم دل کو کر پتھر گئے
کیا جو اُڑتی سی سُنی آئے ہیں گل ہم اسیروں کے تو بال و پر گئے
مجلسوں کی مجلسیں برہم ہوئیں لوگ دے دے پل مارتے کیدھر گئے
خانوادے ہو گئے کیا کیا خراب خانہ ساز دین کیسے مر گئے
دست افشاں پائے کوباں شوق میں صومعے سے میر جی باہر گئے

دیوانِ چہارم

واعظِ ناکس کی باتوں پر کوئی جاتا ہے میر آؤ مے خانے چلو تم کس کے کہنے پر گئے

خوار پھرایا گلیوں گلیوں سر مارے دیواروں سے
کیا کیا اُن نے سلوک کیے ہیں شہر کے عزت داروں سے
شور کیا جو میں نے شبانگہ بے تابی سے دل کی بہت
کہنے لگا جی تنگ آیا ان مہر و وفا کے ماروں سے
حرفت تو ساتھ اپنے نہیں ہیں ورنہ درآتے قافلہ ساں
راہ میں باتیں کس کس ڈھب کی کرتے ہیں ہم یاروں سے
خستہ ہو اپنا ایسا ہی کوئی پھر بھی گلے سے لگاتے ہیں
وحشت ایک نہیں کو دیکھی اپنے سینہ فگاروں سے
حرف کی پہچان اس کو نہ تھی تو سادہ ہی کچھ اچھا تھا
ناحق آگے جانے ہے کوئی سو ہوا اب تکراروں سے
کوہکن و مجنوں یہ دونوں وحشت کدہ میں سردار رہے
شوق نہیں ملنے کا ہم کو میر ایسے ناداروں سے

سودے میں دل کے نفع جو چاہے خام طبع سودائی ہے
وارا سارا عشق میں کیسا جی کا بھی نقصان کرے
آتش خو مغرور ہے دیسے عہدہ برآ کیا عاشق ہو
دل کو جلاد سے منت رکھے جی مارے احسان کرے
کہنے میں یہ بات آتی نہیں ہو سیر خدا کی قدرت کی
موند کر آنکھیں میر اگر تو دل کی طرف ٹک دھیان کرے

بے دل ہوئے بے دیں ہوئے بے وقر ہم ات گت ہوئے
بے کس ہوئے بے بس ہوئے بے کل ہوئے بے گت ہوئے
ہم عشق میں کیا کیا ہوئے اب آخر آخر ہو چکے
بے مت ہوئے بے ست ہوئے بے خود ہوئے میت ہوئے
الفت جو کی کہتا ہے جی حالت نہیں عزت نہیں
ہم بابت ذلت ہوئے شائستہ کلفت ہوئے
آنکھیں بھر آئیں جی رندھا کہیے سو کیا چپکے سے تھے
جی چاہتا مطلق نہ تھا ناچار ہم رخصت ہوئے
یا مست درگاہوں میں شب کرتے تھے شاہد بازیاں
تسبیح لے کر ہاتھ میں یا میر اب حضرت ہوئے

باغ میں سیر کبھو ہم بھی کیا کرتے تھے
روش آب رواں پھیلے پھرا کرتے تھے
غیرت عشق کہو وقت بلا تھی ہم کو
تھوڑی آزردگی میر ترک وفا کرتے تھے
دل کی بیماری سے خاطر تو ہماری تھی جمع
لوگ کچھ یوں ہی محبت سے دوا کرتے تھے
جب تلک شرم رہی مانع شوخی اس کی
تب تلک ہم بھی ستم دیدہ حیا کرتے تھے
مائل کفر جوانی میں بہت تھے ہم لوگ
دیر میں مسجدوں میں دیر رہا کرتے تھے
اب تو سب تاب دل سے ہمیں بھلا ہی دیا
آ گئے رنج و تعب عشق اٹھا کرتے تھے
اٹھ گئے پر ہمیں تکیے تو کہیں گے یاں میر
درد دل بیٹھ کہانی سی سنا کرتے تھے

باغ میں جا کر ہم جو رہے سو داغ ہی داغ آشفتہ ہوا
کیا کیا سر پہ ہمارے آ کر بلبل شب چلائی ہے

قصہ ہم غربت زدگاں کا کہنے کے شائستہ نہیں
بے صبری کم پائی ہے پھر دوری سے تنہائی ہے

چشمک چتون نیچی نگاہیں چاہ کے تیرے شعر ہیں
میر عبث بگڑے ہے ہم سے آنکھیں تو لگائی ہے

دیر سے ہم کو بھول گئے ہو یاد کرو تو بہتر ہے
غم ہجراں کا کب تک کھینچیں شاد کرو تو بہتر ہے

ہو کہیے گا حق میں میرے خوبی ہی میری آگے ہی ہیں
داد کرو تو بہتر ہے بے داد کرو تو بہتر ہے

عشق میں دم مارا نہ کبھو تم چپکے چپکے میر چپے
لو ہو منہ سے مل کر اب فریاد کرو تو بہتر ہے

قرار دل سے گیا ہے اب کی کہ رک کے گھر میں مریں گے یاں
بہار آئی جو اپنے جیتے تو سیر کرنے چلا کریں گے

ہلاک ہونا مقرری ہے مرض سے دل کے پہ تم کڑھو ہو
مزاج صاحب اگر ادھر ہے تو ہم بھی اپنی دوا کریں گے

غم محبت میں میر ہم کو ہمیشہ جلنا ہمیشہ مرنا
صعوبت ایسی دماغ رفتہ کہاں تلک ہم دفا کریں گے

چلتے ہو تو چمن کو چلیے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے

رنگ ہوا سے یوں ٹپکے ہے جیسے شراب چواتے ہیں
آگے ہو مے خانے کے نکلو عہد بادہ گساراں ہے

کوہ کن و مجنوں کی خاطر دشت و کوہ میں ہم نہ گئے
عشق میں ہم کو میرؔ نہایت پاسِ عزت داراں ہے

ہم جہدِ دربدری کے سرگرم تھے
خدا جانے وہ لوگ کیدھر گئے
رباطِ کہن میں نہیں میرؔ جی
ہوا جو لگی وے بھی باہر گئے

موسم ہے نکلے شاخوں سے پتے ہرے ہرے
پودے چمن میں پھولوں سے دیکھے بھرے بھرے
آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

ہماری تیری مودّت ہی دوست داری ہے
ہزار سابقوں سے سابق ایک یاری ہے
کریں تو جا کے گدایانہ اُس طرف آواز
اگر صدا کوئی پہچانے شرم ساری ہے
ہمیں ہی عشق میں جینے کا کچھ خیال نہیں
وگرنہ سب کے تئیں جان اپنی پیاری ہے

عشق میں کھوئے جاؤ گے تو بات کی تہ بھی پاؤ گے
قدر ہماری کچھ جانو گے دل کو کہیں جو لگاؤ گے
صبر کہاں بے تابیٔ دل سے چین کہاں بے خوابی سے
سو سو بار گلی میں تکتے گھر سے باہر آؤ گے
صنعت گریاں صاحبِ بندہ دل کی لگی کب پیش گئیں
ایک نہیں وہ سننے کا تم باتیں بہت بناؤ گے
چاہ کیے درویش ہوئے تو آپ خورش کی فکر نہیں
لوہو پیو گے اپنا ہر دم غم غصہ ہی کھاؤ گے
رنگ محبت کے ہیں کتنے کوئی تمہیں خوش آویگا
خون کرو گے یا دل کو یا داغ جگر پہ جلاؤ گے
رہتے ہیں مبہوتِ الفت ہیں گم گشتہ کلفت میں
بھولے بھولے آپ ہی پھرو گے کس کو راہ بتاؤ گے

اشک تو پانی سے ہیں لیکن جلتے جلتے آویں گے
دل کی لگی حیران ہیں صاحب کس ڈھب مل کے بجھاؤ گے

چاہت میر سبھی کرتے ہیں رنج و تعب میں رہتے ہیں
تم جو ابھی بے تاب ہو ایسے جی سے ہاتھ اٹھاؤ گے

اے میر شعر کہنا کیا ہے کمال انساں
یہ بھی خیال سا کچھ خاطر میں آ گیا ہے

کہو سو کریے فراق اس کا تو جی کو میرے کھپا گیا ہے
دروں میں آگ اک لگا گیا ہے بدن کو یکسر جلا گیا ہے

میر اٹھ بت کدے سے کعبے گیا
کیا کرے جو خدا خراب کرے

حال رہا ہو ہم میں کچھ تو حال کسو سے کہا جاوے
آن رہی ہے آج دموں پر کل تک کیونکر رہا جاوے

عشق کیا ہے جب سے ہم نے دل کا کوئی مدعا ہے
اشک کی سرخی زردی چہرہ کیا کیا رنگ بدلتا ہے
ضعف دماغی جس کو ہووے عشق کے رنج و محنت سے
جی بھی سنبھلتا ہے اس کا پر بعد از دیر سنبھلتا ہے

کہہ صوفی چل میخانے میں لطف نہیں اب مسجد میں
ابر ہے باراں باز نرمک رنگ بدن میں جھمکا ہے

میر جی کی بیماری دل کو کب سے ہم سب سنتے ہیں
پوچھے کوئی مزاج کو اس کے ان روزوں میں کیا ہے

صبر کیا جاتا نہیں ہم سے ضعف بھی ہے بیتابی ہے
سہل نہیں ہے جی کا ڈھہنا کیسی خانہ خرابی ہے

کس سے سبب میں پوچھوں یارب اپنی سوزش سینہ کا
چھاتی جو جلتی رہتی ہے ات گت آگ گمریاں دابی ہے
در بدر و رسوا و عاشق شاعر شاغل کامل میر
گھر کعبے میں دیر میں گاہے کیا کا فر ہر جائی ہے

دل کی بات کہی نہیں جاتی چپکے رہنا ٹھانا ہے
حال اگر ہے ایسا ہی تو جی سے جانا جانا ہے
دل جو رہے تو پاؤں کو بھی دامن ہی میں ہم کھینچ رکھیں
صبح سے لے کر سانجھ تلک ادھر ہی آنا جانا ہے
سرخ کبھو آنسو ہیں ہوتے زرد کبھو ہے منہ میرا
کیا کیا رنگ محبت کے ہیں یہ بھی ایک زمانہ ہے
آنکھوں کی یہ مردم داری دل کو کسو دلبر سے ہے
طرز نگہ طراری ساری میر تمہیں پہچانا ہے

کیا کیا ہم نے رنج اٹھائے کیا کیا ہم بھی شکیبا تھے
دو دن جوں توں جیتے رہے سو مرنے ہی کے ہیّا تھے
عشق کیا سو باتیں بنائیں یعنی شعر شعار ہوا
بیتیں جو دے مشہور ہوئیں تو شہروں شہروں رسوا تھے
کیا پگڑی کو پھیر کے رکھتے کیا سر نیچے نہ ہوتا تھا
لطف نہیں اب کیا کہیے کچھ آگے ہم بھی کیا کیا تھے
کیا ہوتا جو پاس اپنے لے میر کبھو وے آجاتے
عاشق تھے درویش تھے آخر بیکس بھی تھے تنہا تھے

ایک پل بھی نہ اُس سے آنسو پچھے ‏ روتے مجھ کو پہر پہر گزرے
سر کا جانا ہی ہر قدم ہے میر ‏ کیا کوئی اُس کی راہ پر گزرے

۷۹۔ جب سے آنکھیں کھلی ہیں اپنی درد و رنج و غم دیکھے
ان ہی دیدۂ نم دیدوں سے کیا کیا ہم نے ستم دیکھے
سر جلنے کی اور اپنے زنہار نگاہ نہ کی ہم نے
اُٹھ کے اندھا دُھند گئے چلے ہی اُس ظالم کے قدم دیکھے

کیا کوئی اُس گلی میں آوے میر
آوے تو لوہو میں نہا بھی جائے

دونوں طرف سے دیدہ درائی نہیں ہے خوب
اس چاہ کا ہے لطف جو آپس میں ڈر رہے

عیب آدمی کا ہے جو رہے اُس دیار میں
مطلق جہاں نہ میر رواج ہنر رہے

پھر اب چلو چمن میں کھلے غنچے رک گئے
شاخوں سمیت پھول نہالوں کے جھک گئے
چشمیں ہزار دیدۂ گل رہ گئے کھلے
افسوس ہے چمن کی طرف تم نہ ٹک گئے

دیوانِ پنجم

مجھ کو مارا بھلا کیا تو نے
پر وفا کا برا کیا تو نے
حسرتیں اُس کی سر کھپتی ہیں
مرگِ فرہاد کیا کیا تو نے
وہ جو کہنا تھا تو ہی کر یو قتل
میر کا سو کہا کیا تو نے

مو بہے تُنکے لہو ہائے محبت میں ہے کچھ شور
اب دیکھتے ہیں اس میں تو جی ہی کا ضرر ہے
کیا کہیے کچھ بن نہیں آتی جنگل جنگل ہو آئے
چھانا شہر میں جا کے پھولوں کی ہم عشق جنوں کو ڈھا آئے
دل کی تلاش میں اک گئے تھے تبدیلی پیدا ہو سو
جان کو اپنے گرا دی تو نے اُس کی گلی میں کھو آئے
کچھ کہنے کا مقام نہ تھا وہ ورنہ کہتے کچھ
آنا نہ آنا یکساں تھا واں ہوتے ادھر ہم گو آئے
سب کہتے سنتے ہیں کہ بھی نہ دیکھا تیرا سخن
پتھر رکھ کے سر پر نے ہم ٹک اُس کی گلی میں سو آئے

کیا ہی دامن گیر تھی یا رب خاکِ بسمل گاہِ وفا — اُس ظالم کی تیغ تلے سے ایک گیا تو دو آئے
سر دینا ٹھہرا کر ہم نے پاؤں کو باہر رکھا تھا — ہر سو ہو دشوار ہے پھرنا میر ادھر اب تو آئے

جوں ابر بے کسانہ روتے اُٹھے ہیں گھر سے — برسے ہے عشق اپنے دیوار اور در سے
یہ عاشقی ہے کیسی ایسے جیوگے کب تک — ترکِ وفا کرو ہو مرنے کے میر ڈر سے

بسانِ برق وہ جھمکے دکھا دے — دلے دل شرط ہے جو تاب لاوے
پڑا اترا کیا میں دوپہر دن — عجب کیا ہے جو پاس اپنے بُلا وے
بُتانِ دیر سے ایسی نہیں لاگ — خُدا ہی ہو تو کعبے میر جاوے

اگر مسجد سے آؤں میر تو بھی لوگ کہتے ہیں — کہ مے خانے سے پھر دیکھو وہ شاہد باز آتا ہے

پتا پتا بُوٹا بُوٹا حال ہمارا جانے ہے — جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
آگے اُس متکبّر کے ہم خدا خدا کیا کرتے ہیں — کب موجود خُدا کو وہ مغرور خود آرا جانے ہے
عاشق سا تو سادہ کوئی اور نہ ہوگا دُنیا میں — جی کے زیاں کو عشق میں اُس کے اپنا وارا جانے ہے
چارہ گری بیماریِ دل کی رسمِ شہرِ حسن نہیں — ورنہ دلبرِ ناداں بھی اس درد کا چارا جانے ہے
مہر و وفا و لُطف و عنایت ایک سے واقف ان میں نہیں — اور تو سب کچھ طنز و کنایہ رمز و اشارا جانے ہے

عالم عالم عشق و جنوں ہے دُنیا دُنیا تہمت ہے — دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے
ہائے غیوری جس کے دیکھے جی ہی نکلتا ہے اپنا — دیکھیے اُس کی اور نہیں پھر عشق کی یہ بھی غیرت ہے
صبح سے آنسو نومیدانہ جیسے وداعی آتا تھا — آج کسو خواہش کی شاید دل سے ہمارے رخصت ہے

یاری کر سے جو جی ہے کسو سے غم ہے ہم کو یاری کا — لے دو پہر یاں آہ و فغاں ہے شب ہے قیامت زاری کا

دل کی بیچ رہتا ہے میر اچھی زندگی کچھ جاتا ہے — کیا جانوں میں چشم تر دوں کا کب دریا جوش آتا ہے

سچ ہے وہ جو کہا کرتا ہے کون ہے تو کیا مجھے ہمیں — بیگانے تو ہیں ہی ہم وے ناتوں کا چاہ کا ناتا ہے
عشق و محبت کیا جانوں میں لیکن اتنا جانوں ہوں — اندر ہی اندر سینے میں میرے دل کو کوئی کھاتا ہے
عاشق اپنا جان لیا ہے اُن نے شاید میر ہمیں — دیکھ بھری مجلس میں اپنی ہم ہی سے شرماتا ہے

اُس مغرور کو کیا ہوتا ہے حالِ شکستہ دکھلانے سے — جس کو شبہ ہووے نہ ہرگز جی کے ہمارے جانے سے
رنج و عنا پر درد و بلا پر صبر کئے ہم بیٹھے ہیں — کلفت اُلفت جاتی رہی کیا جور و ستم کے اُٹھانے سے
جھگڑا ناز و نیاز کا شکر بے مزہ ہم سے تم تو ہوئے — میر سخن کو طول نہ دو بس بات بڑھے ہی بڑھانے سے

گردش دنوں کی کم نہ ہوئی کچھ کڑھتے ہوتے — روزے رکھے غریبوں نے تو دن بڑھے ہوئے

ظلم و ستم سب سہل ہیں اُسکے ہم سے اُٹھتے ہیں کہ نہیں — لوگ جو پرسشِ حال کریں ہیں جی تو اُنہوں نے کھایا ہے

دیر کعبہ پہ کفر بکتا ہے میر — مسلماں نہیں وہ کہن گبر ہے

غم سہے ہیں داغ ہوئے ہیں رنج اُٹھے ہیں درد کھنچے
اب وہ دل میں تاب نہیں جو لب تک آہِ سرد کھنچے

پہلے اسیرِ دام ہوئے تھے نکلے ٹوٹی شکن کی راہ — اب کی دیکھیں موسمِ گل کا کیسے کیسے شگوفے لائے

ہم پہ چشم و عتاب ہے سو ہے — وہ ہی ناز و عتاب ہے سو ہے
زلفیں اُس کی ہوا کریں برہم — ہم کو بھی پیچ و تاب ہے سو ہے
شہر میں در بدر پھرے ہیں عزیز — میر ذلت مآب ہے سو ہے

اس کج روش سے ملنا خرابات میں نہ تھا — بے طور ہم بھی جا کے سے بے جگہ گئے
وہ یار تو نہ تھا تہِ دل سے کسو کا میر — ناچار اُس سے جور و ستم ہم بھی سہہ گئے

ہائے جدائی ایک ہی جاگہ مار کے ہم کو توڑ رکھا — دے دن یاد آتے ہیں اب جب اُن کے آتے جاتے تھے
چاہت روگ بُرا ہے جی کا میرؔ اس سے پرہیز بھلا — اگلے لوگ سُنا ہے ہم نے دل نہ کسو سے لگاتے تھے

چارہ گر اس شہر کے ہوں تو فکر کریں آبادی کا — یارب بستے تھے جو یاں دے لوگ کہاں بیچارے گئے

سارے عالم کے حواسِ خمسہ میں ہے انتشار — ایک ہم تم ہی نہیں معلوم ہوتے دہ دلے

میرؔ کی تیری کیا سُلجھے گی حرف و سخن میں گنجلک ہے — کوئی بھی عاقل الجھ پڑے ہے ناصح ایسے دِوانے سے

درپئے خونِ میرؔ کے نہ رہو — ہو بھی جاتا ہے جُرم آدم سے

دادِ فریاد جا بجا کریئے — شاید اُس کے بھی دل میں جا کریئے
وہ نہیں سرگزشت سُنتا میرؔ — یوں کہانی سی کیا کہا کریئے

جو کوئی خستہ جگر عشق کا آزاری ہے — جی چُکا وہ کہ یہ بے طرح کی بیماری ہے
آنکھ مستی میں کسو پہ نہیں پڑتی اُس کی — یہ بھی اُس سادہ دپُرکار کی ہشیاری ہے
واں سے جُز نازو تبختر نہیں کچھ یاں سے میرؔ — عجز ہے دوستی ہے عشق ہے غم خواری ہے

دردِ غم سے دل کبھو فرصت نہ پائے — یہ صعوبت کب تک کوئی اُٹھائے
زار رونا چشم کا کب دیکھئے — دیکھیں ہیں لیکن خدا جو کچھ دکھائے
کب تلک چاکِ قفس سے جھانکئے — برگِ گُل یاں بھی صبا کوئی تو لائے

اکثر پُوچھے ہے جیتے ہیں میرؔ — اب تو کچھ مہرباں بہت ہے

عشق ہمارا درپئے جاں ہے کیسی خصومت کرتا ہے — چین نہیں دیتا ہے ظالم جب تک عاشق مرتا ہے

بے قراری ہو کیوں نہ چاہت میں — ہم دگر کچھ قرار ہوتا ہے
کس کو پوچھے ہے کوئی دنیا میں — دیر یاں اعتبار ہوتا ہے

عشق بلا انگیز مفتن یہ تو کوئی قیامت ہے — جس سے پیار رکھے ہے کچھ یہ اُس کے سر پر شامت ہے
موسم گُل میں توبہ کی تھی واعظ کے ہی کہنے سے — اب جو رنگ بہار کے دیکھے شرمندہ ہیں ندامت ہے
تُو ہی کر انصاف صبا ٹک باغوں باغوں پھرے ہے تُو — رُوئے گُل اس کا سو رُو ہے سرو کا ایسا قامت ہے
چھوڑ دو اُس او باش کا ملنا ورنہ سر کٹواؤ گے — چاہ رہو گے بُہتیروں کو سر جو میر سلامت ہے

فریاد شب کی سُن کے کہا ہے دماغ ہو — دیکھو تو اس بلا کو یہ شاید کہ میر ہے

ان بلاؤں سے کب رہائی ہے — عشق ہے فقر ہے جُدائی ہے
دیکھیئے رفتہ رفتہ کیا ہووے — ہم بھی چلنے کو ہیں کہ آئی ہے
اس صنائع کا اس بدائع کا — کچھ تعجب نہیں خُدائی ہے
نہ تو جذب رسا نہ بخت رسا — کیونکہ کہیئے کہ واں رسائی ہے
اور کچھ مشغلہ نہیں ہو ہمیں — گاہ دے گہ غزل سرائی ہے
وہ نہ شرمائے کب تلک آخر — دوستی یاری آشنائی ہے
وے نہیں تو آنہوں کا بھائی اور — عشق کرنے کی کیا منائی ہے

ترے بندے ہم ہیں خدا جانتا ہے — خُدا جانے تُو ہم کو کیا جانتا ہے
بلا شور انگیز ہے چال اُس کی — اسی طرز کو خوش نما جانتا ہے
جہاں میر عاشق ہوا خوار ہی تھا — یہ سودائی کب دل لگا جانتا ہے

زمانے کے اکثر ستم گار دیکھے — وہی خوب طرز جفا جانتا ہے
نہ جانے جو بیگانہ تو بات پوچھے — سو مغرور کب آشنا جانتا ہے

دیوانِ ششم

دم میں دم جب تلک تھا سوچ رہا — سانس کے ساتھ سارے سانسے گئے
واں گئے کہتے دے خرامِ ناز — ہاں جواں کیسے کیسے جاں سے گئے

کچھ نہ کی اُن نے جس کو چاہا ہے — جُوں تُوں اپنا کیا نباہا ہے
شب خبر اپنے غم زدے کی لے — صبح تک رات کو کراہا ہے

عشق میں ہم نے جانکنی کی ہے — کیا محبت نے دشمنی کی ہے

میر کو ہے کیا جوانی میں صلاح — تب تو سارے مے کدے کا پیر ہے

زمیں اور ہے آسماں اور ہے — تب آناً فآناً سماں اور ہے
نہ وے لوگ ہیں اب نہ اجماع وہ — جہاں وہ نہیں یہ جہاں اور ہے
نہ ان لوگوں کی بات سمجھی گئی — یہ خلق اور ان کی زباں اور ہے
ہوا رنگ بدلے ہے ہر آن میر — زمین و زماں ہر زماں اور ہے

کہو تو کب تئیں یوں ساتھ تیرے پیار رہے — کہ دیکھا جب تجھے تب جی کو مار مار رہے
ہوس اسیروں کے ٹک دل کی نکلے کچھ شاید — کوئی دن اور اگر موسمِ بہار رہے
لیا تو جاوے کبھو نام منہ سے یاری کا — جو ہم ستم زدوں سے یار کچھ بھی یار رہے
وصال ہجر ٹھہر جاوے یہ کچھ نہ کچھ آخر — جو بے قرار مرے دل کو بھی قرار رہے
نہ کریئے گریہ پہ اختیار ہرگز میر — جو عشق کرنے میں دل پر کچھ اختیار رہے

پرسے ہے عشق یاں تو دیوانہ در در سے — روتا گیا ہے ہر اک جوں ابر میرے گھر سے
سر دے دے مارتے ہیں ہجراں میں میر صاحب — یارب چھڑا تو اُن کو چاہت کے درد سر سے

جب سے جہاں ہے تب سے خرابی یہی ہے میرؔ   تم دیکھ کر زمانے کو حیران کیا رہے

وہ اب ہوا ہے اتنا کہ جور و جفا کرے   افسوس ہے جو عمر نہ میری وفا کرے
ہجرانِ یار ایک مصیبت ہے ہمنشیں   مرنے کے حال سے کوئی کب تک جیا کرے
رُکنے سے میرے رات کے سارا جہاں رُکا   آئے نسیمِ صبح کہ اک دم ہوا کرے
عارف ہے میرؔ اُس سے ملا بیشتر کرو   شاید کہ وقتِ خاص میں تمکو دُعا کرے

گُل نے بہت کہا کہ چمن سے نہ جائیے   گُل گشت کو جو آیئے آنکھوں پہ آیئے
میں بے دماغ کر کے تغافل چلا گیا   وہ دل کہاں کہ ناز کسو کے اُٹھایئے
صحبت عجب طرح کی پڑی اتفاق ہائے   کھو بیٹھیئے جو آپ کو تو اُس کو پایئے
رنجیدگی ہماری تو پر سہل ہے ولے   آزردہ دل کسو کو نہ اِتنا ستایئے
خاطر ہی کے علاقے کی سب ہیں خرابیاں   اپنا ہو بس تو دل نہ کسو سے لگایئے
اے ہمدم ابتدا سے ہے آدم کشی میں عشق   طبعِ شریف اپنی نہ ایدھر کو لایئے
جانِ عشیوہ پیشہ ہے ستم سا ستم کہ میرؔ   بگڑا جنہوں سے چاہیئے اُن سے بنایئے

نامہربانی نے تو تمہاری کیا ہلاک   اب لگ چلیں گے اور کسی مہربان سے

کہو سو کریئے علاج اپنا طبیبِ دل بلائے جاں ہے
نہ شب کو مُہلت نہ دن کو فرصت دمادم آنکھوں سے خوں رواں
نمائشِ دل کی جو دلبری سے ہمارے یہ پاس آتمہیں رہے ہے
ستم رسیدہ شکستہ وہ دل گیا بھی خوں ہو کے یاں کہاں

سحر تا شب چند انتظاری رہے ہے   بھلا کب تلک بے قراری رہے ہے
بہا ہی کئے آنسو پلکوں پہ شب   کہاں تک ستارہ شماری رہے ہے
پھرا کرتے ہیں خوار گلیوں میں ہم   کہاں تک یہ اشتہاری رہے ہے

سودائی و رسوا و شکستہ دل و خستہ — اب لوگ ہمیں عشق میں کیا کیا نہ کہیں گے
دیکھے سو کہے کوئی نہیں جرم کسو کا — کہتے ہیں بجا لوگ بھی بے جا نہ کہیں گے
ہوں در بدر و خاک بسر چاک گریباں — اس طور سے کیونکر مجھے رسوا نہ کہیں گے
موقوف غم میر کہ شب ہو چکی ہمدم — کل رات کو پھر باقی یہ افسانہ کہیں گے

اب نہ حسرت رہے گی مرنے تک — موسم گل میں ہم اسیر ہوئے
شور جن کے سروں میں عشق کا تھا — وے جواں سارے پائے گیر ہوئے
بات کا ہم سے اُن کو کب ہے دماغ — میرؔ درویشی میں امیر ہوئے

شاید شراب خانے میں شب کو رہے تھے میرؔ — کھیلے تھا ایک مغ بچہ مُہر نماز سے

کچھ تو نسبت ہے اُسکے بالوں سے — یوں ہی کیا حال میرؔ درہم ہے

جو لوگ آسماں نے یاں خاک کر اڑائے — بے عبرتوں نے لے کر خاک اُن کی گھر بنائے
ہر اک صنم کدے کی کافر جگہ ہے ہم نے — قشقے بھی یاں کھنچائے زنار بھی بندھائے

اے خوشا حال اُس کا جس کا وے — حال عمداً تباہ کرتے تھے
کیا زمانہ تھا وہ جو گزرا میرؔ — ہم دگر لوگ چاہ کرتے تھے

اُس سخن رس سے اگر شب کی ملاقات رہے — بات رہ جائے نہ یہ دن رہیں نے رات رہے
دھجیاں جامے کی کردوں گا جنوں میں اب کے — گر گریباں دری کا کام مرے ہاتھ رہے
تنگ ہوں میرؔ جی بے طاقتی دل سے بہت — کیونکہ یہ ہاتھ تلے قبلۂ حاجات رہے

کیا پھر نظر چڑھا ہے اے میرؔ کوئی خوش رو — یہ زرد زرد چہرہ تیرا اُتر رہا ہے

چرخ پر اپنا مدار دیکھیئے کب تک رہے
ایسی طرح روزگار دیکھیئے کب تک رہے

اُس سے تو عہد و قرار کچھ بھی نہیں درمیاں
دل ہے مرا بے قرار دیکھیئے کب تک رہے

اس سرے سے اُس سرے داغ ہی ہیں صدر میں
ان بھی گلوں کی بہار دیکھیئے کب تک رہے

روئے سخن سب کا ہے میری غزل کی طرف
شعر ہے میرا شعار دیکھیئے کب تک رہے

گیسو و رخسارِ یار آنکھوں ہی میں پھرتے ہیں
میرؔ یہ لیل و نہار دیکھیئے کب تک رہے

گئے ان قافلوں سے بھی اُٹھی گرد
ہماری خاک کیا جانیں کہاں ہے

ہم بادہ جامۂ احرام کر چکے
مستی کی دہر میں قسم اقسام کر چکے

جامہ ہی وجہ مے میں ہمارا نہیں گیا
دستار و رخت سب گرو جام کر چکے

زنّار بھی تسبیح کے رشتے کے تار توڑ
ترکِ نماز و روزہ و اسلام کر چکے

جپ کرنے بیٹھے مالائے پیشِ روئے بُت
کفر اختیار کرنے میں ابرام کر چکے

صندل کے قشقے دیکھ برہمن بچوں کے بیچ
عاشق ہوئے سو آپ کو بدنام کر چکے

وا سوختہ ہو دیر سے کعبے کو پھر گئے
سو بار اضطراب سے پیغام کر چکے

شکر و گلہ صنم کدے کا حرف حرف میرؔ
کعبے کے رہنے والوں کو ارقام کر چکے

عشق کیا کوئی اختیار کرے
وہی جی مارے جس کو پیار کرے

غنچہ ہے سر پہ داغِ سودا کا
دیکھیں کب تک یہ گُل بہار کرے

آنکھیں پتھرائیں چھاتی پتھر ہے
وہی جانے جو انتظار کرے

یہ راہِ دُورِ عشق نہیں ہوتی میرؔ طے
ہم صبح بھی چلے گئے ہیں شام بھی چلے

تم کو تو التفات نہیں حالِ زار پر
اب ہم ملیں گے اور کسو مہربان سے

متفرقات

ناچار ہم تو تجھ بن جی مار کر رہیں گے — پر اس روش کو تیری یہ لوگ کیا کہیں گے

وے دن گئے کہ آٹھ پہر اُسکے پاس تھے — اب آ گئے تو دُور سے کچھ غم سُنا گئے

ہنس دے ہے دیکھتے ہی کیا خوب آدمی ہے — معشوق بھی ہمارا کیا خوب آدمی ہے

راہ آنسو کی کب تلک تکیئے — خونِ دل ہی کا اب مزا چکھیئے

کیا تجھ سے کہوں معاش اپنی — بارے گزرے ہے جیسے تیسے

خط و زلف و کاکل میں دل جا کے اُلجھا — نہ سمجھا یہ ناداں کہ ہندوستاں ہے

ہے گی طلب شرط یاں کچھ تو کیا چاہیئے — بیٹھے نہیں بنتی میاں کچھ تو کیا چاہیئے
عشق میں اے ہمرہاں کچھ تو کیا چاہیئے — گریۂ و شور و فغاں کچھ تو کیا چاہیئے
میں جو کہا تنگ ہوں مار مروں کیا کروں — وہ بھی لگا کہنے ہاں کچھ تو کیا چاہیئے
سوں کئے رہنے کی کس نے بدی ہے بھلا — لُطف و غضب مہرباں کچھ تو کیا چاہیئے
کیا کروں دل خوں کروں شعر ہی موزوں کروں — چلتی ہے اب تک زباں کچھ تو کیا چاہیئے
یہ تو نہیں دوستی ہم سے جو تم کو رہی — پاسِ دلِ دوستاں کچھ تو کیا چاہیئے
میر نہیں پیر تم کاہلی اللہ رے — نامِ خُدا ہو جواں کچھ تو کیا چاہیئے

رُباعیات

بُت خانے سے دل اپنے اٹھائے نہ گئے — کعبے کی طرف مزاج لائے نہ گئے
طورِ مسجد کو برہمن کیا جانے — یاں مدّت عمر میں ہم آئے نہ گئے

چُپکا چُپکا پھرا نہ کر تو غم سے — کیا حرف و سخن عیب ہے کچھ محرم سے
آخر کو رُکے رہتے جنوں ہوتا ہے — اے میر کوئی بات کیا کر ہم سے

اے میر کہاں دل کو لگایا تُو نے — شکل اپنی بگاڑ کر کڑھایا تُو نے
جی میں نہ ترے حال نہ مُنہ پر کچھ رنگ — اپنا یہ حال کیا بنایا تُو نے

سُن سوزِ دروں کو اسکے جلنے گھُننے — ہر حرف پہ افسوس ہے سر کو دُھننے
کیا کیا اب سانجھ سے کہے گا عالم — آؤ ٹک میر کی کہانی سُننے

ہم میر سے کہتے ہیں نہ تو رو یا کر — ہنس کھیل کے ٹک چین سے بھی سویا کر
پایا نہیں جانے کا وہ دُرِّ نایاب — کُڑھ کُڑھ کے عبث جان کو مت کھویا کر

وصف اپنے دلوں کے کس سے کہیئے سارے — اُس شوخ کی تمکیں نے تو جی ہی مارے
بالوں میں چھپا مُنہ نہ کبھو یوں پوچھا — کہہ میر گئی ہے رات کیونکر بارے

ہم سے تو بُتوں کی وہ حیا کی باتیں — وہ طرزِ کلام اس ادا کی باتیں
دیکھیں قرآں میں فال غیروں کیلئے — کیا ان سے کہیں یہ ہیں خدا کی باتیں

متفرقات

ناچار ہم تو تجھ بن جی مار کر رہیں گے — پر اس روش کو تیری یہ لوگ کیا کہیں گے

وے دن گئے کہ اٹھ پہر اُس کے پاس تھے — اب آ گئے تو دُور سے کچھ غم سُنا گئے

ہنس دے ہے دیکھتے ہی کیا خوب آدمی ہے — معشوق بھی ہمارا کیا خوب آدمی ہے

راہ آنسو کی کب تلک تکیئے — خونِ دل ہی کا اب مزا چکھیئے

کیا تجھ سے کہوں معاش اپنی — بارے گزرے ہے جیسے تیسے

خط و زلف و کاکل میں دل جا کے اُلجھا — نہ سمجھا یہ ناداں کہ ہندوستاں ہے

ہے گی طلب شرط یاں کچھ تو کیا چاہیئے — بیٹھے نہیں بنتی میاں کچھ تو کیا چاہیئے
عشق میں اسے ہمرہاں کچھ تو کیا چاہیئے — گریہ و شور و فغاں کچھ تو کیا چاہیئے
میں جو کہا تنگ ہوں مار مروں کیا کروں — وہ بھی لگا کہنے ہاں کچھ تو کیا چاہیئے
سو ن کسے رہنے کی کس نے بدی ہو بھلا — لُطف و غضب مہرباں کچھ تو کیا چاہیئے
کیا کروں دل خوں کروں شعر ہی موزوں کروں — چلتی ہے اب تک زباں کچھ تو کیا چاہیئے
یہ تو نہیں دوستی ہم سے جو تم کو رہی — پاسِ دلِ دوستاں کچھ تو کیا چاہیئے
میر نہیں پیر تم کاہلی اللہ رے — نامِ خُدا ہو جواں کچھ تو کیا چاہیئے

رُباعیات

بُت خانے سے دل اپنے اُٹھائے نہ گئے — کعبے کی طرف مزاج لائے نہ گئے
طورِ مسجد کو برہمن کیا جانے — یاں مدّتِ عمر میں ہم آئے نہ گئے

چُپکا چُپکا پھرا نہ کر تو غم سے — کیا حرف و سخن عیب ہے کچھ محرم سے
آخر کو رُکے رہتے جنوں ہوتا ہے — اے میرؔ کوئی بات کیا کر ہم سے

اے میرؔ کہاں دل کو لگایا تُونے — شکل اپنی بگاڑ کر کُڑھایا تُونے
جی میں نہ ترے حال نہ مُنہ پر کچھ رنگ — اپنا یہ حال کیا بنایا تُونے

سُن سوزِ دروں کو اسکے جلنے گُھننے — ہر حرف پہ افسوس سے سر کو دُھننے
کیا کیا اب سانجھ سے کہے گا عالم — آ دو ٹک میرؔ کی کہانی سُننے

ہم میرؔ سے کہتے ہیں نہ تو رو یا کر — ہنس کھیل کے ٹک چین سے بھی سو یا کر
پایا نہیں جانے کا وہ دُرِّ نایاب — کُڑھ کُڑھ کے عبث جان کو مت کھویا کر

وصف اپنے دلوں کے کس سے کھینچے سارے — اُس شوخ کی تمکیں نے تو جی ہی مارے
بالوں میں چھپا مُنہ نہ کبھو یوں پُوچھا — کہہ میرؔ گئی ہے رات کیونکر بارے

ہم سے تو بُتوں کی وہ حیا کی باتیں — وہ طرزِ کلام اِس ادا کی باتیں
دیکھیں قرآں میں فال غیروں کیلئے — کیا ان سے کہیں یہ ہیں خُدا کی باتیں

دل خون ہوا ضبط ہی کرتے کرتے — ہم ہو ہی چکے دکھوں کے بھرتے بھرتے
اے مایۂ زندگی ستم ہے یہ اگر — پھر آنکھ تجھے دیکھیں نہ مرتے مرتے

میر اس سے ملے کہ جو ملا بھی نہ کبھو — جی یوں ہی گیا وہ آ پھرا بھی نہ کبھو
چپ جس کے لئے لگ گئی ایسی ان کو — ان نے تو کچھ زیر لب کہا بھی نہ کبھو

تم تو اے مہرباں انوٹھے نکلے — جب ان کے پاس بیٹھے روٹھے نکلے
کیا کہیے وفا ایک بھی وعدہ نہ کیا — سچ یہ ہے کہ تم بہت ہی جھوٹے نکلے

کیا کیا اے عاشقی ستایا تو نے — کیسا کیسا ہمیں کھپایا تو نے
اول کے سلوک میں کہیں کچھ نہ رکھا — آخر کو ٹھکانے ہی لگایا تو نے

کیا میر کا مذکور کریں سب ہے جہل — پایا ہم نے اسے نہایت ہی سہل
ایسوں سے نہیں مزاج اپنا مانوس — وحشی بے طور بدزبان و نااہل

ملیے اس شخص سے جو آدم ہووے — ناز اس کو کمال پر بہت کم ہووے
ہو گرم سخن تو گرد آوے یک خلق — خاموش رہے تو ایک عالم ہووے

ہر صبح غموں میں شام کی ہے ہم نے — خوں نابہ کشی مدام کی ہے ہم نے
یہ مہلت کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر — مر مر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

ہیں گو کہ سبھی تمہاری پیاری باتیں — پر جی سے نہ جائیں گی تمہاری باتیں
آنکھیں ہیں ادھر روئے سخن اور طرف — یاروں کی نظر میں ہیں یہ ساری باتیں

ایسا نہ ہوا کہ ہم نے شادی کی ہو — یا سیر بہار و باغ و وادی کی ہو

پژمردہ کلی کے رنگ باس گلشن میں | غالب ہے یہی کہ نامرادی کی ہو

اتنے بھی نہ ہم خراب ہوتے رہتے | کاہے کو غم و الم سے روتے رہتے
سب خواب عدم سے چونکے کے ہیں وبال | بہتر تھا یہی کہ وہیں سوتے رہتے

ہر روز نیا ایک تماشا دیکھا | ہر کوچے میں سو جوانِ رعنا دیکھا
دلی تھی طلسمات کہ ہر جاگہ میر | ان آنکھوں سے ہم نے آہ کیا کیا دیکھا

تا چند تلف میر حیا سے ہوگا | شائستۂ صد ستم وفا سے ہوگا
کر ترکِ ملاقاتِ بتاں کعبے چل | ان سے ہوگا سواب خدا سے ہوگا

جس وقت شروع یہ حکایت ہوگی | رنجیدگی یک دگر نہایت ہوگی
احوال وفا کا اپنے ہرگز مجھ سے | مت پوچھ کہ کہنے میں شکایت ہوگی

پھر عشق میں میر پاؤں دھوتا ہے گا | جی اور منغّض اپنا کرتا ہے گا
سب مل کے چلو بلا سے سمجھا آویں | افسوس کہ وہ جوان مرتا ہے گا

چپکے رہنا نہ میر دل میں ٹھانو | بولو چالو کہا ہمارا مانو
اک حرف نہ کہہ سکوگے وقتِ رفتن | چلنے کو زبان کے غنیمت جانو

کوچے میں ترے آن کے اڑ بھی بیٹھے | بے ہیچ ہر اک بات پہ لڑ بھی بیٹھے
حاصل کہ ہمارے تیرے ہرگز نہ بنی | سو سو طرحوں سے ہم بگڑ بھی بیٹھے

رنجش کی کوئی اُس کی روایت نہ سُنی | بے صرفہ کسو وقت حکایت نہ سُنی
تھا میر عجب فقیر صابر شاکر | ہم نے اُس سے کبھو شکایت نہ سُنی

دلّی میں بہت سخت کی اب کی گزران   دل کو کر سنگ
غیرت نہ رہی عاقبت کا نہ نشان   کھینچا یہ تنگ
یاروں میں نہ تھا کوئی مروّت جو کرے   اُجڑے تھے گھر
تا حدِ نظر صاف پڑے تھے میدان   عرصہ تھا تنگ

ہُک میرؔ زمانے سے سنکر قال مقال   بس اب چُپ رہ
ہرچند خموشی ہے سخن گو کو وبال   ایذا ہی سہہ
ایسا نہیں یہ قصّہ کہ ہو شوق افزا   جو ہو آخر
اُٹھ سوئیے ہو چکا ہے پچھلوں کا حال   آگے مت کہہ

واسوخت

طرز اے رشکِ چمن اب تری کچھ تازی ہے　　ساتھ غیروں کے مرے حق میں سخن سازی ہے
داغ رکھنے کو مرے اُن ہی سے گل بازی ہے　　ہم دمی اُن سے اُنھیں سے تجھے ہم آوازی ہے
گوشش کر میرے بھی شکوے کی طرف گل کے رنگ
رُکتے رُکتے روشِ غنچہ ہوا ہوں دل تنگ

ایک مدّت ہوئی بدنامی و رسوائی ہے　　بے کسی بے دلی درویشی و تنہائی ہے
صبح جب دی ہے دُعا گالی تری کھائی ہے　　ابتداے مری ذلّت تجھے خوش آئی ہے
خلق کیا کیا تری بے طوریوں سے کہتی نہیں
میں بھی ناچار ہوں اب مُنہ میں زباں رہتی نہیں

میں جو صحبت میں ہوں بیٹھا تو رُکے سے تو ہو　　آنکھیں ایدھر سے جو موندے ہو سو کم کھولو ہو
نام لیتے ہو کراہت سے مرا جو لو ہو　　لگ چلے غیر تو تابع اسی کے ہو لو ہو
روے حرف اُس کی طرف چشمِ حمایت اُودھر
ابرو اُودھر کو جھکے لُطف و عنایت اُودھر

پیار تجھ کو نہ کیا کرتے اگر جانتے ہم　　کاش کہ تیری روش پہلے ہی پہچانتے ہم
جھوٹے جھوٹے ترے وعدے نہ کبھو مانتے ہم　　جی میں اب ٹھانی ہے جو کچھ سو تبھی ٹھانتے ہم
اس قدر تجھ سے نہ لگ چلتے نہ آتے اس راہ
تو پری ہوتا تو کرتے نہ تری اور نگاہ

ترک اخلاص کیا سب سے تجھے پیار کیا　　رحم دل پر نہ کیا جان کو آزار کیا
چاہ سے اپنی عبث تجھ کو خبردار کیا　　کیا کیا ہم نے کہ اس معنی کا اظہار کیا
جو کہ الفاظ نہ شایاں تھے سو تو کہنے لگا
وجہ بے وجہ تو رُو پوش ہی اب رہنے لگا

اور مہ پارہ بھی اس شہر میں مشہور ہے اب　　اُس کی محبوبی و خوبی ہی کا مذکور ہے اب

دیکھنا کچھ ہو اسی کا مجھے منظور ہے اب   صرف اُس پر کروں گا اپنا جو مقدور ہے اب

اُس کی ضد سے تری شام و سحر جاؤں گا

گھر سے جس دم اٹھوں گا اُسکے ہی گھر جاؤں گا

وہ بھی سُن شورِ وفا مجھ سے ملا چاہے ہے   مختلط لطف و عنایت سے ہوا چاہے ہے

کوئی دن راتوں کو مجھ پاس رہا چاہے ہے   کام دل لوں ہوں اُسی سے جو خدا چاہے ہے

باؤ کا رُخ تجھے بتلاؤں دم اُس مہ کا بھروں ۲۰

خط تری بندگی کا کاغذِ باد اُس کا کروں

فنِ معشوقی میں تیار کروں گا اس کو   شانہ و آئینہ سے یار کروں گا اُس کو

حُسن سے اُس کے خبردار کروں گا اُس کو   ضد سے میں تیری بہت پیار کروں گا اُس کو

فرشِ رہ دیدۂ نمناک کروں گا واں کے

پلکوں سے خار و خسک پاک کروں گا واں کے

ہوگیا مجھ سے جو مانوس تو مرزا ہوگا   پوششِ تنگ کا مصروف مہیا ہوگا

گھیر جامے کا نہ سو گز سے کم اُس کا ہوگا   سیتے بند وں کا بر و دوش پہ لچھا ہوگا

چلتے دامن کے تئیں لگتی رہے گی ٹھوکر

ہوگا ہنگامہ اُدھر نکلے گا جیدھر ہوکر

کس و ناکس اسی مہ پارے کا مفتوں ہوگا   ایسی سج سے تو اُسے دیکھ کے محزوں ہوگا

رشک سے اُس کے ترا حال دگرگوں ہوگا   دلِ نازک ترا دھڑکے گا جگر خوں ہوگا

شرم سے ہوگا نہ اک آنکھ اُٹھانا مُشکل

بلکہ ہو جاویگا اس کوچے میں آنا مُشکل

اب بھی گر سمجھے تو مجھ کو ہے وہی تجھ سے پیار   چھیڑ کا ننگ نہیں تیری نہ گالی کا ہے عار ۲۱

وہی مخلص ہوں قدیمی وہی میں تیرا یار   بندگی کیش و وفا شیوہ و اخلاص شعار

چوٹ مجھ کو بھی تو غیروں کی مُلاقات کی ہے

چھوڑ دے یہ تو تو پھر آزردگی کس بات کی ہے

بس ہوس کیشوں سے مل مل کے تو بدنام ہوا   بس کہ راتوں کو رہا شہرۂ ایام ہوا

کاسہ لیسوں کے گھے مرتکبِ جام ہوا   شوخ و شلتاقی و بدوضع و مے آشام ہوا

طور پر میرے معیشت کوئی دن اچھی ہے
ایسے بدکار سے صحبت کوئی دن اچھی ہے

آ اگر غیر کے ملنے کی قسم کھاتا ہے — میرؔ بھی حرفِ درشتانہ سے شرماتا ہے
ذوق ویسا ہی ہو اس کا تو اُسے بھاتا ہے — دل کی وا سوز سے مُنہ پر یہ سخن لاتا ہے
ورنہ مشتاق ہے سوجی سے جگر خستہ ترا
کُشتۂ دمُردہ ترا رفتۂ و دل بستہ ترا

دیگر

یادِ ایام کہ خوبی سے خبر تجھ کو نہ تھی — سُرمۂ و آئینہ کی اور نظر تجھ کو نہ تھی
فکرِ آراستگیٔ شام و سحر تجھ کو نہ تھی — زُلفِ آشفتہ کی سُدھ دو دو پہر تجھ کو نہ تھی
شانہ تھا نا بلدِ کوچۂ گیسو تیرا
آئینہ کاہے کو تھا حیرتیِ رُو تیرا

آگہی حُسن سے اپنے تجھے زنہار نہ تھی — اپنی مستی سے تری آنکھ خبردار نہ تھی
پاؤں بے ڈول نہ پڑتا تھا یہ رفتار نہ تھی — ہر دم اِس طور کمر میں ترے تلوار نہ تھی
خون یوں کاہے کو کوچے میں ترے ہوتے تھے
دل زدے کب تری دیواروں تلے روتے تھے

بند جامے کا جو وا ہوتا تھا وا رہتا تھا — بے تکلف مرے گھر رات کو آ رہتا تھا
تھوڑی رنجش میں گلے ہی سے لگا رہتا تھا — ٹک جُدا رہتے تو دیر آنکھ ملا رہتا تھا
اس قدر قدر نہ تھی اپنی تری آنکھوں میں
لعبِ بازی میں بھی رہتا تھا مری آنکھوں میں

تنگ پوشی سے نہ محظوظ تمہیں پاتے تھے — تنگ جامے جو سیئے جاتے تو گھبراتے تھے
مسکی چولی سے نہ تم در پہ کبھو آتے تھے — لپٹے دامن سے اُلٹ گھر ہی میں پھر جاتے تھے
یا تو اب کہنی پھٹی مونڈھے چُپے رہتے ہیں
باہر اندر ہو کہیں بند کسے رہتے ہیں

یا تو ہم ہی تھے کہ اب ہم سے نہیں کچھ یاری — مفت برباد گئی عزت و حرمت ساری
بارِ خاطر ہے اب ہم کو بھی ہے بے زاری — یعنی اس شہر سے اٹھ جانے کی ہے تیاری
رتبۂ غیر نہیں آنکھوں سے دیکھا جاتا
طاقت اب یہ دلِ بیتاب نہیں ٹک لاتا

کوئی نادیدہ مخبب سادہ لگالیں گے ہم — سادہ نامرتکب بادہ لگالیں گے ہم
بوس آغوش کا آمادہ لگالیں گے ہم — بندِ خود رائی سے آزادہ لگالیں گے ہم
اُس کو آغوشِ تمنا میں اب اپنی لیں گے
اُس سے دادِ دلِ ناکام سب اپنی لیں گے

اُس کی کھینچیں گے علی الرغم ترے مرزائی — اُس کو سکھلائیں گے طرز و روشِ رعنائی
مجلسوں میں اُسے لا دیں گے بصد زیبائی — صحبت اے دشمنِ جاں اُس سے اگر بر آئی
تو تجھے دیکھیو کس طور کڑھاتے ہیں ہم
چھیڑیں کیا رکھتے ہیں کس ڈھب سے ستاتے ہیں ہم

زندگانی ہو تجھے ہاتھ سے اُس کے دشوار — کوئی دن تو بھی پھرے جان سے اپنی بیزار
پہنچیں ہر آن میں اُس سے تجھے سو سو آزار — طنز و تعریض کنائے کی رہے اک بوچھار
جا کے ٹک سامنے اُس کے تو بہت تر آوے
عرقِ شرم میں ڈوبا ہوا سب گھر آوے

دلِ واسوختہ کو اپنے لئے جاتے ہیں — غصے سے خونِ جگر اپنا پیے جاتے ہیں
اپنی جا غیروں کو ناچار دیئے جاتے ہیں — اب کے یوں جاتے نہیں عہد کئے جاتے ہیں
آوے گا تو بھی منانے کو نہ آویں گے ہم
جان سے جاویں گے پیماں سے نہ جاوینگے ہم

میر اعراض بھی لوگوں نے کیا ہو آگے — دل کے واسوز سے لوہو بھی پیا ہے آگے
خلقِ عالم سے کنارہ بھی کیا ہے آگے — عزت و وقر بھی برباد دیا ہے آگے
پر کنھوں نے نہیں اس ڈھب سے زباں بازی کی
یہ بھی ظالم ہے کوئی طرز سخن سازی کی

دیگر

ایک دن وے تھے کہ تم کو نہ قریب آتے تھے — ادنی سوئی بھی مرے آگے اٹھا جاتے تھے
مدعی کاہے کو مجلس میں جگہ پاتے تھے — چھوتے تھے پاؤں تو پھر سر میں وہیں کھاتے تھے
یا تو اب شام و سحر پاس لگے رہتے ہیں
کرکے سرگوشی جو کچھ چاہتے ہیں کہتے ہیں

تم کو بھی آٹھ پہر حرف و حکایت اُن سے — باز و جا لو ہو اُنہیں چشم عنایت اُن سے
شکر اُن کا ہے جو ہے بھی تو شکایت اُن سے — ہر طرح کوئی چلی جا ہے رعایت اُن سے
ہاتھ کاندھے پہ کبھو رکھ کے کھڑے ہوتے ہو
کبھی منت کرد ہو ٹک جو کڑے ہوتے ہو

وے جو آزردہ ہوں ٹک بھی تو منانے جاؤ — مکث کر بیٹھ رہیں گھر تو بلانے جاؤ
الغرض کرکے اُدھر سو سو بہانے جاؤ — اُن کو دریا پہ جو سُن پاؤ نہانے جاؤ
ہم اگر خاک ملیں منہ پہ نہ بولو جا لو
ہم اگر لوہو لگیں رونے تو ہنس کر ٹالو

لیسے او باشوں کی تقلید میں کب تھی تگ و دو — تنگ چولی کے نہ رہتا تھا کبھی اتنا گرو
پاٹ دامن کے نہ ہوتے تھے ترے ساڑھے سو — اب تو ہے قہر جو ڈھیلی ہو کمر ایک بھی جو
درزی کا بناہی کرے ٹھیک جبتک سی لے
کاڑھے ناکے ہیں سوئی کے کرے ٹانکے ڈھیلے

بال واں سنوریں ترے یاں مجھے جی ہے جنجال — میں ملوں خاک میں منظور تجھے اپنی چال
ہو جگر داغ مرا منہ پہ بنیں تیرے خال — مہندی پاؤں سے لگے گل کے رہو نہیں پامال
سرمہ آنکھوں میں جگہ تیری کرے شام و سحر
مطلق احوال مرا تجھ کو نہ ہو مد نظر

تھیں قریب اگلی نگاہیں وہ تمہاری بارے — دامن و جیب پھٹے یاد ہیں اُن کی سارے
شوق کے ہاتھ شب و روز سروں پہ مارے — چھاتیاں کوٹتے ہی کوٹتے آخر ہارے

رو کے اتنا کہ جگر میں نہ رہی لوہو کی بوند
اب سماں وہ ہے کہ دیکھو گے میاں آنکھیں موند

تنگ اب حد سے زیادہ ہوئے ہیں یاد رہے
بس بہت ہی ترے اطوار سے ناشاد رہے

کب تک اس طور کوئی لے ستم ایجاد رہے
دن کو بے داد رہے رات کو فریاد رہے

ہے قریب اب کہ ترے کوچے سے اٹھ کر جاویں
بے حمیت ہی ہمیں کہیو اگر پھر آویں

ایک طرف مر رہیں گے جاکے بھلا کیا کریئے
ہر زماں ہر کسو سے حال کہا کیا کریئے

سر گریباں میں یوں ڈال رہا کیا کریئے
میرؔ کے طور ترا شکوہ لکھا کیا کریئے

جی نہ نکلا اگر اس میں تو کڑھا کریئے گا
مرثیہ اپنا کہیں بیٹھے کہا کریئے گا

ہجویات

ہجو اکول

اک ہے پُر خور آشنا بے پیر — سینہ سوراخ جس سے ہے کفگیر
صد منی دیگ ہے شکم اُس کا — نفس اژدہا ہے دم اُس کا
آنت شیطان کی ہے اُس کی آنت — دانت اُس کا ہے ہاتھی کا سا دانت
شکل مت پوچھ کھانے کا ہے بلی — مُنہ ہے چھیپوں سے جیسے روٹی جلی
گال کلّے سے بھر توے سے سیاہ — کاسۂ سر ہے جیسے اوندھا کڑاہ
توند کالی جو کھول جائے لیٹ — آہنیں ہے تنور اُس کا پیٹ
راہ مطبخ میں پاوے ہے جو کبھی — چاٹ جاتا ہے دیگچوں تک بھی
کھینچے باورچیوں کے کیا کیا ناز — کتری گئی اُس کے چوتڑوں پر پیاز
کھانا نکلے پر آوے ہے کیسے — چیل لوٹے ہے گوشت پر جیسے
خام طمعی سے اک کرے ہے آہ — دیکھ کر شب کو نانِ ہالۂ ماہ
کھانے پر جب وہ جی چلاتا ہے — لاٹھی پاٹی بھی کھائے جاتا ہے
نہیں پہنچے جو کھانا کھانے لگ — ہڈیوں پر لڑے ہے جیسے سگ
بھوک کا باؤلا جو آتا ہے — لوگوں کو کاٹ کاٹ کھاتا ہے
ٹھڈیوں کو نگہ سے کھا جاوے — چنے لوہے کے بھی چبا جاوے
دہر کا جلنا آگ سے مانوں — بھوک اُس کی جلے تو میں جانوں
کیا کیا جینے کی کہیئے چکھتا ہے — لیک پیٹ اُس کو مارے رکھتا ہے
جب مریگا وہ بھوک کا روگی — رُوح توشے کی روٹی ہی ہوگی
کھانے کی بُو جو ناک میں پیٹھے — مر گیا ہووے تو بھی اُٹھ بیٹھے
عقل باور اگرچہ کرتی نہیں — وہ مرے بھوک اُس کی مرتی نہیں

بھوکے اُس کا جو جی نکل جاوے — گور میں بھی کفن نکل جاوے

در بیانِ مُرغ بازاں

دلّی سے ہم جو لکھنؤ آئے — گرم پرخاش مُرغ یاں پائے
آدمی جو بڑے کہاتے ہیں — مُرغ مارے بغل میں آتے ہیں
جیسے منگل کو بالی کی ہے دھوم — گلیوں میں روزِ حشر کا ہے ہجوم
مُرغ بازوں کو ہے قیامت جوش — جس کو دیکھو تو مُرغ درآغوش
مُرغ لڑتے ہیں ایک دو لاتیں — سینکڑوں ان سفیہوں کی باتیں
اُن نے پر جھاڑے یہ پھڑکنے لگے — اُن نے کی لوک یہ کڑکنے لگے
وہ جو سیدھا ہوا تو یہ ہیں کج — ساکت اُس کے بدلنے ہیں سج دھج
مُرغ کی ایک پرفشانی ہے — ان کی صدرنگ بدزبانی ہے
ایک بولے کہ کاری آئی چوٹ — ایک کہتا ہے بس گیا اب لوٹ
ٹھمکتے ہیں آپ کو تراتے ہیں — لاتیں گویا کہ یہی کھاتے ہیں
ایک کے منہ میں مُرغ کی منقار — ایک کے لب پہ ناسزا گفتار
منہ پہ آیا جو کچھ وہ بکنے لگے — تیکھی نظروں سے سب کو تکنے لگے
طرفہ ہنگامہ طرفہ صحبت ہے — بعد نصف النہار رخصت ہے
کو نیچے سر بغل میں مارے مُرغ — لے گئے جیتے ہارے سارے مُرغ

ہجوِ لشکر

جس کسو کو خُدا کرے گمراہ — آوے لشکر میں رکھ اُمیدِ رفاہ
یاں نہ کوئی وزیر ہے نے شاہ — جس کو دیکھو سو ہے بحالِ تباہ
طرفہ مردم ہوئے اکھٹے آہ
فوج میں جسکو دیکھو سو ہے اُداس — بھوک سے عقل گم نہیں ہیں حواس

بیچ کھایا ہے سب نے ساز و لباس　　چیتھڑوں بن نہیں کسو کے پاس

یعنی حاضر یراق ہینگے سپاہ

مفلسی سے رہا ہے کس میں حال　　خورش و خواب ہینگے خواب و خیال

چار دن عمر کے ہوتے ہیں وبال　　زندگی اپنے طور پر ہے محال

مرگ ملتی نہیں ہے خاطر خواہ

ہجوِ خانۂ خود

کیا لکھوں میر اپنے گھر کا حال　　اِس خرابے میں میں ہوا پامال

گھر کہ تاریک و تیرہ زنداں ہے　　سخت دل تنگ یوسف جاں ہے

کوچۂ موج سے بھی آنگن تنگ　　کوٹھری کے حباب کے سے ڈھنگ

چار دیواری سو جگہ سے خم　　تر تنک ہو تو سوکھتے ہیں ہم

لونی لگ لگ کے جھڑتی ہے مانی　　آہ کیا عمر بے مزہ کاٹی

کیا کہے مینہ سقف چھلنی تمام　　چھت سے آنکھیں لگی رہے ہیں مدام

اس چکش کا علاج کیا کریئے　　راکھ سے کب تلک گڑھے بھریئے

جا نہیں بیٹھنے کو مینہ کے بیچ　　ہے چکش سے تمام ایواں کیچ

آنکھیں بھر لا کے یہ کہیں ہیں سب　　کیونکہ پردار ہے گا یا رب اب

جھاڑ باندھا ہے مینہ نے دن رات　　گھر کی دیواریں ہینگی جیسے پات

باؤ میں کانپتی ہیں جو تھر تھر　　اُن پہ ردّا رکھے کوئی کیونکر

کیچ لے لے کے جوں توں چھوپا ہے　　چھوپا کا ہے کو بلکہ تھوپا ہے

نس کو پھر پر چھتی بھی ہئی نہیں　　ٹوٹا اک بوریا سا ڈالو کہیں

ڈھانکو دیوار یا اُٹھا رکو　　یا ہمارے لئے بچھا رکو

ایک حجرہ جو گھر میں ہے واثق　　سو شکستہ تر از دل عاشق

کہیں سوراخ ہے کہیں ہے چاک　　کہیں جھڑ جھڑ کے ڈھیر سی ہے خاک

کہیں گھوسوں نے کھود ڈالا ہے　　کہیں چوہے نے سر نکالا ہے

کہیں گھونس ہے کسو چھچھوندر کا   شور ہر کونے میں ہے جھینگر کا
کہیں مکڑی کے لٹکے ہیں جالے   کہیں جھینگر کے بے مزہ نالے
کونے ٹوٹے ہیں طاق پھوٹے ہیں   پتھر اپنی جگہ سے چھوٹے ہیں
اینٹ چونا کہیں سے گرتا ہے   جی اسی حجرے ہی میں پھرتا ہے
رکھ کے دیوار ادھر ادھر سے   لا کے یارب بناؤں کس گھر سے
چار پائی جب اس میں بچھوائی   پہلے چلپاسہ ہی نظر آئی
سام ابرص کہ ہے دوائے خراج   ہر جگہ یاں سے ہے نمایاں آج
پیکر اپنی خدا نے رکھی ہے   ڈانس ایک ایک جیسے مکھی ہے
آگے اس حجرے کے ہے اک ایوان   وہی اس ننگ خلق کا ہے مکان
کڑی تختے سبھی دھوئیں سے سیاہ   اس کی چھت کی طرف ہمیشہ نگاہ
کبھی کوئی سنپولیا ہے پھرے   کبھی چھت سے ہزار پائے گرے
کوئی تختہ یہاں سے ٹوٹا ہے   کوئی واسا کہیں سے چھوٹا ہے
دیکھے مرنا ہمیشہ مد نظر   گھر کہاں صاف موت ہی کا گھر
مٹی تو وہ جو ڈالی چھت پر ہم   تھے جو شہتیر ہوں کماں ہیں خم
مضطرب ہو کے جو بچھائی بہت   ہر کڑی نے کڑی اٹھائی بہت
پر سے اس مینہ میں کرختی ہے   تختے تختا ہوئے یہ سختی ہے
ہوئیں اڑواڑیں پھر جو حد سے زیاد   چل ستوں سے مکان دے ہے یاد
اینٹ مٹی کا ڈر کے آگے ڈھیر   گرتی جاتی ہے ہولے ہولے منڈیر
کنگنی دیوار کی نیٹ بے حال   پڑری کا بوجھ بھی سکے نہ سنبھال
طوطا مینا تو ایک بابت ہے   پودنا پھدکے تو قیامت ہے
کیونکہ ساون کٹے گا اب کی بار   تھر تھرا وے جھنبھیری سی دیوار
مٹی اس کی کہیں کہیں بھسکی   جی ڈہا اور چھاتی بھی دھسکی
سان کر خاک لگ گئے دو چار   بارے جلدی درست کی دیوار
اچھے ہونگے کھنڈر بھی اس گھر سے   بر سے ہے اک خرابی گھر در سے
گھر بھی پھر ایسا جیسا ہے مذکور   ہے خرابی سے شہر میں مشہور

جس سے پوچھو اُسے بتادے شتاب — ساری بستی میں ہے یہی تو خراب
ایک چھپّر ہے شہرہ دلّی کا — جیسے روضہ ہو شیخ چلّی کا
بانس کی جا دیئے تھے سرکنڈے — سو دے مینہوں میں سب ہوئے ٹھنڈے
گل کے بندھن ہوئے ہیں ڈھیلے سب — پا کھے رہنے لگے ہیں گیلے سب
مینہ میں کیوں نہ بھیگتے یکسر — پھونس تو بھی نہیں ہے چھپّر پر
مٹی ہوکر گرا ہے سب والا — وہ رہے ہاں جو ہووے ڈھب والا
واں ہے ٹپکا تو یاں سرک بیٹھا — یاں جو بھیگا تو واں تنک بیٹھا
حال کس کو ہے اولتی کا یاد — گمری اس جھگڑے میں گئی برباد
کہیں صحنک رکھوں کہیں پیالا — کہیں ہانڈی کے ٹھیکرے لالا
ٹپکے دو چار جا تو بند کردوں — پیچ کوئی لڑاؤں فند کردوں
بسکہ بدرنگ ٹپکے ہے پانی — کپڑے رہتے ہیں میرے افشانی
کوئی جانے کہ ہولی کھیلا ہوں — کوئی سمجھے ہے یہ کہ خیلا ہوں
مجھ سے کیا واقعی ہو آچارا — آسماں جو پھٹے تو کیا چارا
بان جھینگر تمام چاٹ گئے — بھیگ کر بانس پھاٹ پھاٹ گئے
تنکے جاندار ہیں جو بیش و کم — تن پہ چڑیوں کو جنگ ہے باہم
ایک کھینچے ہے چونچ سے کر زور — ایک مگری پہ کر رہی ہے شور
کیا کہوں جو جفا چکش سے سہی — چار پائی ہمیشہ سر پہ رہی
بوریا پھیل کر بچھا نہ کبھو — کونے ہی میں کھڑا رہا یکسو
ڈیوڑھی کی ہے یہ خوبی در ایسا — چھپّر اس چونچلے کا گھر ایسا
جنس اعلیٰ کوئی کھٹولا کھاٹ — پائے پٹی رہے ہیں جن کے پھاٹ
کھٹملوں سے سیاہ ہے سو بھی — چین پڑتا نہیں ہے شب کو بھی
شب بچھونا جو میں بچھاتا ہوں — سر پہ روزِ سیاہ لاتا ہوں
کیڑا ایک ایک پھر مکوڑا ہے — سانجھ سے کھانے ہی کو دوڑا ہے
ایک چٹکی میں ایک چھنگلی پر — ایک انگوٹھا دکھادے انگلی پر
گرچہ بہتوں کو میں مسل مارا — پر مجھے کھٹملوں نے مل مارا

ملتے راتوں کو گھس گئیں پوریں   ناخنوں کی ہیں لال سب کوریں
ہاتھ ٹیکنے پہ گہ بچھونے پر   کبھو چادر کے کونے کونے پر
سلسلا یا جو پائنتی کی اور   وہیں مسلا کر ایڑیوں کا زور
تو شک ان رگڑوں ہی میں سب پھاٹی   ایڑیاں یوں رگڑتے ہی کاٹی
جھاڑتے جھاڑتے گیا سب بان   ساری کھاٹوں کی چولیں نکلی ندان
نہ کھٹولا نہ کھاٹ سونے کو   پائے پٹی لگائے کونے کو
جب نہ تب پنڈے پر لئے پائے   سیتلا کے سے دانے مُرجھائے
سو یہ تنہا نہ بان میں کھٹمل   آنکھ مُنہ ناک کان میں کھٹمل
کہیں کیچڑ کا کہ جی سے تاب گئی   آنکھ سے تا بگاہ خواب گئی
ایک ہتیلی پہ ایک کھائی میں   سینکڑوں ایک چارپائی میں
پر جو بارش ہوئی تو آخر کار   اس میں سی سالہ وہ گری دیوار
آہ کھینچی خرابی کیا کیا نہ   تھے جو ہمسائے وے ہیں ہم خانہ
ایسے ہوتے ہیں گھر میں تو بیٹھے   جیسے رستے میں کوئی ہو بیٹھے
دو طرف سے تھا کتوں کا رستا   کاش جنگل میں جا کے میں بستا
ہو گھڑی دو گھڑی تو دھتکاروں   ایک دو کتے ہوں تو میں ماروں
چار جاتے ہیں چار آتے ہیں   چار عف عف سے مغز کھاتے ہیں
کس سے کہتا پھروں یہ صحبت خر   کتوں کا سا کہاں سے لاؤں مغز
کوٹھا بوجھل ہوا تھا بیٹھ گیا   پانی جُز جُز میں اُس کے بیٹھ گیا
کڑی تختہ ہر ایک چھوٹ پڑا   ناگہاں آسمان ٹوٹ پڑا
میں تو حیران کار تھا اپنا   کوئی اُس دم نہ یار تھا اپنا
اینٹ پتھر تھے مٹی تھی یکسر   خاک میں مل گیا تھا گھر کا گھر
چرخ کی کجروی نے پیسا تھا   پر خُدا میرا مجھ سے سیدھا تھا
کتنے اک لوگ اس طرف دھائے   یا ملک آسمان سے آئے
مٹی لے لے گئے وہ ہاتھوں میں   کام نے شکل پکڑی باتوں میں
صورت اُس لڑکے کی نظر آئی   ہم جو مُردے تھے جان سی پائی

آنکھ کھولی اِدھر اُدھر دیکھا
اس خرابی کو بھر نظر دیکھا

قدرتِ حق دکھائی دی آکر
یعنی نکلا دُرست وہ گوہر

داشت کی کوٹھریوں میں لا رکھا
گھر کا غم طاق پر اُٹھا رکھا

مومیائی کھلائی کچھ ہلدی
فرصت اُس کو خدا نے دی جلدی

غم ہوا اس کے دوستداروں کو
پہ بندھا یہ خیال یاروں کو

کہ مری بود و باش یاں نہ رہے
گو تصرف میں یہ مکاں نہ رہے

شہر میں چاہا ہم نہ پہونچی کہیں
چار ناچار پھر رہا میں وہیں

اب وہی گھر ہے بے سر و سایہ
اور میں ہوں وہی فرومایہ

دن کو ہے دھوپ رات کو ہے اوس
خوابِ راحت ہے یاں سے سو کوس

قصہ کوتہ دن اپنے کھوتا ہوں
رات کے وقت گھر میں ہوتا ہوں

نہ اثر بام کا نہ کچھ در کا
گھر ہے کاہے کا نام ہے گھر کا

مثنوی ہجو خانۂ خود کہ بہ سبب شدت باراں خراب شدہ بود

جسمِ خاکی میں جس طرح جاں ہے
اس طرح خانہ ہم پہ زنداں ہے

ظلمتیں اُس کی سب پہ روشن ہیں
زندہ در گور ہم کئی تن ہیں

اب جو آیا ہے موسمِ برسات
دن کو ہے اپنے ہاں اندھیری رات

صحن میں آب نیزہ بالا ہے
کوچۂ موج ہے کہ نالا ہے

مینھ میں گھر کے پانچ چھ چھپّر
ہم غریبوں کے ہوتے ہیں سر پر

پر تلک تنکے تھے کچھ ایک نئے
سو دیے چڑیوں کے گھونسلوں کو گئے

دل ہے کچھ مکڑیوں کا احساں مند
کہ جنھوں نے کئے ہیں جھانکے بند

پھوس کچھ ہے کہیں سو آٹا ہے
بانس کو جھینگروں نے چاٹا ہے

کیا کہوں آہ گھر ہے کہنے کو
باندھتا ہوں مچان رہنے کو

ٹھیکے دینے کو جا اڑے ہیں ہم
سر پہ ٹھٹر لئے کھڑے ہیں ہم

ٹٹیاں تھیں جو آگے چھپر کے
بہتی پھرتی ہیں صحن میں گھر کے

تا گلے سب کھڑے میں پانی ہیں
خاک ہے ایسی زندگانی ہیں

اب تو اپنا بھی حال ہے بدتر
سر پہ گٹھری ہو تس پہ ہے چھپر

مینھ یکبارگی جو ٹوٹ پڑا
کڑی تختہ ہر ایک چھوٹ پڑا

داسے بابان کار ٹوٹ گئے
طاقچے بھر بہے تھے پھوٹ گئے

دل دھنسا گھر کہ بار خاطر تھا
آہ کس کا غبار خاطر تھا

آ کھڑی دہلیز سب منڈیر گری
ہر پانی کی جھاڑ دیتی پھری

سارے بنیاد پانی نے کاٹی
اینٹ نے گھر کو کر دیا ماٹی

جب اجارے پہ آکے چھت ٹھہری
ہم سبھوں میں یہ مصلحت ٹھہری

آؤ اب چھوڑ کے یہ گھر نکلیں
کسو ٹٹی پہ بیٹھ کر نکلیں

دیکھئے مرنے سے ڈوب مرنا خوب
ہے کنارا یہاں سے کرنا خوب

سنتے ہی ہر اک کے جی میں در آیا
خاطروں میں یہ حرف ٹھہرایا

گٹھری کپڑوں کی میں اٹھائی تھی
سر پہ بھائی کے چارپائی تھی

بوجھ کپڑوں کا جن نے باندھا تھا
اس کا سارا دگار کاندھا تھا

ساتھ کوئی چراغ لے نکلا
کوئی سر پر اجاغ لے نکلا

چھاج کی کر کے کوئی اوٹ چلا
مینھ کے مارے کوئی لوٹ چلا

سنہ پہ چھلنے کو ایک نے روکا
ایک نے سر کی کا کیا گھویا

ایک نے چھینکے حال حال لئے
پائے پٹی گلے میں ڈال لئے

ایک نے بوریا لپیٹ لیا
اور پایا جو کچھ سمیٹ لیا

اپنا اسباب گھر سے ہم لے کر
الگنی سب کے ہاتھ میں دے کر

صف کی صف نکلی اس خرابی سے
تا کہ پہونچیں کہیں شتابی سے

میر جی اس طرح سے آتے ہیں
جیسے کنجر کہیں کو جاتے ہیں

جس نے اس وقت آنکھ کو کھولا
ہنس کے بے اختیار وہ بولا

سن کے اس بات کو نرائے ہم
بارے اک بھائی کے گھر آئے ہم

تب سے رہنے کو اب تلک ہیں خراب
نہیں ملتا ہے گھر بقدر حباب

جس میں خوش یکنفس معاش کریں
طور پر اپنے بود و باش کریں

مثنوی در ہجو نااہل

سُنیو اے اہلِ سخن بعد از سلام
چھیڑتا ہے مجھ کو اک تخمِ حرام

کام مجھ کو کچھ نہیں ہے اور سے
بلکہ اس بھی طرز سے اس طور سے

شاعری کو میری ہو گے جانتے
تم چنانچہ سب مجھے ہو مانتے

میں ہمیشہ سے رہا ہوں باوقار
کن دنوں تھا ہجو کا کرنا شعار

تھا تحمل مجھکو میں درویش تھا
دردمند و عاشق و دلریش تھا

پر کروں کیا لاعلاجی سی ہے اب
غصّے کے مارے چڑھی ہے مجھکو تپ

ایسے کتنے ہیں جو اب شاعر بنے
مدّتوں یہ لونڈے آئے مجھ کنے

ایک باتوں سے مری آدم ہوا
اک نظر سے شہرۂ عالم ہوا

ایک نے دیواں کی میرے نقل لی
اس دوانے کی کنھوں نے عقل لی

ایک میرے طرز پر کہنے لگا
دوسرا پیرو مرا رہنے لگا

سارے عالم میں ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

شہر میں آیا میں بعد از بست سال
گم تھا یاں سر رشتۂ قال و مقال

کتنے اک نو مشق تھے گرمِ سخن
سو بچارے آپ ہی ناآگاہ فن

مدّعی میرا ہوا یہ بے ہنر
مردۂ صد سالہ بے تور تر

کاسہ لیس مایۂ خبث و حسود
قلیۂ دہ روزہ سے بھی بدنمود

باپ اُسکا سخت نادان نادرست
کوڑی کی سی گندی بلّی تاق و سست

مستی اُسکی ساری اب جھڑ جائیگی
دُھوم ساری گلیوں میں پڑ جائیگی

ہاتھی کی ٹکر کو ہاتھی ہی اُٹھائے
چیونٹی کا کیا جگر جو مُنہ پہ آئے

ایک دو تھکے ہیں کہاں وہ کامنی
پودنے کی سی ہے اُس کی ضامنی

یہ قبولِ خاطرِ لُطفِ سخن
دے ہے کب سبکو خدائے ذوالمنن

ایک دو ہی ہوتے ہیں خوش طرز و طور
اب چنانچہ میر و مرزا کا ہے دور

میں نے اُلٹی اجگروں کی دم میں صف
ادھ موئی سی چھپکلی کیا ہو طرف

رکھتی ہے میری شرافت اشتہار
گو یہ ناسید کہے ہے کیا چمار

بیت کہنا چاہتا ہے سو ہنر	شاعری سمجھا تھا کیا خالہ کا گھر
نا مبارک ہی نہیں سادہ بھی ہے	الّو ہے اور الّو کی مادہ بھی ہے

مثنوی اژدر نامہ

یہ موذی کئی ناخبردار فن	نئی ناگنیں جن کے ٹیکوں پہ پھن
نہیں جانتی ہو تو ہیں مار سیاہ	زمانہ ہے آتش کا میری نگاہ
نفس ہے مرا افعی پیچدار	گیا جس سے خصم قوی من کو مار
جدھر کو نظر دیکھوں لگ جائے آگ	دم دم کشی لب پہ کھیلیں ہیں ناگ
جہاں میں ہوں وہ جا ہے پر شر و شور	عصا سے چلے راہ ڈال مار و مور
مری آنکھ سے زہر ٹپکا کیا	چلا آگے میرے کبھو کب دیا
سن اس ماجرے کو سبھوں نے کہا	کہاں کیچوے یہ کہاں اژدہا
نہ خصمی مری اژدروں سے ہوئی	طرف مجھ سے ہو جونک کیا ادھموئی
اگر شور زاغاں سے ڈر جائیے	تو کیا اجگروں کا رہے اعتبار
نہ کس طور اژدر کو تلوا سا ہو	حریف اس کے سوکھی سی چلپک ہو
کہاں چھپکلی اژدہے سے لڑی	کس اژدر پہ ایسی قیامت پڑی
ہزار اجگر اندوہ سے جائے لٹ	وے ایسے کیڑے مکوڑے ہیں چٹ
جہاں شور اژدر سے ہو دھوم دھام	کوئی کنسلائی سے نکلے ہے کام
بظاہر یہ لائے تو ہیں پر نکال	دلے ہوں گے ان کے جیوں کے وبال
حریفی انہوں سے ہوا اژدر کی کب	وہ کھینچے جو یکدم تو بھنکا ہیں سب
مری قدر کیا ان کے کچھ ہاتھ ہے	جو رتبہ ہے میرا مرے ساتھ ہے
کہاں پہونچیں مجھ تک یہ کیڑے حقیر	گیا سانپ بیٹھا کریں اب لکیر

مخمس در حالِ لشکر

مشکل اپنی ہوئی جو بُود و باش　　آئے لشکر میں ہم برائے تلاش
آن کے دیکھی یاں کی طرفہ معاش　　ہے لبِ ناں پہ سو جگہ پرخاش
نے دمِ آب ہے نہ ہمچہ آش

مرنے کے مرتبے میں ہیں احباب　　جو شناسا ملا سو بے اسباب
تنگدستی سے سب بحالِ خراب　　جسکے ہے پال تو نہیں ہے طناب
جس کے ہے فرش تو نہیں فراش

زندگانی ہوئی ہے سب پہ وبال　　کنجڑے جھینکیں ہیں روتے ہیں بقال
پوچھ مت کچھ سپاہیوں کا حال　　ایک تلوار بیچے ہے اک ڈھال
بادشاہ و وزیر سب قلاش

جیتے والے جو تھے ہوئے ہیں فقیر　　تن سے ظاہر رگیں ہیں جیسے لکیر
ہیں معذّب غرض صغیر و کبیر　　مکھیاں سی گریں ہزاروں فقیر
دیکھیں ٹکڑا اگر برابر ماش

شور مطلق نہیں کسو سر میں　　زور باقی نہ اسپ و اشتر میں
بھوک کا ذکر اقل و اکثر میں　　خانہ جنگی سے امن لشکر میں
نہ کوئی رند نہ کوئی اوباش

لعل خیمہ جو ہے سپہر اساس　　پالیں ہیں رنڈیوں کی اسکے پاس
ہے زنا و شراب بے وسواس　　رعب کر لیجئے یہیں سے قیاس
قصہ کوتہ رئیس ہے عیاش

جتنے یاں ہیں امیر بے دستور　　کبر بخشن سلوک سب مشہور
پہونچنا اُن تلک بہت ہی دُور　　بات کہنے کا واں کسے مقدور

حاصل اُن سے نہ دل کو غیر خراش

چار تجھے ہیں مستعدِ کار — دس تلنگے جو ہوں تو ہے دربار
ہیں وضیع و شریف سارے خوار — لوٹ سے کچھ ہے گرمیِ بازار

سو بھی قسمت سیاہ ہی یا ماش

در پہ عمدوں کے روز و شب شر و شور — صرف یکسر فریب و رشوت خور
بے لئے دیکھیں نے کسو کی اور — مردہ شو پر وہ سب کفن کے چور

رحمتہ اللہ بر او لبس بتاش

یک بہ یک گر کسو کی موت آئی — اُس کے مردے کی پھر ہے رسوائی
کیونکہ پہونچی ہے جنکو امرائی — سب وہ اولادِ حاتم طائی

کون دے کر کفن اٹھاوے لاش

بالضرورت گیا میں جس کے گھر — آدمی کی نہ جنس تھا وہ خر
بات کرنے لگا تو نیچے نظر — بے مروت سفیہ تر نظر

قابلِ صد ہزار شاش و تراش

ہے جنہیں کچھ بھی رویتِ دربار — سو فریبندہ مکری و غدار
کاذب و صفت بر ہے دل آزار — ڈول اُن کا ہے یہ کہ کریئے خوار

کام اُن کا ہے یہ خراش و تراش

جس پہ ٹھہرے ہے آکے سرداری — اُن سے ہم کو تھی چشم دلداری
معرفت اُن کے بعد صد خواری — فرد و دستخط ہوئی جو اکباری

جیسے کھینچے لکیریں کوئی نقاش

اس سے لکھے کا نہیں ٹھکانا کچھ — درہم میں بھی نہیں ہے پانا کچھ
جس پہ دستخط نہ آنے جانا کچھ — بن نہ آیا مجھے بہانا کچھ

غیر اس کے کہ نے اٹھوں بشاش

واں سے اٹھ کر میں یاں میں آیا — سخت تغیر حال میں آیا
بار ہا یہ خیال میں آیا — کہ زیاں شہ کے مال میں آیا

واسطے میرے سو مرا یہ قماش

بخشوں جامہ تک جو ہو قدرت — آٹھوں آنے ہیں خرچ یکساعت
دس روپے دوں گدا کو بے مہلت — منقفی ہووے کب مری ہمت
صاحبان کرم کے تئیں شاباش ۳۳۹

ہو جو ان لوگوں میں گدا کا گزر — سہم رہجائیں سب دیکھیں اُدھر
دیر کے بعد یہ کہیں ہل کر — شاہ جی سے خدا بھوں کی خبر
سو بھی یہ بات ہی پس از کنکاش

یاروں کی جود کا بیاں کیا ہے — وہم میں اُن کے بھی جہاں کیا ہے
آشکارا ہے سب نہاں کیا ہے — دیکھتے ہیں کہیں کہ یاں کیا ہے
ایسی صحبت میں ہم نہ ہوتے کاش

بس قلم اب زباں کو اپنی سنبھال — خوشنما کب ہے ایسی قال و مقال
ہے کڑھب چرخ روسیہ کی چال — مصلحت ہے کہ رہیئے ہو کر لال
فائدہ کیا جو راز کریئے فاش

مخمس دیگر ۳۴۰

دستخطی فرد کا سنو احوال — بیدماغی ہی میں تو دی تھی ڈال
ایک مشفق کو تھا ادھر کا خیال — مہربانی سے اُن نے کھوج نکال
شیخ جی گاڑھے سو عجائب مال

شیخ کو اس بھی سن میں ہیگی ہوس — تنگ پوشی سے چولی جاوے چس
ہوئیگا سن شریف ساٹھ برس — دانت ٹوٹے گیا ہے کلّہ دھنس
دیکھ رنڈی کو بہہ چلے ہے رال

جامے کو خوب سا چُنلاتے ہیں — خال رُخسار پر بنا تے ہیں
مہندی بھی پتلی سی لگاتے ہیں — ناز کرتے قدم اُٹھاتے ہیں
دیکھا کرتے ہیں آرسی میں جمال

دل میں دُھن جو جو عیش و عشرت کی — پوُچھتے ہیں دوائی شہوت کی

باتیں ہیں رنڈیوں کی صحبت کی — دیکھے ہے کوئی کتاب حکمت کی

کرتے ہیں بہمنین استعمال

محو رعنائی کتنے ہیں اللہ — مستی سے کرتے ہیں سوٹے سیاہ

رکھتے ہیں سر پہ اب ہمیشہ کلاہ — شانہ سے کام ہے گہ و بے گاہ

کپڑے نارنجی سر پہ اودی شال

تیر و چرکیں لباس تنگ معاش — ساتھ رکھتے ہیں ایک موئے تراش

قینچی لیتے ہیں گاہ و گہ منقاش — ہر سر مو پہ اس سے ہے پرخاش

لوگ کہتے ہیں شیخ ہیں چنڈال

آشنا میرے بھی پرانے تھے — میں وے اک عمر اک ٹھکانے تھے

یار تھے دوست تھے یگانے تھے — صحبتیں تھیں ہم زمانے تھے

روز و شب ہم کو تھی قال و مقال

اب وے مختار کے ہوئے مختار — ان پہ ٹھہرا ہے سلطنت کا مدار

وہی اس عہد میں ہیں کاربرآر — اس طرف سے مرا ہوا جو گزار

نکلے سن نام بہر استقبال

جب ملاقات درمیاں آئی — دستخطی فرد میں نے دکھلائی

لے کے میری تسلی فرمائی — پھر نفر پاس اپنے رکھوائی

اور لگے کہنے بہر استقلال

فرد نواب کو دکھاؤں گا — حال صاحب کا سب جتاؤں گا

ہے مقدر تو کر ہی لاؤں گا — لے کے دفتر میں آپ جاؤں گا

آگے میرے کسے سخن کی مجال

قدر والا ہماری ہے معلوم — خلق خادم ہے اور تو مخدوم

اس سعادت سے جو ہے محروم — ہے یقینی کہ وہ الاغ ہے شوم

حشر کو ہوگا مرکب دجال

تم نبی فاطمہ ہو ہم ہیں غلام — ہے غلامی تمہاری اپنا کام

تم کو مسجود جانتے ہیں انام — تم سبھوں کے ہو پیشوا و امام

تم سے سب کو نجات کا ہے سوال

۴۳ — بارے رخصت کیا بصد اعزاز — اور کہا تم ہو خلق میں ممتاز
ہے تمنا کہ تم سے ہوں دمساز — دل ہمارا ہو کاش محوِ نیاز
کرے تم پر نثار جان و مال۔

شیخ نے کر سلوک حد سے زیاد — قید اندوہ سے کیا آزاد
دی بھلا روزگار کی بیداد — جان غم کش ہوئی نہایت شاد
کم ہوا کوئی روز سر سے وبال

پھر جو دو دن میں میں گیا ان پاس — شیخ جی نکلے ایک اشراشاس
نے وہ تعظیم و خلق نے وہ پاس — بولے کچھ زیر لب اُداس اُداس
رہ گیا چپ میں دیکھ کر یہ حال

میرے تئیں بیدماغ جو پایا — سر کیا نیچے یعنی شرمایا
جب خجالت سے کچھ نہ بن آیا — تب بہانہ صداع کا لایا
پھر یہ بولا کہ کیوں ہے چہرہ لال

میں کہا وجہ ہے کہا کہیئے — میں کہا جو کہ کب تلک سہیئے
چند پامال چرخ کج رہیئے — جی میں ہے اب لگائیے پہیئے
تا کہ گردوں کی کچھ ہو سیدھی چال

تھی جو تم سے توقع یاری — سو تو آئی ظہور میں ساری
ہوتی جو فرد دستخطی جاری — تو بھی یہ دن جو ایسے ہیں بھاری
کاٹتا یک طرف فقیر مثال

دستخطی فرد کا سنا جب نام — کہنے لاگا کہ اب قریب ہے شام
بیٹھنے کا ہوا ہے وقت تمام — پھر کبھی رو نہ کیجئے گا کلام
اب تو میرے نہیں حواس بحال

تھا جو سختی سے فقر کی ناچار — گھر گیا شیخ جی کے سو سو بار
نہ رہا کوئی نوج شہر میں یار — نہ کہا جن نے میرا حال زار
تنگ آیا میں مفلسی سے کمال

کچھ طرح اور جب نہ بن آئی　　میں ہوا شیخ جی سے گھبرائی
کھینچی کیا کیا انہوں کی مرزائی　　پر تسلی مری نہ فرمائی
مفت عزت گئی ہوا پامال

ایک مدت تھی آج کل پر بات　　اب تو ہے صبح اب ہوئی ہے رات
ہے بہت شیخ کی غنیمت ذات　　جمع آدم میں اتنے کب ہیں صفات
مفتری و دروغی و محتال

ایک دن میں کہا جو ہو مضطر　　کہیئے اس در سے جاؤں اب کیدھر
ہنس کے بولے بہت تلطف کر　　سر منڈائے ہو تم بھی اس گھر پر
آگے آویں گے جتنے ہونگے بال

راتوں کے تئیں مصیبتیں گزریں　　اور دنوں کو قیامتیں گزریں
کچھ نہ پوچھو جو حالتیں گزریں　　باتوں باتوں میں مدتیں گزریں
وعدہ دو چار دن مہ و سال

پھر جو اس فرد کا ہوا مذکور　　کہنے لاگے کہ نائب دستور
جانتا ہے تمہیں کہ ہو مشہور　　پر کہے ہے رکھو مجھے معذور
جاری کرنا ہے اس کا امر محال

آٹھ آنے ہیں شاہ پر بھاری　　اس کی لوگوں نے کی ہے اب خواری
آپ ہے تو یہ ہے گرفتاری　　فوج ہے گی تو قحط کی ماری
کیوں نہ جس جائے ہے ہو اس کا کال

عمدے جو ہیں دنوں کو بھرتے ہیں　　سو بھی اسباب گرو دھرتے ہیں
ہیں سپاہی سو بھوکے مرتے ہیں　　لوہو پی پی کے زیست کرتے ہیں
ایک تلوار بیچے ہے اک ڈھال

رہ گیا میں سوچ جلاتا ہوں　　کچھ کہے کوئی سر ہلاتا ہوں
یعنی ہر ایک کے تئیں بلاتا ہوں　　کام سرکار کا چلاتا ہوں
کار پرداز ہیں سفیہ و ضلال

بادشاہ بھیک مانگتا آیا　　روز روزینہ بند فرمایا

معتمد اپنا مجھ کو ٹھہرایا　　سو پڑا بیچ میں میں گھبلایا
جسکو دیکھو رکھے ہے مجھ سے ملال

ملکی اور سارے صاحبان وقول　　پھرتے ہیں مجھ سے خوار و زار و ملول
کہیئے حضرت سے کچھ کبھی ہو جو حصول　　کوڑی دینا انہیں نہیں ہے قبول
آپ بھرتے ہیں انکا اہل و عیال

یاں مرے در پہ یاروں کا ہے ہجوم　　صبح سے شام تک رہے ہے دھوم
جو یہی ڈول ہے تو ہے معلوم　　ایک دن با قدوم فرح لزوم
نکلے گا یاں سے شہہ بجاہ و جلال

حاجت اک عالم اپنی لاتا ہے　　جو ہے سو جان کھائے جاتا ہے
کون یاں راہ حرف پاتا ہے　　اور جیسے کوئی منہ لگاتا ہے
کاٹتا ہے وہ پہلے چومے گال

اُس کے اُوپر ہے شہہ تماشائی　　اور چاہے ہے خرچ بالائی
ہر طرف پھیلی ہے یہ رسوائی　　کل چنانچہ ہمیں نظر آئی
لال خیمے کے گرد دو سہ یال

دینے کا ہو کہیں ٹھکانہ بھی　　جُود کو چاہیئے زمانہ بھی
یاں نہیں شہ کے گھر میں دانا بھی　　کبھو ہوتا ہے پینا کھانا بھی
ورنہ بھوکے رہے ہیں بیٹھے نڈھال

حال یہ ہے جو اسپہ ہو منظور　　پھر بھی نواب سے کروں مذکور
گاہ باشد کہ ہوا نہیں مقدور　　پر سماجت ہے اب خرد سے دور
لُطف کیا میں کہوں وے دیویں ٹال

میں کہا بس بہت خراب ہوا　　پردے میں واں سے بھی جواب ہوا
دل ہوا داغ جی کباب ہوا　　بارے ہوتا جو تھا شتاب ہوا
کٹ رہے گا مرا بھی یہ جنجال

دل سے اپنے بھی اب بھلا دیجے　　فرد میری مجھے منگا دیجے
ان خیالات کو اُڑا دیجے　　بند چڑیا کی سی چھُڑا دیجے

بس بچھایا بہت فریب کا جال
ہنس کے بولے کہ فرد ہے حاضر　　اور سمجھئے نہ مجھ کو بھی قاصر
جان کا ہوں تمہاری میں ناظر　　جمع فرما ؤ خاطرِ عاطر
اب نہیں پھر یہ کام ہونگا سنبھال
تب سے ابتک وہ فرد لاتا ہوں　　گاہ بیگاہ اُن کے جاتا ہوں
وقت پاتا ہوں تو جتاتا ہوں　　پر جواب اُن سے صاف پاتا ہوں
اب کی بار ی کا ہے یہ قیل و مقال

سگ نامہ

کُتّوں کے چاروں اور رستے تھے　　کُتّے ہی واں کہے تو بستے تھے
دو کہیں تھے کھڑے کہیں بیٹھے　　چار لوگوں کے گھر میں ہیں بیٹھے
ایک نے پھوڑے باسن ایکونے　　کھود مارے گھروں کے سب کونے
سانجھ ہوتے قیامت آئی ایک　　شور عف عف سے آفت آئی ایک
گلّہ گلّہ گھروں میں پھرنے لگے　　روٹی ٹکڑے کی بُو پہ گرنے لگے
ایک نے آکے دیگچہ چاٹا　　ایک آیا سو کھا گیا آٹا
ایک نے دوڑ کر دیا چھوڑا　　پھر ہپ آکے تیل اگر چھوڑا
گھر میں چھینکے اگر تھے توڑ دیئے　　ہانڈی باسن گرا کے توڑ دیئے
جب کہ ہڈّی پہ چار چار لڑیں　　گوشت پر بھیڑیئے سے دوڑ پڑیں
کُتّوں کی کیا سما جتوں کو کہیں　　جھجڑی سے رات دن لگے ہی رہیں
باہر اندر کہاں کہاں سگتے　　بام و در چھت جہاں تہاں سگتے
جھڑ جھڑا دے ہے کان کو کوئی　　رو وے ہے اپنی جان کو کوئی
اک طرف ہے چپڑ چپڑ کی صدا　　یعنی کُتّا ہے پتکی چاٹ رہا
ایک چھینکے کو منہ میں لے آیا　　ایک چوٹھے کو ھودتا پایا
ایک کے مُنہ میں ہانڈی سے کالی　　ایک نے چلنی چاٹ ہی ڈالی

تیل کی کپّی ایک لے بھاگا — ایک چھچے کھرے سے جا لاگا
آدمی کی معاش ہو کیونکر — کتّوں میں بود و باش ہو کیونکر

بستی دیکھی سو ایسی تھی آباد — کہ بیابان سخت سے دے یاد
چار چھپّر کہیں چماروں کے — سو بھی ٹوٹے گرے بچاروں کے
پھر چلو آگے تو نہیں ہے کچھ — ڈھنڈسا اور جو کہیں ہے کچھ
ٹوٹی پھوٹی کوئی حویلی ہے — سو بھی میدان میں اکیلی ہے
ایک دو مُردے سے پڑے ہیں واں — زرد ہو ہو گئے ہیں بے لب ناں
لوگ ایسے مکان سب ایسے — ایسی جاگہ سے اُٹھیں دل کیسے
اور جو چار گھر نظر آئے — ان کی خوبی کھلے وہیں جائے
وہ بھی کولی چمار رہتے کوئی — فاقوں کے زیر بار رہتے کوئی
صورتیں کالی سوکھے سوکھے سے — سارے کنگال اور بھوکے سے
چار دانوں کے واسطے جی دیں — جان کھا جائیں کچھ نہ جبتک لیں
اور آگے گئے تو تھا بازار — اس میں بنیوں کی تھیں دکانیں چار
ایک کے پاس دال کچھ آٹا — تس کو بھی گھن ہوئے تھا چاٹا
ایک کے سانواں اور تھوڑے چنے — چھبڑوں میں خاک دھول ایک کنے
ایک کنجڑے کے چار گتھی پیاز — تس پر اُس کو ہزار فخر و ناز
کیا کہوں مرچ تھی نہ ادرک تھی — اُس مچھندر میں کچھ بھی بھارک تھی
ایک دوکان تھی پساری کی — اُن نے ہم لوگوں سے بھی یاری کی
اُس سے جا کر جو مانگیے ہلدی — زرد مٹی کو باندھ دے جلدی
دیکھ کر کچھ کہو تو وہ یہ کہے — بس تم اس بستی میں میاں جی رہے
یاں جو کچھ ہے چلن سو دیتا ہوں — میں بھی پیسے لگا کے لیتا ہوں

مخمّس در شہرِ کاما حسبِ حالِ خود

قابل ہے میری سیر کے اطوارِ روزگار　　چالیں عجب طرح کی چلے ہے عجب شعار
کرتا ہے بدسلوکی سبھوں سے یہ بے مدار　　لاتا ہے روز فتنۂ تازہ بروئے کار
دل داغ داغ رہتے ہیں اس سے جگر فگار

کاہے سے تلخ کام اُٹھایا مرے تئیں　　دلّی میں بے دلا نہ پھرایا مرے تئیں
ہم چشموں کی نظر سے پھرایا مرے تئیں　　حاصل کے پیس سُرمہ بنایا مرے تئیں
ہیں مُشتِ خاک مجھ سے اُسے اس قدر غبار

لشکر میں مجھ کو شہر سے لایا پئے تلاش　　یاں آکے گزری میری عجب طور سے معاش
پانی کسو سے مانگ پیا میں کہو سے آش　　اس واقعے سے آگے اجل پہنچی ہوتی کاش
ناموس رہتی فقر کی جاتا نہ اعتبار

مدت رہا تھا ساتھ جنھوں کے خراب حال　　دانستہ ان سبھوں نے کیا مجھ کو پائمال
آخر کو آیا مجھ میں انھوں بیچ ملال　　یہ زندگی سہل ہوئی جان کا وبال
اس جمع میں کسو کو میں پایا نہ دستیار

جانا نہ تھا جہاں مجھے سو بار واں گیا　　ضعفِ قوی سے دست بدیوار واں گیا
محتاج ہو کے ناں کا طلبگار واں گیا　　چارہ نہ دیکھا مضطر و ناچار واں گیا
اس جانِ ناتواں پہ کیا صبر اختیار

در پر ہر اک دنی کے سماجت مری گئی　　نالائقوں سے ملنے لیاقت مری گئی
کیا مُفت ہائے شانِ شرافت مری گئی　　ایسا پھرایا اُس نے کہ طاقت مری گئی
مشہور شہر اب ہوں سُبکسار و بے وقار

کن نے کی اپنے حال پہ شفقت سے یک نگاہ　　نکلے ہے کس سے طور پر اپنے سخن کی راہ
بولا نہ کوئی ہم سے کہ تم کیوں ہوئے تباہ　　اسلوب اپنے جینے کا ہو کس طرح سے آہ
ہم ایک ناتوان و ضعیف اور غم ہزار

حاجت مری روا دلِ پُر درد نے نہ کی　　تاثیر اشکِ سُرخ و رُخِ زرد نے نہ کی

تدبیر ایک دم بھی دم سرد نے نہ کی　　دل جوئی میری حیف کبھی فرد نے نہ کی

طاقت رہی نہ دل میں گیا جان سے قرار

دل سربسر خراب ہے تعمیر کیا کروں　　آشفتگی حال کی تعبیر کیا کروں

خوں نا بہائے چشم کی تقریر کیا کروں　　زردی رنگ چہرہ کی تحریر کیا کروں

آیا جو میں چمن میں خزاں ہوگئی بہار

حالت تو یہ کہ مجھ کو غموں سے نہیں فراغ　　دل سوزش درونی سے جلتا ہے جوں چراغ

سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ　　ہے نام مجلسوں میں مرا میر بے دماغ

ازبس کہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

دوسری مثنویاں

مثنوی خوابِ و خیالِ میر

خوشا حال اُس کا جو معدوم ہے
کہ احوال اپنا تو معلوم ہے

رہیں جانِ غم ناک کو کاہشیں
گئیں دل سے نومید سو خواہشیں

زمانے نے رکھا مجھے متصل
پراگندہ روزی پراگندہ دل

گئی کب پریشانیِ روزگار
رہا میں تو ہم طالعِ زلفِ یار

وطن میں نہ اک صبح میں شام کی
نہ پہنچی خبر مجھ کو آرام کی

اٹھاتے ہی سر یہ پڑا اتفاق
کہ دشمن ہوئے سارے اہلِ وفاق

جلاتے تھے مجھ پر جو اپنا دماغ
دکھانے لگے داغ بالائے داغ

زمانے نے آوارہ چاہا مجھے
مری بےکسی نے نباہا مجھے

رفیقوں سے دیکھی بہت کوتہی
عزیزوں نے کی ترک کی ہمسری

مجھے یہ زمانہ جدھر لے گیا
غریبانہ چندے بسر لے گیا

بندھا اس طرح آہ بارِ سفر
کہ نے زادِ رہ کچھ نہ یارِ سفر

دل اک بار سو بے قرارِ بتاں
غبارِ سرِ رہ گزارِ بتاں

گرفتارِ رنج و مصیبت رہا
غریبِ دیارِ محبت رہا

چلا اکبرآباد سے جس گھڑی
در و بام پر چشمِ حسرت پڑی

کہ ترکِ وطن پہلے کیونکر کروں
مگر ہر قدم دل کو پتھر کروں

پس از قطعِ رہ لائے دلّی میں بخت
بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت

جگر جورِ گردوں سے خوں ہو گیا
مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا

ہوا خبط سے مجھ کو ربطِ تمام
لگی رہنے وحشت مجھے صبح و شام

کبھو کف بلب مست رہنے لگا
کبھو سنگ در دست رہنے لگا

کبھو غرقِ بحرِ تحیّر رہوں
کبھو سر بجیبِ تفکر رہوں

یہ وہم غلط کاریاں تک کھنچا   کہ کارِ جنوں آسماں تک کھنچا
نظر رات کو چاند پر گر پڑی   تو گویا کہ بجلی سی دل پر پڑی
مہ چار دہ کارِ آتش کرے   ڈروں یاں تلک میں کہ جی غش کرے
نظر آئی شکل ایک مہتاب میں   کمی آئے جس سے خور و خواب میں
اگرچہ پرتو سے مہ کے ڈروں   و لیکن نظر اُس طرف ہی کروں
ڈروں دیکھ مائل اُسے اس طرف   سجدے کہ آجائیں ہونٹوں پہ کف
رہی فکر جاں میرے احباب کو   اُٹھا دیویں سب گھر کے اسباب کو
جو دیکھوں تو آنکھوں سے لوہو بہے   نہ دیکھوں تو جی پر قیامت رہے
اُسے دیکھوں جیدھر کروں میں نگہ   وہی ایک صورت ہزاروں جگہ
رہے سامنے اک طرح پر کبھو   رکھے وضع سے پاؤں باہر کبھو
بغل میں کبھو آرمیدہ رہے   کبھو اپنے بر خویش چیدہ رہے
کبھو صورت دلکش اپنی دکھائے   کبھو اپنے بالوں میں منہ کو چھپائے
کبھو گرم کینہ کبھو مہرباں   کبھو دوست نکلے کبھو خصمِ جاں
کبھو یک بیک یار ہو جائے وہ   کبھو دست بردار ہو جائے وہ
گلے میں مرے ہاتھ ڈالے کبھو   طرح دشمنی کی نکالے کبھو
کبھو چیں بہ ابرو کبھو ہنس کے بات   کبھو بے وفائی کبھو التفات
جو میں ہاتھ ڈالوں وہاں کچھ نہیں   بجز شکلِ وہمی عیاں کچھ نہیں
ہر اک رات چندے یہ صورت رہی   اُسی شکلِ وہمی سے صحبت رہی
دمِ صبح ہو گرم رہ سوئے ماہ   کہ درپیش آوے یہ روزِ سیاہ
کہ جھوما کروں بیدِ مجنوں کی طرز   رہے یاد اس سروِ موزوں کی طرز
رہوں زرد میں گاہ بیمار سا   پریشاں سخن گہ پری دار سا
پری خواں کو لا کوئی افسوں پڑھائے   کبھو سے کوئی جا کے تعویذ لائے
طبیبوں کو آخر دکھایا مجھے   نہ پینا جو کچھ تھا پلایا مجھے
جنوں آہ در پے ہوا جان کے   مجوّز ہوئے یار زندان کے
کیا بند اِک کوٹھری میں مجھے   کہ آتش جنوں کی مگر واں بجھے

نہ آوے کوئی ڈر سے میرے کنے — کہ کیا جانیے کیسی صحبت بنے
سرِ شام بیٹھا تھا میں ایک روز — افاقت نہ آئی تھی مجھکو ہنوز
کہ یاروں نے برجستہ تدبیر کی — مرے خون میں کچھ نہ تقصیر کی
اگرچند کہنے کو خوں کم کیا — لیا لوہو اتنا کہ بے دم کیا
کئی روز بالیں پہ سر رہا — خمار ایک مدّت تلک پھر رہا
پس از چند آنکھیں ٹھہرنے لگیں — نگاہیں بھی کچھ کام کرنے لگیں
لگی جان سی آنے اعضا کے بیچ — کوئی روز رہنا تھا دنیا کے بیچ
غلط کاری وہم کچھ کم ہوئی — وہ صحبت جو رہتی تھی برہم ہوئی
وہ صورت کا وہم اور دیوانگی — لگی کرنے در پردہ بیگانگی
پس از دیر آنکھوں میں آنے لگی — نہ دو دو پہر منہ دکھانے لگی
نہ دیکھے مری اور اُس پیار سے — غریبانہ سر مارے دیوار سے
کہیں تنگ تسلی کہیں بے قرار — کہیں شوق سے میرے بے اختیار
کہیں واسطے میرے روتی ہی خون — کہیں دست زیرِ زنخ بے سکون
کہیں دل کو اپنے دکھائے مجھے — مری بے وفائی جتا دے مجھے
کہیں دست بر دل وہ رشکِ قمر — کہیں حسرت آلو وہ مجھ پہ نظر
کہیں بے دماغانہ سرگرمِ ناز — کہیں آتشِ شوق سے جاں گداز
کہیں چشمِ گریاں سے دامانِ پاک — کہیں سو جگہ سے گریبان چاک
کہیں کام دل کی شکایت سے ہے — کہیں نقشِ دیوار حیرت سے ہے
کہیں مجھ سے کہتی ہے رخصت مجھے — کہ مطلق نہیں غم کی طاقت مجھے
کہیں لب پہ وہ شکوۂ خوں چکاں — کہ ٹپکا کرے جس سے آزارِ جاں
کہیں وہ نگہ جس سے یہ پائیے — کہ یہ دردِ دل ہے تو مٹ جائیے
کہیں وہ روش جس سے نکلے عتاب — کہیں وہ طرح جس سے رہیے خراب
کہیں حرفِ زن اس طرح ناز سے — کہ دیکھا گیا دل کس انداز سے
کہیں وہ ادا جس سے معلوم ہو — کہ جیسے وہ عاشق کہ محروم ہو
کہیں وہ سخن جو جگر خوں کرے — کہیں طرز ایسی کہ مفتوں کرے

کہیں وضع ایسی کہ بیگانہ ہے
کہیں آشنا ہے تو دیوانہ ہے

کبھو جا ہے جلوے میں اس آن سے
کبھو تو کہ بےزار ہے جان سے

کبھو وقت اس کا یہ اسلوب ہے
کہ شرمِ محبت سے محجوب ہے

کبھو بے قراری ہے اس رنگ سے
کہ پھرتی ہے سر مارتی سنگ سے

کبھو بے ادائی و دشنام ہے
کبھو باد کے ہاتھ پیغام ہے

کہ اے بیوفا آہ دل نرم کر
محبت کی بھی منہ سے کچھ شرم کر

کبھو وہ تبختر کہ پروا نہیں
کبھو کیونکہ کہیئے کہ سودا نہیں

کبھو یہ سخن جس سے ہو استفاد
کہ اے بے وفا حرفِ سن یاد باد

کہ ظاہر میں میرا اب توانا گیا
کہ وہ دوستی کا زمانہ گیا

غرض ناامیدانہ کر اک نگاہ
وہ نقشِ توہم گیا سوئے ماہ

نہ آیا کبھو پھر نظر اس طرح
نہ دیکھا اسے جلوہ گر اس طرح

مگر گاہ سایہ سا مہتاب میں
کبھو وہم سا عالمِ خواب میں

دلِ خو پذیرِ وصالِ مدام
رہے خواب میں روز و شب صبح و شام

اگر وصل خوابِ فراموش تھا
ولیکن وہی خواب کا جوش تھا

پلک سے پلک آشنا ہے وہی
زخود رفتگی کی ادا ہے وہی

کھڑا ہوں تو سوتا ہوں اک ذوق میں
رگِ خواب دل ہے کفِ شوق میں

جو بیٹھا ہوں خوابِ گراں ہے مجھے
وہ غفلت جہاں در جہاں ہے مجھے

خیال اس کا آوے کہ تن ہو رہوں
تلے سر کے پتھر رکھوں سو رہوں

مجھے آپ کو یوں ہی کھوتے گئی
جوانی تمام اپنی سوتے گئی

دکھایا نہ اس مہ نے رو خواب میں
نہ دیکھا پھر اس کو کبھو خواب میں

بہت بے خود و بے خبر ہو چکا
ہم آغوشِ طالع بہت ہو چکا

نہ دیکھا کبھو میر پھر وہ جمال
وہ صحبت تھی گویا کہ خواب و خیال

موہنی بلّی

ایک بلی موہنی تھا اُس کا نام — اُن نے میرے گھر کیا آ کر مقام
ایک دو سے ہو گئی اُلفت گزیں — کم بہت جانے لگی اُٹھ کر کہیں
ربط پھر پیدا کیا میرے ہی ساتھ — دیکھتی رہنے لگی میرا ہی ہاتھ
آنے سے مجھ پاس یہ اُٹھ کر سویر — گربۂ زردِ فلک نکلے ہے دیر
چھیچھڑا ٹکڑا جو کچھ پایا کرے — فقر میرا دیکھ کر کھایا کرے
نعمتوں سے لوٹا ہے چھینکا کبھی اگر — اُن نے ادھر کی نہیں مطلق نظر
دخل کیا ہے جو لگے یہ چھینکے کی اور — ٹکڑے کو دیکھے نہ گو بھوکی ہو زور
برسوں یاد آدے گی یہ پاکیزہ خو — آگے آئی ہی نہیں چلتے کبھو
شوق میں ہمسائیاں اس کے رہیں — جو گئی کبھی ٹک تو مانگے سے کہیں
پھرنے کو تو پھرتی کیا دلی نہ تھی — پر چلے پاؤں کی یہ بلی نہ تھی
رفتہ رفتہ کوٹھوں پر جانے لگی — پہروں پہروں میں یہ پھر آنے لگی
حاملہ ہو کر کئی بچے دیئے — ایک دو بھی سو نہ ان میں سے جیئے
حفظ اس کی کوکھ کا لازم ہوا — جھاڑے پھونکے کا ہر اک عازم ہوا
نذریں مانیں نقش لائے ڈھونڈ کر — نیل کے ڈوروں میں باندھو پیٹ پر
چھیچھڑوں پر بعضوں نے افسوں لکھے — بعضوں نے تعویذ لے کر خوں لکھے
بی بلائی سے بہت کی التجا — گربۂ محراب سے چاہی دُعا
گوشت کی چیلوں کو پھینکیں بوٹیاں — ماش کی موٹی پکائیں روٹیاں
لڑکیاں بھلائیاں کھاٹوں تلے — اس طرح جوں دبکی بلی کم ہلے
دیتے ٹکڑا مُنہ کو ہر اک کھولتے — اور بولی بلیوں کی بولتے
بوہریرہ کے تئیں مانا بہت — بلیوں کو بھی دیا کھانا بہت
پانچ بچے اُس نے اس نوبت دیئے — بارے سب وے قدرتِ حق سے جیئے
دیر میں میں نے جو یہ ٹک غور کی — بلیاں پانچوں ہیں یہ اک طور کی
دو مہینے تک بہت تھی احتیاط — کتے بلی سب سے موقوف اختلاط

در سے نکلیں سب ہو تو بازی سے گرم — زرد و زرد اُنکی دُمیں مُنہ نرم نرم

بچے ریشم کے سے چنیں رنگ خال — کچھ سفید و کچھ سیہ کچھ زرد و لال

لے گئے ایک ایک کر سب تین تو — مُنّی، مانی، رہ گئیں مجھ پاس دو

مُنّی کی پھر ایک صاحب نے پسند — تھی بھی نازک ایسی ہی طالع بلند

مانی کچھ بھاری تھی نکلی بُردبار — رہ گئی یاں فقر کو کر اختیار

تو رہتے پر میرے اُس کی خواب گاہ — دل سے میرے خاص اُسکو ایک راہ

میں نہ ہوں تو راہ دیکھے کچھ نہ کھائے — جان پا دے سُن مری آواز پائے

صبح آگے آن پہنچے در تلک — دیکھے میرے پاؤں سے لے سر تلک

آنکھ سے معلوم ہو مشتاق ہے — بلّی یا اعجوبۂ آفاق ہے

ربط ہے اپنے بھی جی کو اُسکے ساتھ — بیٹھے ہی تو پیٹھ پر میرا ہے ہاتھ

کیا دماغ اعلیٰ طبیعت کیا نفیس — کیا مصاحب بے بدل کیسے جلیس

یہ نفاست یہ لطافت یہ تمیز — آنکھ دوڑے ہے نہ ہو کیسی ہی چیز

چوہا چڑیاں اس نے کچھ کھایا نہیں — حج کو جانا اس کے تئیں آیا نہیں

مثنویاتِ جذباتِ عشق ۱۲٦۲

مثنوی دریائے عشق

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال
ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال

دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا
کہیں سینے میں آہِ سرد ہوا

کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا
کہیں سر میں جنون ہو کے رہا

کہیں رونا ہوا ندامت کا
کہیں ہنسنا ہوا جراحت کا

کہیں آنسو کی یہ سرایت ہے
کہیں یہ خونچکاں شکایت ہے

تھا کسی دل میں نالۂ جانکاہ
ہے کسو لب پہ ناتواں اک آہ

تھا کسو کی پلک کی نمناکی
ہے کسو خاطروں کی غمناکی

کہیں باعث ہے دل کی تنگی کا
کہیں موجب شکستہ رنگی کا

ایک عالم میں دردمندی کی
ایک محفل میں جا سپندی کی

اک زمانے میں دل کی خواہش تھا
اک سمیں میں جگر کی کاہش تھا

کہیں بیٹھے ہے جی میں ہو کر چاہ
کہیں رہتا ہے قتل تک ہمراہ

خار خارِ دلِ غریباں ہے
انتظارِ بلا نصیباں ہے

کشش اس کی ہے ایک اعجوبہ
ڈوبا عاشق تو یار بھی ڈوبا

کام میں اپنے عشق یکا ہے
ہاں یہ نیرنگ ساز یکا ہے

جس کو ہو اُسکی التفات نصیب
ہے وہ مہمان چند روزہ غریب

ایسی تقریب ڈھونڈلاتا ہے
کہ وہ ناچار جی سے جاتا ہے

ایک جا اک جوان رعنا تھا ۱۲۰٦
لالہ رُخسار و سرو بالا تھا

عشق رکھتا تھا اُسکی چھاتی گرم
دل وہ رکھتا تھا موم سے بھی نرم

شوق تھا اُسکو صورتِ خوش سے
اُنس رکھتا تھا وضعِ دلکش سے

تھا طرحدار آپ بھی لیکن
رہ نہ سکتا تھا اچھی صورت بن

کوئی ترکیب اگر نظر آتی
صورتِ حال اور ہو جاتی

دیکھتا گر وہ کوئی خوش پرکار
رہتا خمیازہ کش ہی لیل و نہار

زلف ہوتی کسو کی گر برہم
دیکھتے اُس کے حال کو درہم

دیکھتا گر کہیں وہ چشمِ سیاہ
دل سے بے اختیار کرتا آہ

سر میں تھا شورِ شوق دل میں تھا
عشق ہی اُسکے آب و گل میں تھا

الغرض وہ جوانِ خوش اسلوب
ناشکیبا رہے تھا بے محبوب

ایک دن بے کلی سے گھبرایا
سیر کرنے کو باغ میں آیا

کسو گل پاس وہ صنم ٹھہرا
کہیں سبزے میں ایک دم ٹھہرا

ایک خیابان میں سے ہو نکلا
ایک سائے تلے سے رو نکلا

نہ تسلی ہوا دلِ بیتاب
نہ تھما چشمِ تر سے خونِ ناب

دل کی واشد سے بے توقع ہو
ہر شجر کے تلے بہت سا رو

دیکھ گلشن کو نا اُمیدانہ
مُنہ کیا اُن نے جانبِ خانہ

دل کے رُکنے کا اُسکو اک غم تھا
راہ چلتے خیال درہم تھا

ناگہ اُس کوچے سے گزار ہوا
آفتِ تازہ سے دوچار ہوا

ایک غرفے سے ایک مہ پارہ
تھی طرف اُس کے گرمِ نظارہ

پڑ گئی اُس پہ اک نظر اُس کی
پھر نہ آئی اُسے خبر اُس کی

تھی نظر یا کہ جی کی آفت تھی
وہ نظر ہی وداعِ طاقت تھی

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ
صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

بے قراری نے کج ادائی کی
تاب و طاقت نے بے وفائی کی

مُنہ جو اُس کا طرف سے اُسکے پھرا
مضطرب ہو کے خاک پر یہ گرا

وہ تو رکھتی نہ تھی خیال اُس کا
بیطرح ہوئے گو کہ حال اُس کا

جھاڑ دامن کے تئیں وہ مہ پارہ
اُٹھ گئی سامنے سے یکبارہ

وہ گئی اُس کے سر بلا آئی
خاک میں مل گئی وہ رعنائی

دل پہ کرنے لگا طپیدن ناز
رنگ چہرے سے کر چلا پرواز

ہاتھ جانے لگا گریباں تک
جا کے پہنچے پاؤں داماں تک

طبع نے اک جنوں کیا پیدا
اشک نے رنگِ خوں کیا پیدا

سوزشِ دل نے جی میں جاگہ کی
داغ نے آ جگر کو آتش دی

بسترِ خاک پہ گرا وہ زار
درد کا گھر ہوا دلِ بیمار

خاطرِ افگار خار خار ہوئی
جاں تمنا کشِ نگار ہوئی

اُس کے منہ پر پڑی جو اُسکی نگاہ
نا اُمیدی کے ساتھ ہی سر کی آہ

خو ہوئی نالۂ حزیں کے ساتھ
رابطہ آہِ آتشیں کے ساتھ

ہونٹھ سوکھے تو خوب ناب ملا
خواب و خور دونوں کو جواب ملا

خلق اُس کی ہوئی تماشائی
پھر نہ وہ دیکھنے کبھو آئی

کچھ کہا گر کسو نے شفقت سے
رو دیا اُن نے ایک حسرت سے

جا کے اُسکے قریب در بیٹھا
قصد مرنے کا اپنے کر بیٹھا

دل نہ سمجھا کہ اضطراب کیا
شوق نے کام کو خراب کیا

جو کہ سمجھے تھے اُس کو دیوانہ
رحم کرتے تھے آشنایانہ

عاشق اُس کو کسو کا جان گئے
سب بُرا اس ادا کو مان گئے

کیونکہ باہم معاش تھی سب کی
ایک جا بود و باش تھی سب کی

وارث اُسکے بھی بدگمان ہوئے
درپئے دشمنیِ جان ہوئے

مشورت تھی کہ مار ہی ڈالیں
دفعتاً اُس بلا کے تئیں ٹالیں

پھر یہ ٹھہری کہ ہونگے ہم بدنام
سُن کے آخر کہیں گے خاص و عام

کیا گنہ تھا کہ یہ جواں مارا
کن نے مارا اُسے کہاں مارا

ہووے یہ خونِ خفتہ گر بیدار
کھینچتی ہووے خفت بسیار

کیجے ایک ڈھب سے اُس کو تنگ
تا نہ عاید ہو اپنی جانب ننگ

تہمتِ خبط رکھیے اُس کے سر
کیجے سنگسار اُس کو پھر

دے کے دیوانہ اُس جواں کو قرار
ہو گئے سارے درپئے آزار

ایک نے سخت کہہ کے تنگ کیا
ایک نے آ کے زیرِ سنگ کیا

ایک آیا تو ہاتھ میں شمشیر
ایک بولا کہ اب ہے کیا تاخیر

کی اشارت کہ کودکانِ شہر
آئے لبریزِ غصہ و پُر قہر

گرچہ ہنگامہ اُس کے سر پر تھا — ایک رونے دل اُس کا اودھر تھا
محو تھا اُس کے یہ خیال کے بیچ — تھا گرفتار اپنے حال کے بیچ
ہو نثمہ پر حسن کا بیاں اُس کا — تھا سر و سنگ آستاں اُس کا
ایک دم آہِ سرد بھر اُٹھنا — نالۂ گرم گاہ کر اُٹھنا
جی میں کہتا کہ آہ مشکل ہے — اس طرف ایک نگاہ مشکل ہے
دوست کو میرے نام سے ہے ننگ — دشمنوں سے ہے جی پہ عرصہ تنگ
چشمِ تر سے لہو بہا کرتا — صبح کے باد سے کہا کرتا
کاے نسیمِ سحر یہ اس سے کہہ — مت تغافل کر اور غافل رہ
ان بلاؤں میں کوئی کیونکہ جئے — جان پر آ بنی ہے تیرے لئے
جان دوں تیرے واسطے سو تو — آنکھ اُٹھا کر ادھر نہ دیکھے کبھو
رفتہ رفتہ ہوا ہوں سودائی — دُور پہونچی ہے میری رسوائی
نام کو بھی ترے نہ جانا آہ — تجھ سے کیونکر سخن کی نکلے راہ
ناامیدانہ گر کروں ہوں نگاہ — دیکھتا ہوں ہزار روزِ سیاہ
سخت مشکل ہے سخت ہے بیداد — ایک میں خوں گرفتہ سو جلاد
کوئی مشفق نہیں کہ ہووے شفیق — بیکسی بن نہیں ہے کوئی رفیق
نالہ ہوتا ہے گرہ گہے دل جو — گریہ آنسو نے پونچھتا ہی کبھو
آہ جو ہمدمی سی کرتی ہے — اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہے
چشم رکھتا ہے وصل کی یہ دل — جی ہے اس سے اسیرِ آب و گل
ورنہ ترکیب یہ کہاں ہوتی — صورت اک معنیٔ نہاں ہوتی
اب ٹھہرتا نہیں ہے پائے ثبات — ایک میں اور کتنے تصدیعات
سنگباراں سے سخت ہوں دل تنگ — شیشۂ دل نہیں ہے پارۂ سنگ
محرمِ یک نگاہ بیش نہیں — کم ہے سینے میں جا کہ ریش نہیں
کیونکہ کہیئے کہ تو نہیں آگاہ — اک قیامت بپا ہے یاں سر راہ
کچھ چھپا تو نہیں رہا یہ راز — ایک جہاں اس سے ہی خبر پرداز
بس تغافل ہوا ترحم کر — گوشِ دل جانبِ تظلم کر

کون کہتا ہے رہ نہ تجھو ناز ۔۔۔ پڑا اتنا کہ جی سے جائے نیاز
اُن بلاؤں پہ اُن نے صبر کیا ۔۔۔ اختیار اپنے جی پہ جبر کیا
اس طرف کا نہ دیکھنا چھوڑا ۔۔۔ اس کے اندوہ سے نہ مُنہ موڑا
اور یہ ماجرا ہوا مشہور ۔۔۔ شور رُسوائیوں کا پہونچا دُور
دیکھ کر اُس کو بیخود و بیخواب ۔۔۔ جانا ہر اک نے عاشق بیتاب
مُنھ پر اُس کے جو رنگ خون نہیں ۔۔۔ عشق ہے اسکو یہ جنون نہیں
ہے نگہ اُس کی جس طرف مائل ۔۔۔ اُس طرف ہی گیا ہے اُسکا دل
جب ہوا ذکر اقل و اکثر میں ۔۔۔ چاہ ثابت ہوئی اُسی گھر میں
عشق بے پردہ جب فسانہ ہوا ۔۔۔ مضطرب کد خدائے خانہ ہوا
گھر میں جا بہر دفع رُسوائی ۔۔۔ بیٹھ کر مشورت یہ ٹھہرائی
یاں سے یہ غیرت مہ تاباں ۔۔۔ جا کے چندے کہیں رہے پنہاں
شب محافے میں اسکو کرکے سوار ۔۔۔ ساتھ دے ایک دایۂ غدّار
پار دریا کے جلد رُخصت کی ۔۔۔ اس طرح فکر رفع تہمت کی
گھر تھا اک آشنا کا مدِ نگاہ ۔۔۔ واں ہو ردپوش تا یہ غیرت ماہ
ہو وے جب اس بلا سے خاطر جمع ۔۔۔ نور افزائے خانہ ہو جوں شمع
گھر سے باہر محافہ جو نکلا ۔۔۔ اس جواں ہی کے پاس ہو نکلا
طپش دل سے ہو کے یہ آگاہ ۔۔۔ ہو لیا ساتھ اُسکے بھر کر آہ
واں کے رہنے سے اُسکو کام نہ تھا ۔۔۔ وہ گلی اُس کا کچھ مقام نہ تھا
دست افشاں وہ پائے کوباں یہ ۔۔۔ تھا محافے کے ساتھ گرم رہ
قطرہ زن اشک سا وہ راہ تمام ۔۔۔ درپئے یار تھا یہ بے آرام
ہر قدم تھا زبان پر جاری ۔۔۔ خواب ہے یا کہ ہے یہ بیداری
ہمسری اُس کی تھی میسّر کب ۔۔۔ ہے مجھے بخت واژگوں سے عجب
شوقِ مفرط نے بے تہی کی سخت ۔۔۔ نو شکیبی نے دل سے باندھا رخت
رفتہ رفتہ سخن ہوئے نالے ۔۔۔ اُڑنے لاگے جگر کے پرکالے
اضطرابِ دلی نے زور کیا ۔۔۔ اُن نے بے اختیار شور کیا

دل کے غم کو زبان پر لایا　　آفت تازہ جان پر لایا
کہ اے جفا پیشہ و تغافل کیش　　اک نظر سے زیاں نہیں کچھ بیش ۳۶۱
منہ چھپایا ہے تو نے اس پر بھی　　نگہِ التفات ادھر بھی
صبر کیوں کس بلا سے کر گزروں　　چارہ اس بن نہیں کہ مر گزروں
نازِ خوبی نے دل دیا نہ تجھے　　رحم سے آشنا کیا نہ تجھے
اب تغافل نہ کر تلطف کر　　حال پر میرے ٹک تاسف کر
گوش زد دایہ کے ہوئے یہ سخن　　تھی وہ استاد کارِ حیلہ و فن
پاس اس کو بلا تسلی کی　　وعدۂ وصل سے تشفی کی
لیک در پردہ ان نے یہ ٹھانی　　کیجیے اس سے خصمیٔ جانی
یہ تو دل تفتۂ محبت تھا　　سخت وارفتۂ محبت تھا
وقت نزدیک تھا جو آ پہونچا　　تا سرِ آب پا بپا پہونچا
کشتی اک آن کر ہوئی موجود　　ہو فلک سے ہلال جیسے نمود
کی کنارے پہ لا کے استادہ　　تھا محافہ رکوب آمادہ
اس سفینہ میں جلد جا پہونچا　　یہ بھی واں ساتھ ہی لگا پہونچا
بیچ دریا میں دایہ نے جا کر　　کفش اس گل کی اسکو دکھلا کر
پھینکی پانی کی سطح پر اک بار　　اور بولی کہ اے جگر افگار
حیف تیرے نگار کی پاپوش　　موجِ دریا سے ہووے ہم آغوش
غیرت عشق ہے تو لا اس کو　　چھوڑ مت یوں برہنہ پا اس کو
سن کے یہ حرفِ دایۂ مکار　　دل سے اسکے گیا شکیب و قرار
بے خبر کارِ عشق کی تہ سے　　جست کی ان نے اپنی جا گہ سے
تھا سفینے میں یا کہ دریا میں　　موجِ زنجیر ہو گئی پا میں
کہتے ہیں ڈوبتے اچھلتے ہیں　　لیکن ایسے کوئی نکلتے ہیں
دایہ حیلہ گر ہوئی دل شاد　　واں سے کشتی چلی برنگ باد ۳۶۹
خارِ خارِ دلی سے فارغ ہو　　لے گئی پار اس گلِ نو کو
یہ نہ سمجھی کہ عشق آفت ہے　　فتنہ سازی میں اک قیامت ہے

قصۂ کوتاہ بعد یک ہفتہ　　آئی وہ رشک مہ ز خود رفتہ
کہنے لاگی کہ اب تو اے دایہ　　ہوگیا غرق وہ فرومایہ
اب تو وہ ننگ دیمیاں سے گیا　　آرزومند اس جہاں سے گیا
تھے جو ہنگامے اسکے حد سے زیاد　　ساتھ اُسکے گئے وے شور و فساد
شور فتنے تھے اسی تک سارے　　ابتو بدنامیاں نہیں بارے
دل تڑپتا ہے متصل میرا　　مُرغِ بسمل ہے یا کہ دل میرا
وحشت طبع اب تو افزوں ہے　　حالِ جی کا مرے دگرگوں ہے
بیدماغی کمال ہوتی ہے　　جان تن کے وبال ہوتی ہے
دل کوئی دم میں خون ہوویگا　　آج کل میں جنون ہووے گا
بیکلی جی کو تاب دیتی ہے　　طاقت دل جواب دیتی ہے
جی میں آتا ہے ہوں بیابانی　　پر کہوں ہوں کہ ہے یہ نادانی
مصلحت ہے کہ مجھکو لے چل گھر　　ایک دو دم رہینگے دریا پر
گاہ باشد کہ دل مرا وا ہو　　ورنہ کیا جانیے کہ پھر کیا ہو
دایہ بولی کہ اے سراپا ناز　　حسن کا در پہ تیرے روے نیاز
اب تو میں فتنے کو سُلایا ہے　　اس بلا کے تئیں بٹھایا ہے
کون مانع ہے گھر کے چلنے کا　　سو رہ کون ہے نکلنے کا
یہ نہ سوچی کہ بد بلا ہے عشق　　گھات میں اپنی لگ رہا ہے عشق
جس کسو سے یہ پیار رکھتا ہے　　عاقبت اُس کو مار رکھتا ہے
صبح گاہاں وہ غیرت خورشید　　اس جگہ سے رواں ہوئی نومید
پہونچی نصف النہار دریا پر　　روئی بے اختیار دریا پر
حد سے افزوں جو بیقرار ہوئی　　دایہ کشتی میں لے سوار ہوئی
حرف زن یوں ہوئی کہ اے دایہ　　یاں گرا تھا کہاں وہ کم مایہ
موج سے تھا کدھر کو ہم آغوش　　تھا تلاطم سے کسطرف ہمدوش
تجھ کو آیا نظر کہاں آکر　　پھر جو ڈوبا تو کس جگہ جا کر
مجھ کو دیجو نشان اُس جا کا　　میں بھی دیکھوں خروش دریا کا

لکھ میں گرچہ دایہ تھی کاہل　　　　لیک تہ سے سخن کے تھی غافل
یہ نہ سمجھی کہ ہے فریب عشق　　　　ہے یہ مہ پارہ ناشکیب عشق
بیچ دریا کے جا کہا یہ صرف　　　　یاں ہوا تھا وہ ماجرائے شگرف
سنتے ہی یہ کہاں کہاں کرکر　　　　گر پڑی قصد ترک جاں کرکر
موج ہر اک کمند شوق تھی آہ　　　　لپٹی اس کو برنگ مار سیاہ
جا بہم آغوش مردہ یار ہوئی　　　　تہ میں دریا کے ہمکنار ہوئی
پاک کی زندگی کی آلائش　　　　ہو کے دست و بغل کی آسائش
سر پٹکتی جو گھر گئی دایہ　　　　آفت اک لے گئی نئی دایہ
خلق یکجا ہوئی کنارے پر　　　　حشر برپا ہوا کنارے پر
دام داروں سے سب نے کام لیا　　　　آخر ان کو اسیر دام کیا
نکلے باہم دلے موئے نکلے　　　　دونوں دست و بغل ہوئے نکلے
ربط پنہاں بہم ہویدا تھا　　　　مر گئے پر بھی شوق پیدا تھا
ایک کا ہاتھ ایک کی بالیں　　　　ایک کے لب سے ایک کو تسکیں
جو نظر ان کو آن کرتے تھے　　　　ایک قالب گمان کرتے تھے
حیرت کار عشق سے محروم　　　　شکل تصویر آپ میں تھے گم

مثنوی شعلۂ عشق

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور　　　　نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
محبت سے کس کو ہوا ہے فراغ　　　　محبت نے کیا کیا دکھائے ہیں داغ
محبت کی ہیں کار پردازیاں　　　　کہ عاشق سے ہوتی ہیں جاں بازیاں
محبت ہی سے دل کو رو بیٹھیے　　　　محبت میں جی مفت کھو بیٹھیے
محبت لگاتی ہے پانی میں آگ　　　　محبت سے ہے تیغ و گردن میں لاگ
محبت سے ہے انتظام جہاں　　　　محبت سے گردش میں ہے آسماں
محبت سے روتے گئے یار خوں　　　　محبت سے ہو ہو گیا ہے جنوں

سُنے اس کے چرچے حکایت سُنی
کہے شُکر گاہے شکایت سُنی

کب اس عشق نے تازہ کاری نہ کی
کہاں خون سے غازہ کاری نہ کی

عجب کام پٹنے میں اس سے ہوا
عجب اہلِ عالم کو جس سے ہوا

کہ واں اک جواں تھا پرس رام نام
خوش اندام خوش قامت و خوش خرام

جدھر نکلے رنگیں ادائی کے ساتھ
چلے جائیں جی خوش نمائی کے ساتھ

نگہ گرم اُس کی جدھر جا لڑی
کہے تو کہ اُدھر کو بجلی پڑی

فدا اُس پہ جی جان ہر ایک کا
کہ مقصودِ دل تھا بد و نیک کا

کئی گرد پیش اُسکے دار فتگاں
کئی ایدھر اُدھر جگر تفتگاں

انہوں میں سے اک عاشق زار تھا
اُس آفت کو اُس سے سروکار تھا

محبت میں تھا جذبِ کامل اُسے
مرادِ دل اپنی تھی حاصل اُسے

شب و روز ہم بسترِ کامِ دل
ہمیشہ ہم آغوشِ آرامِ دل

بہم ربط چسپاں بہم اختلاط
نہ کم ہوتی گرمی نہ کم اختلاط

کہاں حسن میں تھا وفا کا یہ پاس
یہ سُنیئے کہ ہے گا خلافِ قیاس

بہت کیسے بہت اُسکا مالوف تھا
اُسی کی تسلّی سے مصروف تھا

کہ ناگہ وہ دلبر ہوا کہ خُدا
رہا اپنے عاشق سے چندے جُدا

زن و شو سے اخلاص باہم ہوا
اُس آشفتہ سے رابطہ کم ہوا

وفا نے جو تکلیف کی ایک روز
گیا اپنے عاشق کہ وہ دل فروز

کئی دن میں جا کر جو اُس سے مِلا
کیا اُس نے حد سے زیادہ گِلا

کہ اے نازنیں آہ کن نے کہا
کہ تُو حال سے میرے غافل رہا

مگر سدِ رہ تھا کسو کا فریب
مِلا کوئی تجھ سے بھی دشمن شکیب

کہا اُن نے تھی کدخُدائی مری
نہ تھی بے سبب یہ جُدائی مری

رکھا اب مجھ کو معذور ناچار ہوں
محبت کا میں تو گرفتار ہوں

نہ فرصت مجھے صبح اب ہے نہ شام
طرف اس کے ہے دل کو میلِ تمام

اُسے بھی مرے ساتھ اخلاص ہے
دلوں کو بہم رابطہ خاص ہے

نہ دیکھے جو مجھ کو تو مر جاوے وہ
وہیں جی سے اپنے گزر جاوے وہ

جو پہنچے مری جھوٹ اُسے بد خبر
تو کر بیٹھے پیچ لپنے جی کا ضرر

یہ سُن کر کہا اُس دل افگار نے
ستم کشتۂ دوریِ یار نے

کہ مجھکو نہیں تیری باتیں قبول
یہ مکرِ زناں ہیں تو ان پر نہ بھول

وفا کن سنے ان ناقصوں میں سے کی
ہوا شوئے کس کا کہ وہ پھر نہ جی

پئے امتحاں عاقبت یک نفر
مقرر ہوا تا کہ جا اُس کے گھر

کہے غرقِ دریا ہوا پرسرام
ہوئی زندگانی کی صبح اسکی شام

سُنا اُس کی ہم سر نے جب یہ سخن
ہوا موج زن بحرِ رنج و محن

نگہ اک طرف در کے مایوس کی
دمِ سرد کھینچا گیا ڈوب جی

موئی غم میں اُس جملہ تن ناز کے
گئی جان ہمرہ سخن ساز کے

وہ آیا جو تھا دل پریشاں گیا
کہ اس واقعے سے پشیماں گیا

خبر لے گیا اُس کنے زود تر
جو تھا درپئے امتحاں بے خبر

گیا ہوش سُنکر پرسرام کا
دوانہ ہوا عشق کے کام کا

گئے ہوش و صبر اسکے اک بارگی
طبیعت میں آئی اک آوارگی

سراسیمگی سے بگولا ہوا
پھرے اس طرح جیسے بھولا ہوا

نہ جی کو تسلی نہ دل کو قرار
کفِ غم میں سر رشتۂ اختیار

کبھو یاد کر اُس کو نالاں رہے
کبھو ٹک جو بھولے تو حیراں رہے

کبھو یاں کبھو واں بحالِ خراب
وہی بے قراری وہی اضطراب

رہے گھر تو آشوب گہ وہ گلی
چمن میں جو لے جائیں تو بیکلی

کبھو متصل ہونٹ پر آہِ سرد
کبھو دست بر دل کہ دلمیں ہے درد

ہوئی رفتہ رفتہ جو وحشت زیاد
لگا بھاگنے سب سے وہ نامراد

کچھ اپنے بد و نیک کی سُدھ نہیں
نکل جائے تنہا کہیں کا کہیں

کبھو جا کے صحرا سے لادیں اُسے
کبھو روتے دریا پہ پادیں اُسے

کبھو خاک ملتا ہے مُنہ پر کھڑا
کہیں ہے خرابی میں بے سُدھ پڑا

سرِ شام اک روز دریا گیا
ہوئی رات واں سے نہ آیا گیا

کنارے پہ رہتا تھا اک دام دار
رہا رات اُسکے یہ قرب و جوار

کہا اُس کی عورت نے اُس رات کو / نہیں تجھ سے جی چاہتا بات کو
تجھے فکر کچھ اب ہماری نہیں / تو جاتا نہیں شام سے اب کہیں
ترا شب کو دریا میں پڑتا تھا دام / تو چلتا تھا بارے معیشت کا کام
تو جاتا نہیں شب کو جس روز سے / معیشت ہے اندوہِ جاں سوز سے
نہیں طاقتِ صبر ہم کو تنک / بہت دیر ملتا ہے نان و نمک
وہ بولا کہ میں بھی پریشان ہوں / بہت تنگ دستی سے حیران ہوں
کہوں کیا کئی روز سے شام کو / اُٹھاتا ہوں میں اس سبب دام کو
کہ یک شعلۂ تند پُر پیچ و تاب / فلک سے اُترتا ہے نزدیک آب
کوئی دم تو رہتا ہے سرگرمِ گشت / کبھی سوئے دریا کبھی سوئے دشت
ٹھہرتا جو ہے پھر کنارے پہ واں / کہے ہے برس رام تو ہے کہاں
یہ آتش مرے دل کی کیونکر بجھے / عدم میں بھی میں نے نہ پایا تجھے
کیا عشق نے مجھ کو آتش کا باب / نہ چھڑکا مری آگ پر تو نے آب
گیا وہ یہ کہہ کر سوئے آسماں / رہے ہے مجھے رات دن خوفِ جاں
سنا حال شعلے کا صیاد سے / دھواں اک اُٹھا جانِ ناشاد سے
ہوا شعلۂ شوق دل سے بلند / رہا لوٹتا آگ میں جوں سپند
گئی رات جوں توں ہوئی صبح جب / زیادہ ہوئی عشق کی تاب و تب
محبت نے کی اشتعالک کہ وہ / سراسیمہ آیا چلا اس جگہ
جہاں سے اُٹھی تھی یہ آتش سلگ / پھر اس کے جگر کو لگی گھر کو لگ
تبسم کناں واں پہ اُن نے کہا / کہ کلفت میں غم کی بہت ہیں رہا
چلو سیرِ کشتی کو ہنگامِ شب / لبِ آب خالی کریں دل کو سب
ہوئے عاقبت سوئے دریا رواں / نہ پیدا کسو پر یہ رازِ نہاں
کہ اک آگ نکلی ہے واں یک کنار / محبت کمیں میں ہو سرگرمِ کار
کسو اشتعالک کی ہے منتظر / جہاں سر کو کھینچا قیامت ہو پھر
ہوئے ناؤ پر شاہ کہ جب سوار / کہا اُن نے یاں ایک ہے دام دار
جہاں قتل ہوتا ہو دریا تو واں / کفایت ہے اُس گل بدن کی زباں

اُسے ساتھ لو تو بڑی بات ہے — کہ دریا میں پھرتا ہے اور رات ہے
لیا آخر الامر ہمرہ اُسے — بٹھایا قریب اپنے یہ کہہ اُسے
تنک دُور چل کر کیا یہ سوال — مجھے ہے [illegible] شب کا خیال
کہاں شعلۂ سرکش آتا ہے یاں — کدھر [illegible] تاب آ کے کھاتا ہے یاں
کہاں سے ہے دریا پہ اک دم قرار — کدھر مضطرب ہو کرے ہے گزار
یہ صیاد سے تھا ہی جو سراغ — جگر آتشِ شوق رکھتی تھی داغ
کہ ہو کر فروغ اک سوختہ ساماں — تڑپنے لگا جیسے آتش بجاں
کوئی دم میں دریا پہ آیا فرود — ہوا نیرہ بالا سبھوں کا نمود
لبِ آب وہ شعلۂ جاں گداز — تڑپ کر بہت باز بانِ دراز
پکارا کہاں ہے پرس رام تو — محبت کا تک دیکھ انجام تو
کہ میں جلد تن آتشِ تیز ہوں — دلِ گرم سے شعلہ انگیز ہوں
بھڑکتی ہے جب آگ دل کی مرے — لبِ آب آ تروں ہوں غم میں ترے
مگر سوزشِ دل ہو کم آب سے — مجھے جی مرا اس تب و تاب سے
سو یہ آب رکھتا ہے روغن کا کام — کیا عشق نے آہ دشمن کا کام
یہ بے تاب سُن کر ہوا بے قرار — سفینے سے اُترا بصد اضطرار
ہوا ہم دم اُس آتش انگیز سے — کہا اُس بلائے دل آویز سے
کہ میں ہوں پرس رام خانہ خراب — مرا دل بھی اس آگ سے ہے کباب
مرے بھی جگر میں یہی سوز ہے — یہی مجھ کو جلنا شب و روز ہے
محبت تری برقِ خرمن ہوئی — تری دوستی جی کی دشمن ہوئی
سخن مختصر کچھ وہ شعلہ چلا — کچھ اک اپنی جاگہ سے یہ دل چلا
بہم گرمجوشی سے یکجا ہوئے — کہ گزری تھی مدت بھی تنہا تھے
وہ شعلہ رہا ایک جا مشتعل — کہے تو تسلّی ہوئے جان و دل
یکایک بھڑک کر وہ جلنے لگا — پھرا یہ بھی اُدھر پھرنے جلنے لگا
کیا پاس پانی کے آ کر صعود — رہی روشنی سی کوئی دم نمود
پھر آگے کسو پر نہ پیدا ہوا — نہ جانا کہ وہ شعلہ پھر کیا ہوا

خبر دار ہو اہلِ کشتی تمام — لگے کہنے باہم نہیں برس رام
اُٹھے ڈھونڈنے ہو کے سب ناصبور — کنارے پہ دریا کے نزدیک و دور
نہ پایا کہیں اُس کو حیراں ہوئے — نہایت ہی خاطر پریشاں ہوئے
وہ صیّاد بولا کہ ددل میں نشاں — گیا تھا سوئے شعلہ یہ نوجواں
یہ اور آگ دونوں ہوئے ہم سخن — وہ شعلہ ہوا اس پہ آتش فگن
لپٹ اُس کو شعلہ ہی وہ لے گیا — عجب طور کا داغ یہ دے گیا
اگرچہ ہے یہ قصہ بھی حیرت فزا — ولے میر یہ عشق ہے بد بلا
بہت جی جلائے ہیں اس عشق نے — بہت گھر لٹائے ہیں اس عشق نے
فسانوں سے اسکے لبالب ہے دہر — جلائے ہیں اس تُند آتش نے شہر
محبت نہ ہو کاش مخلوق کو — نہ چھوڑے یہ عاشق نہ معشوق کو

مثنوی عشقیہ

عجب عشق ہے مرد کار آمدہ — جہاں دونوں اس کے ہیں برہم زدہ
جہاں جنگ صف کی یہ ظالم لڑا — صف اُلٹی جہاں ایک مارا پڑا
جواں کیسے کیسے موئے عشق میں — بہت گھر خرابے ہوئے عشق میں
بہت عشق میں لوگ روگی ہوئے — بہت خاک مل مُنہ پہ جوگی ہوئے
گئے دشت میں کچھ نمد مُو ہوئے — کچھ اک شہر میں پھر کے یکسو ہوئے
بہت جان ناکام دیتے گئے — تمنائے دل ساتھ لیتے گئے
بہت اہلِ اسلام کافر ہوئے — بہت اوّلِ عشق آخر ہوئے
بہت جُرمِ اُلفت پہ مارے گئے — جو اعشق بازی کا ہارے گئے
ہوئے خانداں کیسے کیسے خراب — جواں جوں جوانی گئے کیا شتاب
کیا عشق جس دن سے مرتے رہے — جیوں ہی کا اندیشہ کرتے رہے
کسے عشق نے جی سے مارا نہیں — یہی درد ہے درد چارہ نہیں
دوا عشق کی سخت نایاب ہے — سرِ عاشقاں سنگ کا باب ہے

کہیں بادشہ اس سے درویش ہیں — کہیں اس سے درویش دل ریش ہیں
کہیں پڑ گئے اس سے فتنے فساد — رہے زیرِ شمشیر حد سے زیاد
اٹھا عشق کا شور عزلت گزیں — گئے دشت گردی کو کر ترکِ دیں
ہوا عشق سے مجلسی حالِ دہر — تواجد لگے کرنے شیخانِ دہر
کیا عشق میں ترکِ صوم و صلوات — گئے اہلِ مسجد سوئے سومنات
مسلماں ہوئے عشق میں برہمن — گئے کعبے کو چھوڑ دینِ کہن
نہ سبحہ نہ زنار نے کفر و دیں — جہاں سب ہے عشق اور کچھ بھی نہیں
کہیں اس کو لڑنے سے پایا معاف — کہیں ان نے میدان مارے ہیں صاف
کہیں مومنانہ اسے دردِ دیں — کہیں کافرانہ ہوا بے یقیں
غرض عشق ہے طرفہ نیرنگ ساز — کہیں نازکی سر کہیں بے نیاز
حکایت ہے عشقی حکایات میں — کہ افغاں پسر ایک گجرات میں
جواں خوش تھا پُرکار و پرہیزگار — بہت حسن کا اس کے داں اشتہار
بہ صورت بہ طاعت بہ دامانِ پاک — نہ دامن پہ مانندِ گل گردِ خاک
اگر ہووے حور ہی دوچار — وہ دریائے حسن اس سے ڈھونڈے کنار
رہے محوِ پاکیزگی و صلوات — نہ ہوں ترک سہواً کبھی واجبات
جوانی کا ہنگام طاعت کا صرف — لبِ سرخ پر دلبروں کا نہ حرف
بہت پاک دامن معیشت ہوئی — نظافت نزاہت میں مدت ہوئی
کہ ناگاہ اس راہ یک زن گئی — جیوں پر خدا جانے کیا بن گئی
جواں کی نظر شرم گیں جا لڑی — وہ شرمائی آنکھ اسکے اوپر پڑی
نہ دل مستقل ناشکیبا ہوا — دلِ طرفِ ثانی بھی بے جا ہوا
حیا دار تھی زن گئی اپنے گھر — وفادار تھا یہ رہا دیکھ اُدھر
کیا چند شرطِ وفا ہی کا پاس — لگے رہنے دونوں گھروں میں اداس
کئی دن میں ہندو زن آنے لگی — لئے پانی اس راہ جانے لگی
نگاہیں ہوئیں ہم دگر آشنا — محبت کا دونوں نے پانی بھرا
یہی مدتوں دیکھا دیکھی رہی — دلوں کی ہوسے نہ ہرگز کہی

حیوں میں شب و روز مرتے رہے
وے پاس ظاہر کا کرتے رہے

رہے دیر تک دونوں ناکام عشق
نہ آیا لبوں پر کبھو نام عشق

یہ کیا دخل اظہارِ اُلفت کریں
یہی بستہ لب مشق حیرت کریں

ہوا ناگہاں شوہرزن مریض
نہایت ہوئی تپ طویل و عریض

دموں پر بھی وہ رفتنی کم رہا
نظھر کر گئے دم ہوا ہو گیا

جلانے کی تیاری کرنے چلے
چلی زن بھی تا ساتھ اُسکے جلے

نگی جلنے چھوڑا نہ اصرار کو
خبر پہنچی اُس نو گرفتار کو

اُٹھا واں سے بے تاب آیا چلا
اسے دیکھ جلتے بہت جی جلا

کہا ہم کو کیا کہتی ہو اس گھڑی
نظر اُس کی جلتے جو اس پر پڑی

کہا آئے ہو تو چلے آؤ تم
شتابی کرو جو ہیں یاؤ تم

یہ بے تاب تھا آگ پر پھر پڑا
پتنگا سا اُس شعلے پر گر پڑا

لگے آتے تھے کتنے انفار ساتھ
وہیں کھینچ لائے اُسے ہاتھوں ہاتھ

چلے ادھ جلا لے کے سب اُسکو گھر
ہوا گرم ہنگامہ اک یہ ادھر

قدم کتنے چل کر وہ آتش بجاں
ہوا یوں سخن زن کہ اے دوستاں

نہیں متصل راہ چلنے کی تاب
کہ ہوں نیم سوز آگ کا میں کباب

کہیں مجھ کو سائے میں ٹھہرایئے
جو دم ٹھیرے تو آگے لے جایئے

توقف کیا سب نے زیر درخت
کہا واقعی رنج کھینچا ہے سخت

اُٹھانے کو کہنے تو کہلائے تھا
دل اس کا اُدھر ہی کھنچا جائے تھا

اگر آنکھیں کھلتیں تو اودھر نظر
ہوئی خاک معشوقہ جل کر جدھر

گیا منتظر اُس کو وہ دن تمام
نظر کر کے کیا دیکھتا ہے کہ شام

خراماں چماں آتی ہے وہ پری
وہی ناز عشوہ وہی دلبری

اسی طرز و انداز و خوبی کے ساتھ
اُٹھایا اُسے ہاتھ میں لے کے ہاتھ

گئی اُس طرف لے جدھر تھی چلی
نظر کرتے تھے واقعی یہ سبھی

وے مانعیت کا کس کو جگر
کہ حیران سب رہ گئے دیکھکر

ہوئے جاتے جاتے نظر سے نہاں
گیا عشق کیا جانے لے کر کہاں

بہت سے ہوئے لوگ گرمِ سُراغ — کنھوں نے نہ پایا نشاں غیرِ داغ

مثنوی معاملاتِ عشق

عشق لایا ہے آفتیں کیا کیا — اس سے آئیں قیامتیں کیا کیا
عشق نے چھاتیاں جلائی ہیں — آگیں کس کس جگہ لگائی ہیں
عشق کے دل فگار سارے ہیں — ان نے کیا کیا جوان مارے ہیں
سیر قابل ہیں اس کے دیوانے — سُننے کے گوں ہیں انکے افسانے
وصل میں جن کے دل رہیں بے جا — فصل ہو تو انھوں کا حال ہو کیا
اس بلا سے مجھے بھی کام ہوا — عاشقِ زار میرا نام ہوا
قصہ میرا بھی سانحہ ہی عجب — کس پہ گزرا ہے یہ ستم یہ غضب
ایک صاحب سے جی لگا میرا — اُن کے عشووں نے دل ٹھگا میرا
ابتدا میں تو یہ رہی صحبت — نام سے اُن کے تھی مجھے اُلفت
خوبی اُن کی جو سب کہا کرتے — گوش میرے اُدھر رہا کرتے
بخت برگشتہ پھر جو یار ہوئے — اک طرح مجھ سے وے دوچار ہوئے
کیا کہوں طرز دیکھنے کی آہ — دل جگر سے گزر گئی وہ نگاہ
چپکے مُنہ اُن کا دیکھ رہتا میں — جی میں کیا کیا پہ کچھ نہ کہتا میں
وے تو ہر چند اپنے طور کے تھے — پر تصرف میں ایک اور کے تھے
کرتے ظاہر ہیں احتیاط بہت — مجھ سے بھی رکھتے اختلاط بہت
بات کی طرز میری ہی بھاتی — میری آزردگی نہ خوش آتی
پیار چتون سے پھر نکلنے لگا — دیکھنا دل کو میرے ملنے لگا
کہیں دیکھوں تو بات دیر کہیں — بے دماغ اور بدگمان رہیں
کچھ کچھ آزار مجھ کو دینے لگے — قسم اقسام مجھ سے لینے لگے
میں جو کھاتا قسم تو ہو برہم — کہنے لگتے کہ کیا گدا کی قسم
ایک دو دن میں بعدِ رفعِ ملال — لُطف سے پُوچھتے کہو کچھ حال

جو گزرتی تھی مجھ پہ میں کہتا　　　یا کوئی اشک آنکھ سے بہتا
دیکھ کر روتے آپ بھی روتے　　　دل دہی کرتے جب تلک سوتے
ایک مدت تلک یہ صحبت تھی　　　کبھو اُلفت کبھو یہ کلفت تھی
رفتہ رفتہ سلوک بیچ آیا　　　ہاتھ پاؤں کو اپنے لگوایا
گاہ بے گاہ پاؤں پھیلاتے　　　میری آنکھوں سے تلوے ملواتے
چل کر آتے تھے جب کبھو ایدھر　　　پاؤں رکھتے تھے میری آنکھوں پر
دیکھنے میں تو پائمالی تھی　　　حُسن سے چال یہ نہ خالی تھی
جلتی چھاتی تو ہوتا میں سائل　　　کہ ٹک اے سرو ہو ادھر مائل
کفِ پا رکھیے یاں تو احساں ہے　　　تیرے پاؤں تلے مری جاں ہے
ہنس کے سینے پہ پاؤں رکھ دیتے　　　دل مرا یوں بھی ہاتھ میں لیتے
اب جو ثابت ہوئی ہے میری چاہ　　　اس کو مدِ نظر ہے مجھ سے نباہ
نہیں آزار کی روا داری　　　مہر و رزی ہے یا وفاداری
پر جو معشوقی آب و گل میں ہے　　　چھیڑ رکھنے کا شوق دل میں ہے
خواہ ناخواہ وہ نہیں منظور　　　کہ رہے دل شُدہ مرا رنجور
یہ بھی شوخی سے ہے کہے گا ہے　　　پر اس انداز سے کہ جی چاہے
ایک دن فرش پر تھا میرا ہاتھ　　　باتیں کرتے تھے وے بھی میرؔ ساتھ
پاؤں سے ایک اُنگلی مل ڈالی　　　لُطف سے درد وہ نہ تھا خالی
درد سے کی جو میں نے بیتابی　　　دستِ نازک سے دیر تک دابی
یاد آتے ہیں ایسے لطف جواب　　　گزرے ہیں جانِ غم زدہ پہ غضب
تن بدن دیکھ جی نہ رہتا تھا　　　میں جو گستاخ ہو کے کہتا تھا
کہ یہ جا گہ تم اس فقیر کو دو　　　متبسّم ہو کہتے دے یہ لو
یہ بھی کیا کیا خیال رکھتے ہیں　　　آرزو دے محال رکھتے ہیں
پھر گھڑی بھر میں کہتے ہو نہ ملول　　　مار کھانے کی باتیں سب ہیں قبول
جب سلوک ان کا یاد آتا ہے　　　کیا کہوں جی ہی بھول جاتا ہے
دوستی رابطہ وفا اخلاص　　　ساتھ میرے تھا اُن کو رابطہ خاص

ہیں تقاضائی ملنے کا رہتا مختلط ہونے کو سدا کہتا
میری تسکیں تھی ہر زماں منظور آپ بھی کرتے ملنے کا مذکور
وصل کے وعدے ہی رہا کرتے آج کل رات دن کہا کرتے
دل تو تھا رحم آشنا از بس کڑھتے تھے جان کر مجھے بیکس
جانتے تھے کہ ہے یہ دل دادہ سینہ خستہ خاک افتادہ
دیکھتے مجھکو جو پریشاں دل کہتے اے میر کچھ نہیں حاصل
دیکھ ٹک تو ہی تیرا حال ہے کیا جانے دے اب بھی یہ خیال ہے کیا
آفت جاں ہے دوستی کرنا کب تلک گھٹ کے اس طرح مرنا
میں جو دیوانہ اُن کے رد کا تھا شیفتہ بیحساب ہو کا تھا
کچھ نہ سمجھی گئی کہیں اُن کی اب جدائی جو ہے کٹھن اُنکی
یاد کرتا ہوں اور روتا ہوں وعدہ بن ہی ہلاک ہوتا ہوں
میں بھی مقدور تک وفا کی ہے جان غمناک پر جفا کی ہے
برسوں تک میں پھرا ہوں سرگرداں روز و شب دونوں تھے مجھے یکساں
نے فقط جان سے جہاں سے گیا زن و فرزند خانماں سے گیا
کیچ پانی ہو مینھ ہو یا برسات روز روشن ہو یا اندھیری رات
اُن تلک میرے تئیں پہونچ رہنا بیٹھے منھ دیکھنا نہ کچھ کہنا
آشنا یار سارے بیگانے کہ ہوئے میر جی تو دیوانے
رشتۂ ربط اُنھوں نے توڑ دیا ملنا جلنا سبھوں سے چھوڑ دیا
نظر آتے نہیں ہیں مدت سے اُنس پیدا کیا ہے وحشت سے
صبح ہوتے ہی گھر سے چلتے ہیں جیسے کھوئے گئے نکلتے ہیں
چلے جاتے ہیں دیکھتے ہی راہ پر کہیں کی کہیں پڑے ہے نگاہ
مل گیا جو کوئی تو پیچ نکلے سڑی خبطی دوانے پیچ نکلے
شوق سے اُن کے حال دیگرگوں پارہ پارہ دل و جگر سب خوں
رنگ ہر دم مزاج کا کچھ اور کل کا کچھ اور آج کا کچھ اور
کیا بیاں کریئے بیقراری کا ذکر کیا حال اضطراری کا

جی پڑا ترے ساتھ سونے کو — دل پریشان جمع ہونے کو
پاس اُن کے رہوں تو دل کو قرار — پھر نہ ٹھہرے ٹک ایک کریئے ہزار
گئی برباد عزت اُن کے لئے — جلف لوگوں نے مُنھ پہ طعنے دیئے
گھورے پھرے جو اُٹھ نکلتے تھے — وسے بھی کناس پوچ بکتے تھے
سفر آیا جو اُن کے تئیں درپیش — ساتھ اس رنج میں بھی تھا درویش
کیا کہوں جو اذیتیں دیکھیں — ہر قدم پر قیامتیں دیکھیں
بارے کچھ پڑ گیا ہمارا ربط — ہو سکا پھر نہ دو طرف سے ضبط
تب ہوا بیچ سے یہ رفع حجاب — جب بدن میں رہی نہ مطلق تاب
ایک دن ہم دے متصل بیٹھے — اپنے دلخواہ دونوں مل بیٹھے
شوق کا سب کہا قبول ہوا — یعنی مقصودِ دل حصول ہوا
واسطے جس کے تھا میں آوارہ — ہاتھ آئی مرے وہ مہ پارہ
گہہ گہے دست دی ہم آغوشی — ہمسری ہم کناری ہمدوشی
چند روز اس طرح رہی صحبت — پیار اخلاص رابطہ اُلفت
کچھ کہوں جو اُنہوں کی ہو تقصیر — نارسائی تھی طالعوں کی تمیر
ہو گئے بخت اپنے برگشتہ — پھر کیا آسماں نے سرگشتہ
بات ایسی ہی اتفاق پڑی — کہ ہوئی سر پہ فرقت آن کھڑی
لگی کہنے کہ مصلحت ہے یہ — کتنے روزوں جُدا تو مجھ سے رہ
یوں بھی آتا ہے عشق میں درپیش — کہ نشانِ بلا ہوں اُلفت کیش
میں اٹھاتا نہیں ہے تجھ سے ہاتھ — گو کہ ہیومت تو ہے میری جان کے ساتھ
اس جُدائی کا مجھ کو بھی غم ہے — کیا کروں آبرو مقدم ہے
میں کہوں کیا مجھے نہ اپنا ہوش — جیسے تصویر سامنے خاموش
آنسو آنکھوں میں بھرنے جاؤں — دے کہیں کچھ تو ہاں کئے جاؤں
ان سے رخصت ہوئے جو بعد شام — تیرہ دیکھا جہان کو ہر گام
دل ٹھہرتا نہ تھا ملالت تھی — جان کو رفتگی کی حالت تھی
یوں ہوا اُن کے کوچے سے آنا — جیسے ہووے جہان سے جانا

اب جو گھر میں ہوں تو افسردہ سا — چار پائی پہ ہوں تو مردہ سا
جی اُٹھوں میں فسردہ قالبیاں — متحرک ہو کیا تنِ بے جاں
حال دل کا کہوں جو ہمدم ہو — کروں پیغام کچھ جو محرم ہو
جی میں کچھ آیا رو کے بیٹھ رہا — دل زدہ چپکا ہو کے بیٹھ رہا
کوئی آیا جو واں سے جی آیا — سو نہ آیا کبھی کبھی آ پایا
دیکھیے چند یوں رہیں گے جدا — چاہے ہے کیا ہمارے حق میں خدا
خونِ دل کب تلک پییں گے ہم — رنگ یہ ہے تو کیا جییں گے ہم
آہ کیا کیا بیاں کروں خوبی — دل دہی حال پرسی محبوبی
تند ہو کر نہ بات کو کہنا — ملتفت حالِ زار پر رہنا
لطف مبذول حال پر ہر آن — تازہ ہر دم مروت و احسان
لب سے جاں بخش حرفے دلجو — لطف سے پوچھنا کہ خوش ہے تو
یاد کر روؤں اُنکی کون سی بات — کس طرح کاٹوں ہجر کے اوقات
ملنا اُن سے ہو پھر گھٹے غم بھی — آتے جیتوں میں جایئے ہم بھی
مدتِ ہجر اگر تمام ہوئی — ورنہ اپنی تو صبح شام ہوئی

مثنوی جوشِ عشق

ضبط کر دن میں کب تک آہ اب — چل اے خامے بسم اللہ اب
کر ٹک دل کا رازِ نہانی — ثبت جریدہ میری زبانی
یعنی میر اک خستہ غم تھا — سر تا پا اندوہ و الم تھا
آنکھ لڑی اُس کی اک جاگہ — بے خود ہو گئی جانِ آگہ
صبر نے چاہی دل سے رخصت — تاب نے ڈھونڈی اک دم فرصت
خون جگر ہو بہنے لاگا — پلکوں ہی پر رہنے لاگا
خواب و خورش کا نام نہ آیا — ایک گھڑی آرام نہ پایا
چاک جگر سے محبت ٹپکی — آنسو کی جاگہ حسرت ٹپکی

سوز سے چھاتی تابہ گویا — اور پلک خون نابہ گویا
آہ سے اُس کی مشکل جینا — درد فقط تھا سارا سینہ
دل میں تمنا داغ جگر میں — شیون لب پر یاس نظر میں
نالے شب کو اس کے سُن کر — مر گئے کتنے سر کو دُھن کر
آہ و فغاں ہے اُس کے لب پر — روز ہے اب تک آفت سب پر
رُو و جبیں پہ خراشِ ناخن — داغوں سے خوں کے قیامت گلبن
زخمِ سینہ دل تک پہونچا — کوئی نہ اُس گھائل تک پہونچا
آبلہ دل کا جب کوئی پھوٹا — فوارہ لوہو کا چھوٹا
غم نے تو دل میں کیا ہی پھوڑا — پر میں تھا اک پکا پھوڑا
سو نہ گیا یک دم وہ بے کل — بخت نہ جاگے اُس کے اک پل
کام رہا ناکامی ہی سے — تسکیں بے آرامی ہی سے
رُخساروں پر خون رواں ہو — دل میں ہو سو مُنہ پہ عیاں ہو
دشنۂ غم سے سینہ کوچا — ناخن سے مُنہ سارا نوچا
دست بدل ہر آن رہے وہ — بے طاقت بے جان رہے وہ
رنگ شکستہ بس کہ فسردہ — کہنے کو زندہ لیکن مُردہ
دیدۂ تر کے دریا قائل — ساحل خُشک لبی کے سائل
خاک بسر آشفتہ سری سے — شورِ قیامت نوحہ گری سے
سر تا پا آشفتہ دماغی — داغِ جنوں دے جسکو چراغی
غم سے گرچہ دم بھی کہیں تھا — جامے میں اک تار نہیں تھا
گل اُن نے ازبسکہ کھائے — پھولوں کی چھڑیاں ہاتھ بنائے
دل کے غبار نے راہ جو پائی — شہر میں گویا آندھی آئی
سر پر اس کے سنگ ہمیشہ — جی پر عرصہ تنگ ہمیشہ
آہِ سرد کرے وہ عریاں — بید سا کانپے ہوئے پریشاں
دشت تلک گئی آبلہ پائی — دُور کھنچی اُس کی رُسوائی
جن نے دیکھا اُس کو یکدم — اُن نے کہا یہ بھول کے سب غم

چندے یاں شاد رہے گا — پر مدت تک یاد رہے گا

جلنا اس سے کرے نہ کنارہ — جیسے چراغ وقف بچارہ

غیر سے بولے نہ یاروں ہی سے — بات کہے تو اشاروں ہی سے

کیونکر غم سے ہو آزادی — جان کے ساتھ اس کی ملتا دی

کوئی نہ اس پہ سایہ گستر — اپنا ہاتھ اپنے ہی سر پر

نے کعبے نے دیر کے قابل — مذہب اس کا سیر کے قابل

کیسا کہیے کیسا کچھ تھا — القصہ وہ ایسا کچھ تھا

وہ کیسا تھا جس پر عاشق — جی سے تھا یہ عاشق صادق

دیدۂ گل میں جا اس کی — نکہت گل گرد رہ اس کی

چشم بره سارا چمن اس کا — نقش قدم تھا یاسمن اس کا

آگے اس کے کبھو نہ آیا — یہ رو گل نے کہاں سے پایا

گل آشفتہ اس کے رو کا — سنبل اک زنجیری مو کا

جب وہ چہرہ تابندہ ہو — ماہ دو ہفتہ شرمندہ ہو

کیا کوئی شوخی اس کی بتاوے — کچھ ٹھہرے تو کہنے میں آوے

کیا ہے اس کے آب و گل میں — آرزو اس کی سب کے دل میں

سب کو میل اس بت کی ادا کا — بندہ کون رہا ہے خدا کا

دیکھے نہ عاشق زار کو اپنے — پوچھے نہ وہ بیمار کو اپنے

عاشق ظلم و جور و جفا کا — دشمن جانی اہل وفا کا

بارے سفر کا مائل ہو کر — حب وطن کو جی سے دھو کر

رخصت کو اس پاس بھی آیا — جلتے کے تئیں اور جلایا

وقت وداع قیامت گزرا — سر سے آب حسرت گزرا

اک دم بے خود ہو کے رہا وہ — اس سے آگے آپ گیا وہ

آنکھیں لگیں ناسور ہو بہنے — دیکھ اس گل کو لگا یہ کہنے

ظلم ہے تو ہو بیٹھے رہیے — جان گئے پر جیتے رہیے

عمر عزیز چلی یوں جاوے — اور فلک آنکھوں سے دکھاوے

آخر کر کے خدا کے حوالہ — آئینے پر پانی ڈالا
تاکہ رُو دکھلا دے شتابی — راہِ دُور سے آوے شتابی
یار گئے پر میر جواب ہے — جان سے خالی اک قالب ہے
راقمِ غم ہے وہ دل تفتہ — نامہ بر اُس کا رنگ رفتہ
غم سے فرصت اس کو کہاں ہو — قاصدِ اشک ہمیشہ رواں ہے
جب دردِ دل اُن نے لکھا ہے — شعلہ خط میں لپیٹ دیا ہے
سوز کے آوے جب وہ بیاں پر — شعلہ اک جوں شمع زباں پر
راہ پہ بیٹھا وہ سرگشتہ — دیکھے راہِ عمرِ گزشتہ
آگے تھا کب ہجراں دیدہ — آہ وہ تازہ ظلم رسیدہ
کیا کیا بے طاقت ہوتا ہے — ہر دم جی رخصت ہوتا ہے
حال عجب ہے رنجوری سے — مرنے قریب ہے وہ دوری سے
جب وہ دردِ دل کو جتاوے — باتوں پر اُس کے رونا آوے
داغِ دروں ہے گلشن گلشن — گُل یہ چُنے وہ دامن دامن
چھوڑے نہ راہ و رسمِ وفا کو — دے پیغام ہمیشہ صبا کو
پاس اُس کے گر تیرا ہو جانا — بھُولے ہوؤں کو یاد دلانا
زیرِ لب اُس کے بات یہی ہے — شام سحر دن رات یہی ہے
کھینچیں گے کب تک یہ سختی ہم — پھر بھی ملیں گے جیتے جی ہم
بس اے خامہ رکھ لے زباں کو — تاب نہیں ہے اہلِ جہاں کو
قصۂ غم کو نہایت کب ہے — اس سے خموشی اب انسب ہے

مثنوی اعجازِ عشق

کسو معتبر سے روایت ہے اک — کہ درویش سے یہ حکایت ہے اک
کہ اک ملک میں قضا را گیا — جواں ایک واں مُفت مارا گیا
وہ جس طور مارا گیا اب کہوں — تعجب میں اُس کے کہاں تک ہوں

سُن اب آ جو کچھ اُسکے جی پر ہوا
مصیبت زدہ بن اجل ہی موا

اُٹھا سیر کرنے کو میں ایک روز
پشیمانی اس کی ہے مجھ کو ہنوز

نظر جا پڑی جو مری ایک سُو
سرِ راہ بیٹھا تھا اک خوب رُو

فقیروں کی سی جھولی ایک اسکے پاس
بدن میں نہایت مکلّف لباس

سرا و پر تھا ہنگامہ اُسکے جمع
پتنگے اکٹھے ہوں جوں گردِ شمع

لقب اُس کا دیوانۂ عشق تھا
کہ شہرت میں افسانۂ عشق تھا

جوانی سے گلشن کا وہ تازہ گُل
کرے جس کی خاکِ قدم غازۂ گُل

اُسی کی سی مقدور تک سب کہیں
سدا اُس کا مُنہ دیکھتے ہی رہیں

وہ اک دُودماں کا تھا روشن چراغ
جلاتے تھے سارے اُسی پر دماغ

ولے اُسکے دل میں اک آتش نہاں
کہ دیکھے جلا اس سے سارا جہاں

سب آرام جاہیں اسے اضطرار
سراپا تنک ایک دل بے قرار

نہ کچھ ہوش گھر جانے کا اسکو تھا
تشنت نہ مرجانے کا اُس کو تھا

نہ طاقت تھی تن میں نہ کچھ جی میں تاب
نہ دل پاس نے صبر و آرام خواب

سرِ راہ دل قیمہ قیمہ لئے
یہ کہتا تھا مرجایئے بس جیئے

سُن اُس نوگلِ عشق کی بیکلی
رہا کرتی ماتم سرا وہ گلی

دل و صبر و ہوش و توان و حواس
رہیں اُسکی وحشت سے سارے اُداس

نہ ناموس کا ننگ نے نام کا
بلا دوست و دشمن تھا آرام کا

شب و روز فریاد کرنا اُسے
کئی بار اک دم میں مرنا اُسے

یہ قصّہ جہاں میں فسانہ ہوا
مجھے بھی سخن کا بہانہ ہوا

ولے گاہ وہ شمعِ مجلس فروز
کئی بیتیں پڑھتا تھا وہ سینہ سوز

کہ جن کا یہ مضمون تھا دوستاں
جلے ہیگی تقریر کرتے زباں

بڑی آتشِ عشق سرکش ہے یاں
جگر کیوں نہ جل جائے آتش ہے یاں

نظر آ کہیں جا رہا ہے یہ جی
کہ آنکھوں میں اب آ رہا ہے یہ جی

زن و مرد کی ہوں زباں سے تبنگ
ہوا ہوں میں سارے قبیلے کا ننگ

سدا خون دل میں طپیدہ ہوں میں
کہ آہِ بلب نارسیدہ ہوں میں

تری دوری میں پہنچی ہے اے حبیب — وداع دم واپسیں بھی قریب
جگر تو ہو پانی بہا غم کے بیچ — یہ دم بھی ہوا ہے کوئی دم کے بیچ
سمجھنا یہ بھی اے مرے سر پہ خاک — کس امید پر میں ہوا ہوں ہلاک
تو جب سے درا و پہ نظر آگئی — رہیں آفتیں میرے سر پر نئی
نہ نامہ نہ پیغام نے رسم و راہ — یونہیں ہوتی جاتی ہے حالت تباہ
دل و دیدہ سب مدعی ہو گئے — تماشائی مجھ پر بہت رو گئے
کئی بار جاں لب پر آ پھر گئی — کہاں ہے تو اے گل ہوا پھر گئی
یہ حیران ہوں صبر آتا نہیں — تصور ترا جی سے جاتا نہیں
خراشیں جگر سے ہے چھاتی میں درد — کسک جس سے ہو جائے ہے رنگ زرد
رہا کرتی ہے داد بیدادیاں — دل شب سے گزرے ہے فریادیاں
سر رہ تک آ دیکھ یہ خستہ حال — کہ ہے نقش پا کی طرح پائمال
مجھے آہ اک اس کے دل کی لگی — کہے تو کہ سینے میں برچھی لگی
گیا زہرۂ تاب دل آب ہو — کہا آگے جا کر میں بیتاب ہو
کہ اے ناز پرور دِ مہر و وفا — کوئی اپنے جی پر کرے ہے جفا
مثل ہے کہ جی ہے تو ہے گا جہاں — وگرنہ موئے پر ہے کیا میری جاں
تلف یوں نہیں جان کرتا کوئی — نہیں اس سلیقے سے مرتا کوئی
سخن حسرت آلود کہنے پہ آ — کچھ اک دل کی باتیں زباں پر بھی لا
وگرنہ تو ترک مرک کے مر جائیگا — یہ ہے عشق کام اپنا کر جائیگا
تو ہے مرمر غم سے آتش بجاں — دیا سا نہ بجھ جائیو اے جواں
کہیں دل لگا ہو تو یہ مجھ سے کہہ — کہوں اس سے جا کر غمیں تو نہ رہ
جہاں کو تو بھیجے وہاں جاؤں میں — کہے کام جو تو بجا لاؤں میں
خدا جانے کیا جی میں بات آگئی — کہ یہ میری دلجوئی ہی بھا گئی
یہ سن کر جوانِ زخود رفتہ نے — جگر سوختہ اور دل تفتہ نے
کیا سوزِ دل کو لبوں پر نمود — زباں تاب کھانے لگی جیسے دود
سخن ہونے لاگے نمودار کچھ — لگا کرنے پیچیدہ گفتار کچھ

کہ جس سے یہ معنی ہوئے مستفاد — کہ اے غمگسارِ دلِ نامراد
جو دلجوئی میری ہے مدِّ نظر — تو یاں اک محلّہ ہے ٹک قصد کر
نہیں اُس کو وہ کار کچھ جستجو — سرا ایک ترسا کی ہے قبلہ رُو
زبانی مری در پہ یہ جا کے کہہ — کہ احوال سے میرے غافل نہ رہ
ترے واسطے خوب رُسوا ہوا — مرے سر پہ ہنگامہ برپا ہوا
تسلّی شکیبائی مطلق نہیں — پر اب تابِ تنہائی مطلق نہیں
کہے سے جواں کے غرض قصد کر — گیا بندہ ترسا کے دروازے پر
سُن آوازِ دستک کی اک رشکِ حور — مہ چاردہ سی نپٹ باشعور
دوچار آ کے مجھ سے ہوئی ایک بار — گیا جس کے دیکھے سے صبر و قرار
ہوئی دیکھے سے جب حقیقت عیاں — کہا میں کہ تاجر پسر تھا جہاں
بشر کیا کہ دیکھ ایسی آفت کے تئیں — فرشتہ بھی رو بیٹھے عصمت کو تئیں
کہا میں نے پیغام جو آیا بن — یہ خوبی سے اسکی کروں کیا سخن
سُنا وہ جگر سوز پیغام جب — کئے آشنا حرف سے لعل لب
پڑھی اک رُباعی یہ کر اعتبار — کہ مضمون جسکا یہ موزوں ہے یار
کہ ہجراں میں جو بے قراری کرے — سرِ راہ فریاد و زاری کرے
نہ سونے دے نالوں سے ہمسایہ کو — بھلی مرگ ایسے فرومایہ کو
محبّت کی رہ میں یہ پہلا ہی کام — کہ سر سے گزر جائیے شادکام
نہیں شرطِ اُلفت میں چینِ جبیں — اگر پیش آوے دمِ واپسیں
گیا میں جواب اس سے لیکر اُدھر — سرِ رہ تھا پامالِ غم وہ جدھر
حقیقت بیاں کی سب اس جائے کی — جواں نے یہ سُنتے ہی اک ہائے کی
گئی ساتھ اس ہائے کے اُسکی جان — گرا خاک پر ہو کے بیدم جواں
تکے تھا مگر رہ سفر کر گیا — کہ اک بات کی بات میں مر گیا
نہ سوجھا مجھے اور کچھ اس سوا — کہ کر دیجئے بیاں طرفِ ثانی سے جا
ملامت کروں اُسکو میں اک جہاں — کہ اے بے حقیقت گئی اُسکی جاں
ترے نازِ بے جا کا تو کیا گیا — پر اک بے گنہ اس میں مارا گیا

غرض جُوں تُوں کر قطع میں راہ کی — گیا تھی جہاں منزل اُس ماہ کی
کی آواز دستک کہ بارِ دگر — ہوئی گھر میں القصہ میری خبر
درِ خانہ پر آئی ایک پیرزن — لگی کرنے عشق جواں سے سخن
کہ کیوں دوسری بار آیا ہے تو — شگوفہ مگر اور لایا ہے تو
کوئی رہ گیا تھا پیام جواں — جو تو پھر شتابی سے آیا یہاں
بیاں کر جو کہنا ہو تجھ کو شتاب — کہ ہے منتظر غیرت آفتاب
کہا میں نے اے پیرزن کیا کہوں — عزادار اس نوجواں کا میں ہوں
پیام اُس کا لایا تھا میں اس لئے — کہ وہ بے اجل مرتا ہے ٹک جیئے
سو یاں سے گیا ایسلے کے جواب — کہ جس سے نکلتا تھا ناز و عتاب
نہ تھی تاب حرفِ دُرشت اُسکے تئیں — گیا غم نے تھا نیم کشت اُسکے تئیں
نہ مشغول یونہی وہ زاری سے تھا — وہ بیتاب بے اختیاری سے تھا
نہ سمجھی یہ رشکِ پری اُسکے تئیں — دکھائی دی عشوہ گری اُسکے تئیں
چڑھا اُن نے تیوری اک انداز سے — کہا بے مزہ ہوکے یوں ناز سے
کہ جس کو نہ ہو تاب لانے کی تاب — شتابی سے مرنا ہے اُسکا صواب
ہوا سامنے اُسکے میں حرف زن — یہ اُس کی زباں سے کہا میں سخن
جواں سُنتے ہی کرکے ایدھر نگاہ — سفر کر گیا جان سے بھر کر آہ
یہی ماجرا کہنے آیا ہوں یاں — خبر اُس کے مرنے کی لایا ہوں یاں
کہہ اس سے کہ اے کشتۂ غم کی جاں — گیا آخر الامر جی سے جواں
یہ کہہ دس قدم واں سے میں تھا چلا — کہ اک شور کانوں میں میرے بڑا
گزرنے لگی دل سے آواز آہ — لگا ہونے آنکھوں میں عالم سیاہ
صدا ایک نوحے کی آنے لگی — کہ یعنی وہ دختر ٹھکانے لگی
محبت نے کام اپنا پورا کیا — کہ ان دونوں لعلوں کو چورا کیا

از مثنوی در جشن ہولی

آؤ ساقی قرار ہے باہم — کہ تماشا کناں پھریں خرم

زنِ رقاص پر نگاہ کریں کبھو سادے سے چل کے راہ کریں
کبھو دلبر کے کھینچ لیویں ہاتھ کبھو محبوب کو اٹھالیں ساتھ
کبھو خوش سر کے منہ منہ رکھ لیں کنج لب کا کہیں مزا چکھ لیں
خوش تنوں سے کریں ہم آغوشی کبھو نازک بدن سے ہمدوشی
کہیں دو جام مے سے ہوں سرمست جا ٹینگے تھوڑی دور دست بدست
مچلے بن جائیں گے کسو کو دیکھ پھر ملیں گے کبھو کے رو کو دیکھ
اب گلابی کو لیں گے بھر بھر ہم باقی ساقی پئیں گے بھر کر ہم
کہیں آرائش آ کے دیکھیں گے کاغذیں باغ جا کے دیکھیں گے
کبھو مہوش سے ہو وینگے گلباز کھینچیں گے ایک دو دم اُسکے ناز

دل نہیں مجھ کو ملا یہ کوئی جی کا نہ ہے وبال گفتنی ہو تو کہوں اے میر میں کچھ اس کا حال
خود بخود جاتا ہے کہتا آرزو کیا ہے اسے چاہتا ہے سیم و زر یا کوئی دلبر خوش جمال
یاد میں میری ہوا ہو کچھ سبب تو ہے بجا عشق بازی مفلسی آزردگی رنج و ملال
نے کسو کے گیسو و کاکل کا وابستہ ہوں میں نے کسی کے چاند سے مکھڑے کا مجھکو ہے وبال
کیا کروں ایذائے بے موجب غرض تجھ سے بیاں نے غمِ دردِ جدائی ہے نہ اندوہِ وصال

نیستم عاشق بظاہر ایک می کاہد دلم
عمر بگزشت و نمی دانم چہ می خواہد دلم



Most Sharpening results
اب کوئی بلیڈ کُند نہیں رہے گا . . . . ایلگرو بلیڈ تیز کرنے کی
سلی پر کُند بلیڈ چند بار گھسنے سے بالکل نئے بلیڈ کی طرح تیز ہو جاتا ہے۔
ایلگرو کے تیز کئے ہوئے بلیڈ جلد کو نہیں کُھرچتے۔ ان کی تیز دھار
بالوں کی کھونٹیوں کو کاٹ دیتی ہے اور جلد ملائم اور بے سوزش
رہتی ہے۔
ایلگرو پر ہر بلیڈ تیز کیا جا سکتا ہے۔
Allegro
BLADE SHARPENER


Guaranteed
No Animal
Bristles
مسواک
انگلینڈ میں بنا ہوا
جاری کردہ
دفتر مسواک
۵۰ لکشمی بلڈنگ کراچی ۳ پاکستان

محمد حسن عسکری

میر جی

میرے خیال میں ہر تنقیدی مضمون کا آغاز معافی کی درخواست سے ہونا چاہیے۔ معافی کی درخواست نہ سہی، یاد دہانی سہی۔ اس ضرورت کی عمومیت کو دیکھتے ہوئے اگر پڑھنے والے ہر مضمون سے پہلے یہ تمہید فرض کر لیا کریں، تو غالباً وہ بہت سے مضمونوں سے بچ جائیں۔ جانے پیدائش اور دہن ولادت تک تو بات رہتی ہے، اس سے ایک قدم آگے بڑھتے ہی تنقید لکھنے والے، جس شخص کے متعلق تنقید لکھی جا رہی ہے اس کی اور تنقید پڑھنے والے تینوں کی شخصیتیں اس طرح آپس میں گڈمڈ ہونے لگتی ہیں کہ پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے کون کہاں شروع ہوتا ہے اور کون کہاں ختم۔ یوں تو میں نے میر کے متعلق بڑی لمبی رائے قائم کرنے کی کوشش نہیں کی ہے، لیکن مجھے قطعی دعویٰ نہیں ہے کہ میں میر کی اصلیت تک پہنچ گیا ہوں، یا سختی سے معروضی اور خارجی انضباط قائم رکھ سکا ہوں۔ بہر نوع میں نے کوشش کی ہے کہ بغیر کسی اندرونی شہادت کے محض قیاس کی بنا پر کوئی رائے قائم نہ کروں۔ لیکن اس تھوڑی بہت احتیاط کے باوجود میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے میر کو صحیح طور سے سمجھا ہے یا بالکل غلط۔ میر کی اس تعبیر و تفسیر میں کسی ذاتی ضرورت کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ بالکل یہی رائے میں اس تفسیر کی تائید یا تردید کے بارے میں دوں گا۔ بہر کیف میر کے متعلق میرے ان تاثرات کا ایک استعمال ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ تاثرات آپ کے تاثرات سے مختلف ہوں اور ان دونوں کے مقابلے اور موازنے سے کوئی تیسرا وسیع اور جامع نتیجہ مرتب کیا جا سکے۔

فی الحال مجھے اس بحث سے کوئی مطلب نہیں کہ اردو ادب میں میر کا کیا درجہ ہے، اپنے لئے تو خیر میں نے اس سوال کا فیصلہ کر لیا ہے، اور اتنا کہے بغیر میں آگے نہیں بڑھوں گا کہ زندگی کے متعلق جس قسم اور جس کیفیت کا شعور مجھے میر کے یہاں ملا ہے ویسا شعور میں نے انگریزی شاعری کے اپنے مختصر سے مطالعے میں کہیں اور نہیں پایا۔ چنانچہ اس مضمون میں میری کوشش یہی ہوگی کہ اس مخصوص شعور اور کیفیت کی طرف اپنی کند فہم شرح کی مدد سے اشارہ کر سکوں۔

دنیا کے ہر معقول فن کار کے سامنے ایک بہت بڑا مسئلہ رہا ہے، خواہ شعوری طور پر اس نے اس کے متعلق کبھی سوچا ہو یا نہ سوچا ہو، بلکہ بہت ممکن ہے کہ اس نے اس سارے جھگڑے کا فیصلہ بالکل غیر شعوری طور پر کر لیا ہو۔ جب تک آدمی صرف عارضی غم یا عارضی نشاط، ہنگامی تاثرات اور وقتی جذبات میں محو رہتا ہے اس وقت تک تو کوئی خلش نہیں ہوتی لیکن اس غم و نشاط کی ہنگامیت پر تھوڑا سا قابو پا کر انہیں ذرا وسیع پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی جائے تو فوراً یہ سوال سامنے آ کھڑا ہوتا ہے کہ ان جذبات و احساسات کی، ہمارے آدرشوں کی، ہمارے طرز زندگی کی اور خود ہماری نظام کائنات میں کیا حیثیت اور کیا درجہ ہے۔ ایسے وقت اور ایسے وقت پر ہی کیا منحصر ہے، روزمرہ کی زندگی میں بھی ہمارے لئے حقیقت دو حصوں میں بٹ جاتی ہے، ایک تو وہ حقیقت جسے ہم اپنے اندر یا اپنے تخیل کے ذریعہ محسوس کرتے ہیں، جو ہمارا آدرش ہے، جس سے ہمیں محبت ہے۔ دوسری حقیقت وہ ہے جو ہم سے باہر دنیا میں موجود ہے۔ مرئی اور غیر مرئی دونوں طرح ان دو متضاد حقیقتوں کے آپ جو نام چاہیں رکھ سکتے ہیں، خیر و شر، تخیل اور اصلیت، عشق اور عقل، خیال اور عمل۔ اسی طرح ان دو حقیقتوں کے اجزائے ترکیبی ہر آدمی کی نفسیاتی ساخت کے مطابق مختلف ہو سکتے ہیں۔ آدمی کو یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ اس کے اندر ان دو حقیقتوں، ان دو دنیاؤں کے امتزاج کا تناسب کیا ہوگا۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کی پرستش میں غلو بھی کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر عقلی اور عملی حقیقت پر زور دینے سے آدمی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، یا اس سے اور آگے بڑھ کر اپنے ملک کے دشمنوں کے ہاتھ اسلحہ بیچنے والا سرمایہ دار ہو سکتا ہے۔ تخیلی عنصر کی شدت ہو تو قیس عامری کا درجہ حاصل کرنے کا بھی امکان ہے۔ ان دونوں حقیقتوں میں سے کسی ایک کی طرف مائل ہونا یا نہ ہونا، یہ تو اپنی اپنی پسند اور اپنی اپنی طبیعت کی بات ہے لیکن

پسند کر چکنے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بالکل مطمئن ہو جانا اور نظر ثانی کی ضرورت محسوس نہ کرنا کسی بہت ہی بے ایمان اور مطلب پرست آدمی کا کام ہو سکتا ہے یا احمق اور دیوانے کا۔ خیر، ہمیں تو فی الحال فن کار سے مطلب ہے اور فن کار کی عظمت اسی میں ہے کہ وہ اُن سوالوں کا مقابلہ کرتا ہے جن سے بڑے بڑے عارفین کے پتّے پانی ہوتے ہیں اور جہاں تک فن کار کا تعلق ہے اس میں کہنے سننے کی گنجائش نہیں کہ وہ عقل کی بہ نسبت عشق، اصلیت کی بہ نسبت تخیل اور عمل کی بہ نسبت آدرش کو پسند کرتا ہے اور سب سے زیادہ اپنے عشق اپنے تخیل اور اپنے آدرش کو۔ مختصراً اپنی خودی کو، لیکن پسند کر چکنے کے بعد وہ اپنے احساس کے دروازے بند نہیں کر دیتا۔ اوروں کی بہ نسبت اُسے ان دونوں حقیقتوں کے تقابل کا احساس کہیں زیادہ شدّت کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایک طرف تو اُس کی خودی ہوتی ہے، دوسری طرف خارجی دُنیا اور اُس کے باشندے۔ ایک طرف فرد، دوسری طرف کائنات۔ ایک طرف تو آدمی کی خودی اور اُس کی عظمت کا احساس ہوتا ہے جو کسی حد اور کسی پابندی کا احترام نہیں کرنا چاہتا، بلکہ عالمِ موجودات سے بھی آگے اگر کوئی چیز ہے تو اُس پر بھی چھا جانا چاہتا ہے، دوسری طرف روزمرّہ کی چھوٹی چھوٹی بے مقدار اور حقیر چیزیں ہیں جو برابر یاد دلاتی رہتی ہیں کہ یہ احساسِ رفعت و عظمت محض ایک خود فریبی ہے ہر ہر قدم پر ہمیں اپنی بے حقیقتی اور بے رنگی کا تماشا دیکھنا پڑتا ہے۔ ہماری چھوٹی چھوٹی خواہشیں پوری نہیں ہونے پاتیں، موت ہماری محبتوں کا احترام نہیں کرتی، سر اُوپر اُٹھاتے ہیں تو فضا کی قہار لا انتہائیاں ہمارے اُوپر چھائی ہوتی ہیں، اور تو اور ذرا سا کانٹا لگ جائے تو ساری بلند نظری رفو چکّر ہو جاتی ہے۔ غرضکہ کائنات کے سامنے فرد کی ہیچ مقداری کے احساس سے کسی طرح مفر ممکن نہیں۔ میرؔ کے یہاں اس احساس کی ایک آدھ شہادتیں دیکھئے ؎

ناکام رہنے ہی کا تمہیں غم ہے آج میرؔ
بہتوں کے کام ہو گئے ہیں کل تمام یاں

کیا کیا عزیز دوست ملے میرؔ خاک میں
نادان یاں کسو کا کسو کو بھی غم رہا

زیرِ فلک بھلا تو رووے ہے آپ کو میرؔ
کس کس طرح کا عالم یاں خاک ہو گیا ہے

اپنی بے چارگی تسلیم کرنے کے بعد فرد کا رویّہ دو طرح کا ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اپنے آپ سے بالکل مایوس اور ہر قسم کے آدرشوں اور ہر قسم کی علو خیالی سے بیزار ہو جائے۔ اس صورت میں اگر وہ عمل کی طرف راغب ہے تو کبھی نہ کبھی شکل میں مردم آزاری اختیار کرے گا، یا پھر دُنیا سے بالکل قطع تعلق کرے گا، ورنہ پھر قرین کے نیچے جا لیٹے گا۔ اگر وہ تخلیقی کام کرتا ہے تو اُس کے کلام یا اُس کی تصویروں میں سخت کلبیت اور زندگی سے بیزاری ہو گی۔ فرد کا دوسرا ردِّ عمل ہو سکتا ہے لامحدود اور غیر مشروط اثباتِ خودی۔ لیکن غیر محدود اثباتِ خودی، غیر مشروط سرکشی اور بغاوت انسان اور انسان کے تخیل سے ممکن نہیں۔ اور باتوں کو چھوڑیئے صرف موت کا تصور ہی ایسی چیز ہے جو بڑے سے بڑے سرکش اور باغی کا سر جھکا دیتا ہے۔ تھوڑی بہت دیر اثباتِ خودی کی ہوا میں آدمی جتنا چاہے فراٹے بھرے، لیکن آخر وہ لمحہ آ جاتا ہے جب اُسے ماننا پڑتا ہے کہ اتنی تگ و دو کے بعد بھی اس کی حیثیت میں ذرّہ بھر فرق نہیں آیا۔ اس شکست کے احساس سے جو جھنجھلاہٹ پیدا ہوتی ہے وہ بہت خطرناک چیز ہے اس بات پر غور کرنے کے لئے بہت کم لوگ رُکتے ہیں کہ ملکی فتوحات، یا انسانیت کی خدمت یا عمل یا فلسفہ سخت کوشی کی تہ میں بڑی بے پناہ مایوسی اور احساسِ شکست خوردگی ہو سکتا ہے۔ اثباتِ خودی یقیناً کسی نہ کسی مادی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، اور ظاہر ہونے کے لئے ضرور کسی نہ کسی شے کا سہارا لیتا ہے، خواہ وہ مُلک گیری اور سیاسی اقتدار کی خواہش ہو، یا جنسی تعیش یا تحصیلِ علم کی آرزو۔ اس قسم کی ہر جد و جہد کا نتیجہ ایک ہی ہوتا ہے۔ ناکامی۔ ٹریجیڈی ہے جو گوئٹے نے "فاؤسٹ" میں پیش کی ہے۔ بہرحال یہ دونوں ردِّ عمل حیاتیاتی اعتبار سے غیر صحت مند اور ضرر رساں ہیں۔

جب یوں چین نہ دوں چین تو پھر آخر انسان کیسے انسانیت کے اکثر رہنما، اور غالباً بزرگ تر رہنما، یہی نصیحت کرتے ہیں کہ انسان کو ہار مان لینی چاہئے اور اپنی خودی کو

کر دینا چاہیئے۔ مذہب صرف انسان کی خودی کے گلے میں پٹہ ڈالنے کی ایک کوشش ہی تو ہے۔ یہ نصیحت صرف مذہبی پیشواؤں ہی کی نہیں، بلکہ بڑے بڑے فن کار بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ یسوع مسیح نے کہا ہے کہ جو آدمی اپنی روح کھوئیگا وہی اُسے پائیگا۔ اسی سے ملتا جلتا نظریہ گیٹے کا ہے۔ "مرجاؤ اور ہو جاؤ" یہی تاکید بلیک کرتا ہے کہ تمہارے اندر خودی بار بار پیدا ہوگی، اسے بار بار ہلاک کرتے رہو۔ اسی سے ملتی جلتی تشریح کیٹس کے نظریہ "منفی صلاحیت" کی ہوسکتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ میر کو بھی ہتھیار ڈال دینے میں کوئی تامل نہیں ہے۔ مثالیں میں ابھی دونگا۔ پہلے ایک اور ضمنی سوال پر غور کر لیجئے۔ یہ تو تسلیم ہے کہ ہمیں اپنی خودی قربان کر دینی چاہیئے۔ لیکن کس قربان گاہ پر؟ ہم اسے کس کے سامنے پیش کریں؟ خدا کے سامنے؟ نظامِ کائنات کے سامنے؟ یا انسانیت کے سامنے؟ حُسن یا فطرت کے سامنے؟ یہ ساری قربانیاں بہت آسان ہیں، کیونکہ یہ ساری چیزیں غیر مرئی، تصوراتی اور غیر شخصی ہیں۔ جو مرئی ہیں بھی، وہ کم سے کم خوش آئند ضرور ہیں۔ بہت کم آدمی ہیں جو ان کے سامنے سر جُھکانا اپنی ذلت اور توہین سمجھیں۔ لیکن اگر عام انسانوں کے سامنے جن میں ہزار قسم کے عیب، بے رنگیاں، عامیانہ پن، ابتذال، گندگیاں، حماقتیں اور ذلالتیں ہوتی ہیں اپنی خودی پیش کرنے کا سوال ہو تو کتنے آدمی تیار ہونگے۔ یہ ہے اصلی روحانی ریاضت۔ اسکے لئے شیکسپیئر، چوسر، ڈکنز یا جوئس کے قد و قامت کا آدمی چاہیئے۔

اور اگر میں نے میر کو ذرا بھی صحیح پڑھا ہے تو میرا خیال ہے کہ وہ بھی اپنی خودی کو عام انسانوں کے سامنے پیش کرنے سے نہیں جھجکتے۔ اگر وہ دوسرے انسانوں کی اقدار اور عملی دُنیا کی اہمیت کو کلیتاً قبول کر لیتے تو شاعر نہیں رہ سکتے تھے، اودھ کے جاگیردار البتّہ ہوتے۔ انہیں اپنی قدروں، اپنے آدرشوں اور اپنی انفرادیت پر کو رالیقین ہے، حد درجہ محبت ہے، لیکن وہ ان کے مقابل کی دوسری حقیقت کو رد نہیں کرتے۔ یہی میر کی عظمت ہے۔ ہر آدمی کو حق ہے کہ وہ اپنی انفرادیت اور اپنی خودی سے محبت کرے لیکن آخر اس انفرادیت کا کوئی پس منظر، اس کے مادّی

لوازمات اور مناسبات بھی تو ہوں گے؟ میر اس پس منظر کو کبھی نہیں بھولتے، اور نہ وہ اسے ناقابل اعتنا یا حقیر سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے نقطۂ نظر اور اپنی حقیقت سے مایوس یا بیزار ہوئے بغیر دوسرے انسانوں کے نقطۂ نظر کی اہمیت کو تسلیم کر سکتے ہیں۔ اُنھیں اس خیال سے ذرا بھی گھبراہٹ نہیں ہوتی کہ انہیں اور اُن کی اقدار کو دوسروں کے نقطۂ نظر سے بھی جانچا جا سکتا ہے۔

اس کے برخلاف اُردو کے دو اور بڑے شاعروں کو دیکھئے۔ اقبال کے نزدیک آدمی کی عظمت کے لئے یہی چیز کافی ہے کہ وہ دوسروں سے مختلف ہو۔ انسان کی بزرگی اس میں ہے کہ وہ فوق الانسان ہو ؎

گر از دستِ تو کارِ نادر آید
گنا ہے ہم اگر باشد ثواب است

اُن کے آدرش کے مقابلے میں روزمرّہ کی دُنیا اتنی پست ہے کہ انہیں انسانوں کی صحبت سے زیادہ عزلت گزینی پسند ہے۔ اُن کا فوق الانسان اپنا قانون خود اپنے آپ ہے۔ اگر وہ کبھی انسانوں کی دُنیا کی طرف مائل ہوتا ہے تو صرف اُن پر رُعب جمانے کے لئے۔ ایک جگہ اقبال نے خودی کو قانونِ الٰہی یا دینِ فطرت کا پابند ضرور بتایا ہے لیکن دینِ فطرت کی تعبیر و تفسیر میں فوق الانسان بالکل آزاد معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح غالب بھی اپنا مکان عرش سے پرے بنانا چاہتے ہیں۔ اُنہیں ایک لمحے کے لئے بھی یہ منظور نہیں کہ اُنھیں دوسروں کے معیار سے جانچا جائے ؎

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

غالب کو پستی منظور ہے، لیکن کسی اور کی مدد سے بلندی پر پہنچنا منظور نہیں۔ اُنکے خیال میں انسان کو خود اپنے لئے کافی ہونا چاہیئے، خواہ اُسکا نتیجہ اچھا ہو یا بُرا ؎

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

یہ ٹھیک ہے کہ کبھی کبھی غالب کو بھی اپنی صلاحیتوں کے محدود ہونے اور اپنے اثباتِ خودی کی لازمی شکست کا احساس ہوتا ہے لیکن اپنی فتح یا شکست کا اندازہ کرنے کے لئے بھی وہ دوسروں کی ترازو استعمال نہیں کرتے۔ غالب کی

خودی اور انفرادیت کی کمزوری اور شکست کا اگر کوئی آدمی نظارہ کر سکتا ہے تو صرف غالب۔ انہیں اسکی ذرا بھی فکر نہیں کہ دوسرے انھیں کیا سمجھتے ہیں، انہیں تو صرف یہ غم ہے کہ غالب وہ نہ ہو سکا جو وہ ہونا چاہتا تھا۔

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز ٭ میں ہوں اپنی شکست کی آواز

اس کے برخلاف میر قدم قدم پر اپنا دوسرے انسانوں سے مقابلہ کرتے ہیں، انکے معیار سے اپنے آپ کو جانچتے ہیں، اور اس معیار کے مطابق اُن کی انفرادیت میں جو خامیاں نکلتی ہیں انہیں بڑی جرأت سے تسلیم کر لیتے ہیں، اور تمام چیزوں کے باوجود اپنی اصلیت، اور جس حقیقت کی وہ نمائندگی کر رہے ہیں اُس کی اہمیت اور برتری سے ذرا بھی بدظن یا غافل نہیں ہوتے۔ غالب اور اقبال کی طرح وہ اپنا جلوہ صرف اپنی نظروں سے نہیں دیکھتے، بلکہ بار بار اپنے آپ سے باہر نکل کر اپنی خودی کو دُور سے اور دوسروں کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ انہیں احساس ہے کہ وہ دُنیا میں اکیلے نہیں رہتے، اور نہ وہ کوئی ایسی دُنیا بنا سکتے ہیں جو دوسرے انسانوں سے بالکل غیر متعلق اور اُن کے حملوں سے بالکل محفوظ ہو۔ جب انسانوں کے درمیان رہنا ہے تو اُن کی رائے اور اُن کے نقطۂ نظر سے بھی تجاہل نہیں برتا جا سکتا۔ چنانچہ وہ بار بار اپنے طرزِ زندگی اور طرزِ احساس کو سماج کے طرزِ زندگی کے مقابل رکھتے ہیں اور دونوں کا موازنہ کرتے ہیں۔۔۔ اور فیصلہ بھی وہ ہمیشہ اپنے حق میں نہیں کرتے، حالانکہ اپنے آپ سے اور اپنے طرزِ زندگی سے اُن کی محبت اسی طرح برقرار رہتی ہے۔ وہ برابر دونوں حقیقتوں کو پہلو بہ پہلو رکھ کر اُنکا مقابلہ کرتے ہیں، اور یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ ان کے احساسات و جذبات، اور اعمال و افعال کا اثر دوسرے لوگوں پر کیا ہوگا، اور اُن کا ردِ عمل کس قسم کا ہوگا۔ وہ دوسروں کو بھی اپنی انفرادیت اور خودی کے اظہار کا اتنا ہی حق اور موقع دیتے ہیں جتنا اپنے آپ کو، اور اپنی برتری منوانے پر ذرا بھی اصرار نہیں کرتے اکثر وہ خود اپنے اوپر ہنستے ہیں، خود اپنے اوپر طنز کرتے ہیں۔ ایسا طنز نہیں جس میں تلخی اور جھنجھلاہٹ شامل ہو، بلکہ یہ طنز میر کی سب سے انفرادی اور سب سے ممتاز چیز ہے۔ یہاں لاکر وہ دونوں حقیقتوں کو ایک جگہ ملا دیتے ہیں، دوسروں کا نقطۂ نظر بھی تسلیم کرتے ہیں اور اپنے نقطۂ نظر کی اہمیت اور برتری کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی کرتے ہیں، اپنے اُوپر ہنستے بھی ہیں اور اپنے آپ سے محبت بھی کرتے ہیں۔ اس طنز میں اپنے آپ سے مایوسی اور نفرت نہیں ملتی، بلکہ اپنے آپ سے لُطف لینے کی صلاحیت۔ اب آپ میر کے کچھ شعر ایسے سن لیجئے جن کی بُنیاد پر میں نے اپنا یہ نظریہ قائم کیا ہے ؎

کہتا تھا کسی سے کچھ تکتا تھا کسی کا مُنہ
کل میر کھڑا تھا یاں، سچ ہے کہ دوانہ تھا

ہوگا کسی دیوار کے سائے میں پڑا میر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

میر صاحب کو دیکھئے جو بنے
اب بہت گھر سے کم نکلتے ہیں

کسو وقت پاتے نہیں اسکو گھر
بہت میر نے آپ کو گم کیا

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہیگا

شور و شغب کو راتوں کے ہمسائے تمہارے کیا روویں
ایسے فتنے کتنے اُٹھیں گے میر جی تم جو سلامت ہو

رات تو ساری گئی سُنتے پریشاں گوئی
میر جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

میر صاحب رُلا گئے سب کو
کل وے تشریف یاں بھی لائے تھے

جب میر یہ دو لفظ "میر صاحب" یا "میر جی" استعمال کرتا ہے تو نہ معلوم ان میں کیا کیا بجلیاں بھر دیتا ہے۔ خیر، کچھ اور شعر سُنئے ؎

آن میں کچھ ہیں آن میں کچھ ہیں ٭ تحفۂ روزگار ہیں ہم بھی

کہیں تو ہیں کہ عبث میر نے دیا جی کو
خدا ہی جانے کہ کیا جی میں اُسکے آئی ہو

نامُراد انہ زیست کرتا تھا
میر کا طور یاد ہے ہم کو

لگا نہ دل کو کہیں کیا سُنا نہیں تو نے

جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا

قامت خمیدہ، رنگ شکستہ، بدن نزار
تیرا تو میر غم میں عجب حال ہو گیا

وحشت ہے بہت میر کو مل آیئے چل کر
کیا جانیئے پھر یاں سے گئے کب ہو ملاقات

چل ہم نشیں کہ دیکھیں آوارہ میر کو ٹک
خانہ خراب وہ بھی آج اپنے گھر رہا ہے

سودا ہو تب ہو میر کو تو کریئے کچھ علاج
اس تیرے دیکھنے کے دوانے کو عشق ہے

صرف یہی نہیں کہ میر میں دوسروں کا نقطۂ نظر سمجھنے کی صلاحیت ہو، بلکہ بڑے خلوص کے ساتھ اپنے خود بڑی حیرت ہے کہ وہ ایسی حرکتیں کیوں کرتا ہے جو دوسروں کے لئے غیر متوقع اور عجیب ہیں۔ اس کا اندازہ آپ کو ان شعروں سے ہو ہی گیا ہوگا۔ اب میں میر کا ایک ایسا شعر پیش کرونگا جو صرف تخیل اور شعریت کی انتہائی بلندی پر پہنچ کر کہا جا سکتا ہے، ہمہ شما کے بس کا نہیں ۔۔۔

جب رونے بیٹھتا ہوں تب کیا کسر رہے ہے
رومال دو دو دن تک جوں ابر تر رہے ہے

اس شعر میں ان دونوں حقیقتوں کے تقابل کو میر نے صرف دردناک نہیں، بلکہ بلند ترین معنی میں ٹریجڈی بنا دیا ہے۔ اس شعر میں لاچاری اور افتادگی یا شکستگی نہیں ہے بلکہ غم کو ہضم کرنے کی کوشش۔ اس شعر میں جو حقیقی ٹریجڈی پیدا ہوتی ہے وہ رونے کی وجہ سے نہیں بلکہ رومال کے ذکر سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک بجلی کی سی تیزی سے سارا منظر ہمارے سامنے آ جاتا ہے کہ یہ دنیا کیا جگہ ہے، یہاں کے آدمی کون لوگ ہیں، اُن سے کس بات کی توقع کی جاتی ہے، اور ان سب کے سامنے میر کا غم کیا چیز ہے۔ اس شعر میں میر اپنی خودی کا اثبات نہیں کر رہا ہو بلکہ اپنی انسانیت کا۔

اسی طرح میر پنچایتی خیالات اور عوام کے محاوروں میں جان ڈال دیتا ہے۔ ان دونوں چیزوں کو وہ اُن دو متضاد حقیقتوں کے تقابل کا ذریعہ بناتا ہے لیکن اپنی حقیقت کی اصلیت کو کہیں بھی فراموش نہیں کرتا۔ میں اس چیز پر زیادہ زور تو نہیں دے سکتا لیکن کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میر عشق کو (اس سے بہت کچھ مراد ہے) صرف اپنا طرزِ زندگی نہیں سمجھتا، بلکہ ایک طرزِ زندگی جسے اُس نے اختیار کر لیا ہے اور دوسرے انسان بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ سخت کافر تھا جن نے پہلے میر مذہبِ عشق اختیار کیا

بہر حال اس میں تو شک کی گنجائش ہی نہیں کہ میر عاشق سے زیادہ انسان ہے۔ کم سے کم عاشق ہونے کے بعد وہ اپنی انسانیت کو نہیں بھولا۔ وہ اپنے ساتھ کوئی مخصوص رعایت نہیں چاہتا جو دوسرے انسانوں سے نہ کی جا سکتی ہو۔ وہ محبوب کے سامنے بھی اپنے آپ کو بحیثیت ایک انسان کے پیش کرتا ہے۔ محبوب سے شکایت کرتا ہے تو وہ بھی اس طرح جیسے ایک انسان دوسرے انسان سے شکایت کرتا ہے ۔۔۔

ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں
میر کو تم عبث اُداس کیا

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

دور پھرنے کا ہم سے وقت ہو گیا
پوچھ کچھ حال، بیٹھ کر نزدیک

بے قراریاں نہ بھوؤں نے دیکھیاں
یاں کا ہلنا ہماری بہت سہل جانیاں

خوش نہ آئی تمہاری چال ہمیں
یوں نہ کرنا تھا پائمال ہمیں

محبوب سے التجا یا اپنی سفارش کرتے ہیں تو وہ بھی بحیثیت انسان کے ۔۔۔

رنگِ شکستہ میرا بے لطف بھی نہیں ہے
ایک آدھ رات کو تو یاں بھی سحر کرو تم

مجنوں ناکارہ بھی مت جان ہمیں تو کہیں
ایسے ناکام بھی بیکار پھرا کرتے ہیں

اگرچہ سہل ہیں پر دیدنی ہیں ہم بھی میر
ادھر کو یار تامل سے گر نگاہ کریں

اپنے اوپر افسوس کرتے ہیں یا اپنے آپ کو تسلی دیتے ہیں یا اپنی تعریف کرتے ہیں تو وہ بھی اپنے آپ کو انسان سمجھ کر، فوق الانسان سمجھ کر نہیں ۔۔

خوش رہا جب تک رہا جیتا شہ میر معلوم ہے قلندر تھا

یوں گذرتا ہے دل کوئی مجھ کو ✤ یہی آتا ہے بار بار افسوس
مرد ہ کہیں بھی میر جا سرگشتہ پھرنا تا کجا

ظالم کبھو کا سُن کہا، کوئی گھڑی آرام کر
نہ جانا یہ کہ کہتے ہیں کسے پیار ✤ رہیں بے لطفیاں ہی یاں تو باہم
صبر بھی کر جئے بلا پر میر صاحب جی کبھو
جب نہ تب رونا ہی کڑھنا یہ بھی کوئی ڈھنگ ہے
میر عمداً بھی کوئی مرتا ہے ✤ جان ہے تو جہان ہے پیارے
بیقراری جو کوئی دیکھے ہے سو کہتا ہے
کچھ تو ہے میر کہ اک دم تجھے آرام نہیں
وجہ کیا ہے کہ میر مُنہ پہ ترے ✤ نظر آتا ہے کچھ ملال ہمیں
نہ بھائی ہماری تو قدرت نہیں ✤ کھنچیں میر تجھ سے ہی یہ خواریاں

میر کو یوں تو حسرت و یاس کا شاعر سمجھا جاتا ہے، لیکن پھر بھی یہ کہیں محسوس نہیں ہوتا، کم سے کم اُنکے اچھے شعروں میں ـــ کہ اگر اُنھیں غم ہے تو وہ ساری دُنیا کو غم میں ڈوبا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں اور نہ وہ زندگی کو لازمی طور پر اپنا دشمن سمجھتے ہیں جس نے چھانٹ کر انہیں اپنا شکار بنایا ہو۔ اُنھیں اپنی ناکامیوں پہ رنج سہی، لیکن وہ اس رنج کو کائنات پر مسلط نہیں کرنا چاہتے۔ وہ صرف اتنی ہمدردی کے طالب ہیں جتنی ایک انسان دوسرے انسان کو دے سکتا ہے ؎

خواہ مارا انہیں نے میر کو خواہ آپ موا
جانے دو یار جو ہونا تھا ہوا مت پوچھو
دیا عاشق نے جی تو عیب کیا ہے
یہی میر اک ہنر ہوتا ہے ہم میں

اسی ضمن میں ایک اور شعر دیکھئے جہاں پھر میر نے ایک عامیانہ چیز کی مدد سے شعر بندی پیدا کی ہے ؎

کہاں تک بھلا روؤ گے میر صاحب
اب آنکھوں کے گرد اک ورم دیکھتے ہیں

محبوب کی بے اعتنائی کو بھی میر ہمیشہ سخت دلی اور ظلم یا فطری بدکرداری نہیں سمجھتے۔ اُنکے بہترین شعروں میں محبوب بھی انسان ہوتا ہے اور اُسکی وہی خصوصیات ہوتی ہیں جو اور انسانوں کی۔ میر کو فرد کی لازمی تنہائی کا پورا احساس ہے۔ دو انسانوں کے جذبات و احساسات میں پوری مطابقت بالکل ناممکن ہے، نہ ایک انسان دوسرے انسان کی زندگی میں پوری طرح شریک ہو سکتا ہے۔ اگر محبوب بے اعتنائی کرتا ہے تو ضروری نہیں ہے کہ اس کی وجہ کج خلقی یا اذیت پسندی ہو، بلکہ فطری اور انسانی مجبوری بھی ہو سکتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ محبوب چاہے بھی اور عاشق پر مہربانی بھی نہ کر سکے۔ ایسی صورت میں عاشق اپنی بدنصیبی پر افسوس تو کر سکتا ہے، لیکن محبوب کی شکایت بالکل بے جا ہے۔ تنہائی زندگی کا قانون ہے اور اسکے سامنے عاشق اور محبوب دونوں مجبور و معذور ہیں۔ اگر قصور ہے تو عاشق کی لامحدود آرزوؤں کا ـــ آرزوؤں کی شدت کا۔ چنانچہ عاشق کے لئے صرف ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے، وہ یہ کہ جس طرح ہو سکے اپنا غم برداشت کرے۔ اب میر کے کلام سے اس احساس کی دو ایک شہادتیں سُنئے ؎

جگر جاکی، ناکامی، دُنیا ہے آخر ✤ نہیں آئے جو میر کچھ کام ہوگا
آتا ہے دل میں حال بد اپنا بھلا کہوں
پھر آپ ہی آپ سوچ کے کہتا ہوں کیا کہوں
ناکام اس لئے ہو کہ چاہو ہو سب کچھ آج
تم بھی تو میر صاحب قبلہ عجول ہو
کوئی نا اُمیدانہ کرتے نگاہ ✤ سو تم ہم سے مُنہ بھی چھپا کر چلے

میر کو ایک طرف تو تنہائی کا احساس ہے اور دوسری طرف کائنات اور موت کے سامنے فرد کی بے حقیقتی کا بھی یقین ہے۔ فرد کی انفرادیت اور خودی کتنی ہی حسین و جمیل اور شاندار چیز سہی، لیکن اس پر حد سے زیادہ فخر کرنے کا کوئی موقع نہیں، کم سے کم یہ موقع زیادہ دیر تک نہیں ملتا۔ غیر مشروط اثبات خودی بے معنی چیز ہے۔ زندگی کا ایک قانون ہے، اور ہزار ہاتھ پیر مارنے کے باوجود فرد اس جال سے باہر نہیں نکل سکتا۔ یہ افسوس کی چیز تو ضرور ہے لیکن مجبوری ہے، فرد کیا کر سکتا ہے؟

لاعلاجی ہے جو رہتی ہے مجھے آوارگی
کیجئے کیا میر صاحب بندگی بیچارگی
زیر فلک بھلا تو رووے ہے آپکو میر
کس کس طرح کا عالم یاں خاک ہو گیا ہے
ناکام رہنے ہی کا تمہیں غم ہے آج میر
بہتوں کے کام ہو گئے ہیں کل تمام یاں

ہیں اس جانِ مصیبت زدہ غم دیدہ پہ ہم
کچھ نہیں کرتے تو افسوس کیا کرتے ہیں

پردلبر سے کیا ہوں آزردہ ÷ میسر اس چار دن کے جینے پر
چار دن کا ہے مجلہ یہ سب ÷ سب سے رکھیے سلوک ہی ناچار

فرد کی تنہائی اور بے چارگی یہ دو احساس ایسے ہیں [illegible] کوئی منطقی وجہ باقی نہیں رہ جاتی [illegible] زندگی کی خواہش بہت قوی ہوتی ہے اس لئے مرجانا بھی آسان نہیں تو پھر انسان کس طرح زندگی بسر کرے؟ پہلے غالب کا جواب سُن لیجئے انہیں اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں دکھائی دیتا کہ آدمی کڑھ کڑھ کر اپنی زندگی ختم کر دے۔ دوسرے انسانوں سے وہ کسی سمجھوتے کے لئے تیار نہیں ہیں "ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں"

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا

غالب زیادہ سے زیادہ تسلی یہ دیتے ہیں کہ:-

"شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک"

اس کے برخلاف میر زندگی سے مایوس یا بیزار نہیں ہوتے بلکہ وہ تسلیم و رضا اور صبر و قرار کی تلقین کرتے ہیں فرد کائنات کے قانونوں کو اپنی مرضی کے مطابق نہیں بدل سکتا، اس لئے محض سرکشی اور بغاوت بے نتیجہ ہے یہ ضروری کہ آدمی کو بہت سے رنج اور غم سہنے پڑیں گے لیکن اگر وہ اپنی خودی کو بھی بلند تر اصولوں کے تابع کر دینے کو تیار ہو تو وہ ایک ایسا سکون حاصل کر سکتا ہے جو غم و نشاط سے ماورا ہے۔ فرد کو قانونِ حیات دریافت کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور اپنی خودی اور انفرادیت کو اس قانون سے ہم آہنگ بنانا چاہیئے اس سلسلے میں میر کو جو کچھ کہنا تھا وہ انہوں نے ایک شعر میں کہہ دیا ہے۔ ۵

فقیرانہ آئے صدا کر چلے ÷ میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

غیر مشروط اثباتِ خودی کے معتقد میر کو بزدلی کا الزام دے سکتے ہیں لیکن ہر جگہ اور ہر صورت میں تسلیم و رضا اور مصالحت بے ایمانی نہیں ہوتی، اسی طرح ہر جگہ اور ہر صورت میں بغاوت اور سرکشی مفید نہیں ہوتی۔ یہاں "مفید" کا لفظ میں ایک بہت خاص معنی میں استعمال کر رہا ہوں۔ اگر میر

دوسروں کا نقطۂ نظر قبول کر لیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ مصلحت اندیشی اور مادی منفعت کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں۔ یہاں ایک بہت بڑا معاملہ درپیش ہے۔

دُنیا میں صرف ایک ایسا سوال ہے جس کا کوئی جواب نہیں دیا جاسکتا۔ وہ یہ کہ آدمی کو کیوں زندہ رہنا چاہیئے؟ تو چونکہ انسان زندہ رہنے اور زندگی کی خواہش کرنے پر مجبور ہے، اس لئے اُسکی قدر آخر یہ بن گئی ہے کہ اچھی چیز وہ ہے جو نسلِ انسانی کی بقا میں مدد دے۔ آپ چاہیں تو اسے بزدلی یا بے ایمانی کہہ سکتے ہیں انسان سے پہلے جو نسلیں وجود میں آئیں اُن کی بقا کا دار و مدار تھا، طبعی ماحول سے اُن کی مطابقت پر۔ لیکن نسلِ انسانی نے طبعی ماحول کو حیاتیاتی اعتبار سے معطل کر دیا ہے' انسان اپنا ماحول خود بن گیا ہے اُسے اپنے اعضا میں تغیر و تبدل نہیں کرنا پڑتا، بلکہ اپنے خیالات و احساسات کی دُنیا میں ہم آہنگی اور نظم برقرار رکھنا پڑتا ہے۔ اسی پر نسلِ انسانی کی بقا منحصر ہے۔ اس لئے خیالات و احساسات کی افادیت جانچنے کے لئے کوئی مجرد اور مطلق معیار کام نہیں دیگا، بلکہ ان کا صرف ایک پیمانہ ہے: یہ خیالات نسلِ انسانی کی بقا میں کس حد تک معاون ہو سکتے ہیں؟ جہاں تک میر کے آخری فیصلے کا تعلق ہے ہم اس فیصلے کو انسانیت کے لئے بہترین رویہ کہہ سکتے ہیں، کیونکہ یہ فیصلہ صرف میر کا نہیں، بلکہ دُنیا کے بہت سے بڑے بڑے مفکروں اور فن کاروں کا بھی ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ میر ایک بہت بڑا فن کار ہے' وہ ہمیں صرف ایک راستہ دکھا کر نہیں رہ جاتا، بلکہ ہمیں اُس پر چلا کر دکھا دیتا ہے اب یہ ہماری صلاحیت پر منحصر ہے کہ ہم اُس کی مدد کے بغیر اس راستے پر کتنی دیر چل سکتے ہیں۔

مختصراً، میر نے زندگی کے متعلق جو کچھ سمجھا اور سوچا ہے اُس کا لُبِ لباب یہ ہے کہ بھرپور زندگی اسی وقت مل سکتی ہے جب آدمی اپنی خودی کو کائنات، زندگی، اور عام انسانوں کے سامنے نذر کر دے، لیکن ساتھ ہی اپنی خودی سے مایوس اور بیزار بھی نہ ہو، اور یہ رائے کوئی قنوطیت پسند اور یاس پرست آدمی نہیں دے سکتا۔

۱۹۴۰ء

نقش کراچی

کا

منتخب ادب نمبر

شائع ہوگیا

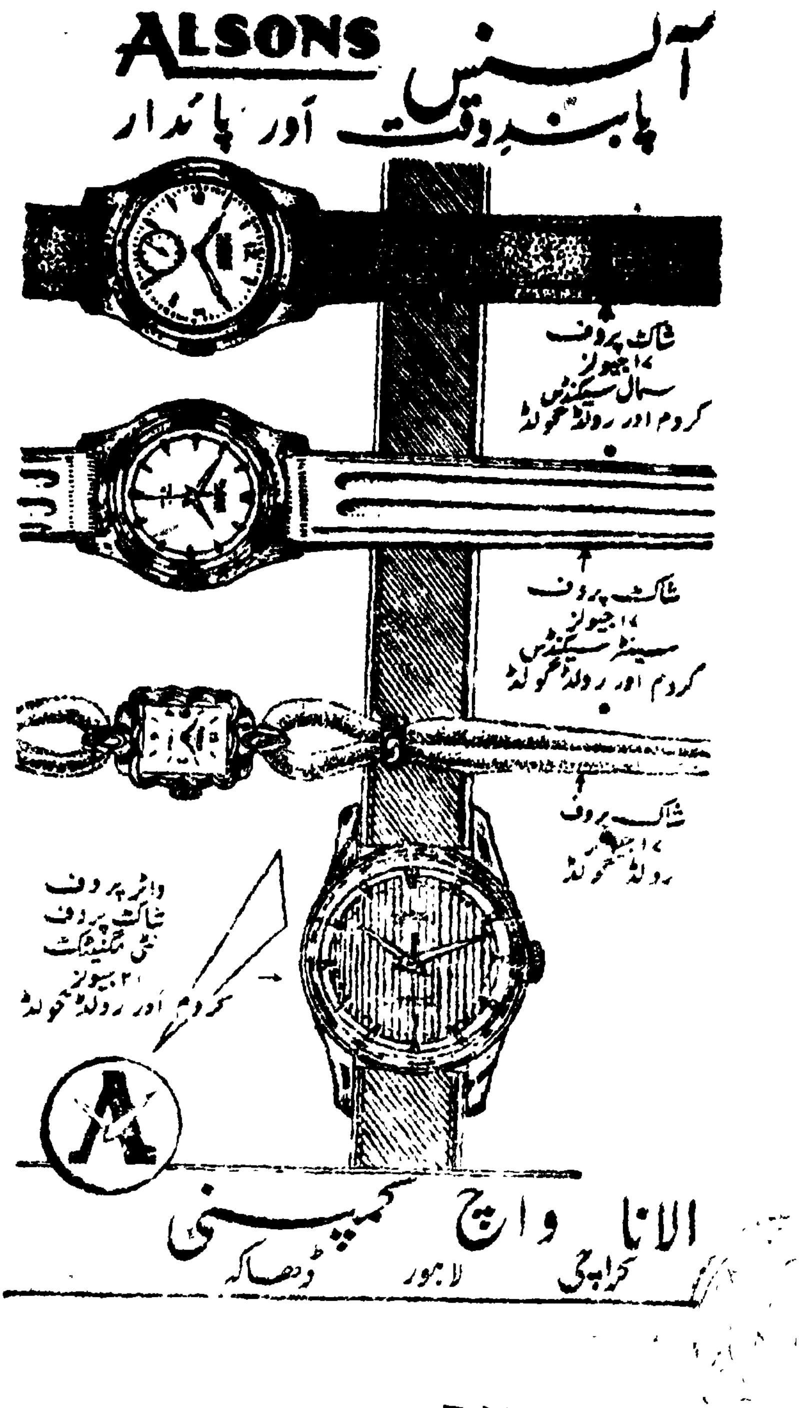
اس نمبر میں ان تمام ادبی اصناف سخن کا انتخاب پیش کیا گیا ہے جو ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئیں۔

چند لکھنے والے

کرشن چندر	سید ذوالفقار علی بخاری	اسلم فرخی	شاہد احمد دہلوی
جگر مرادآبادی	شان الحق حقی	قدرت اللہ شہاب	اختر الایمان
انور عنایت اللہ	محمد حسن عسکری	اشفاق احمد	یاور عباس
غلام عباس	سید محمد جعفری	انور سجاد	بانو قدسیہ
نیئر تمکین	جیلانی بانو	عبدالعزیز خالد	حفیظ ہوشیارپوری
	حمایت علی شاعر	اور دوسرے	

قیمت تین روپے — صفحات تین سو سے زائد

کاشانۂ اردو پوسٹ بکس نمبر ۳۰۲، کراچی ۳


ALSONS
آلسنس
پابندِ وقت اور پائدار
شاک پروف
۱۷ جیولز
سمال سیکنڈس
کروم اور رولڈ گولڈ
شاک پروف
۱۷ جیولز
سینٹر سیکنڈس
کروم اور رولڈ گولڈ
شاک پروف
۱۷ جیولز
رولڈ گولڈ
واٹر پروف
شاک پروف
اینٹی میگنیٹک
۲۱ جیولز
کروم اور رولڈ گولڈ
A
الانا واچ کمپنی
کراچی لاہور ڈھاکہ